شرح
غزلیاتِ غالب
فارسی
(جلد اوّل)
صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم
کِتابی دُنیا دہلی
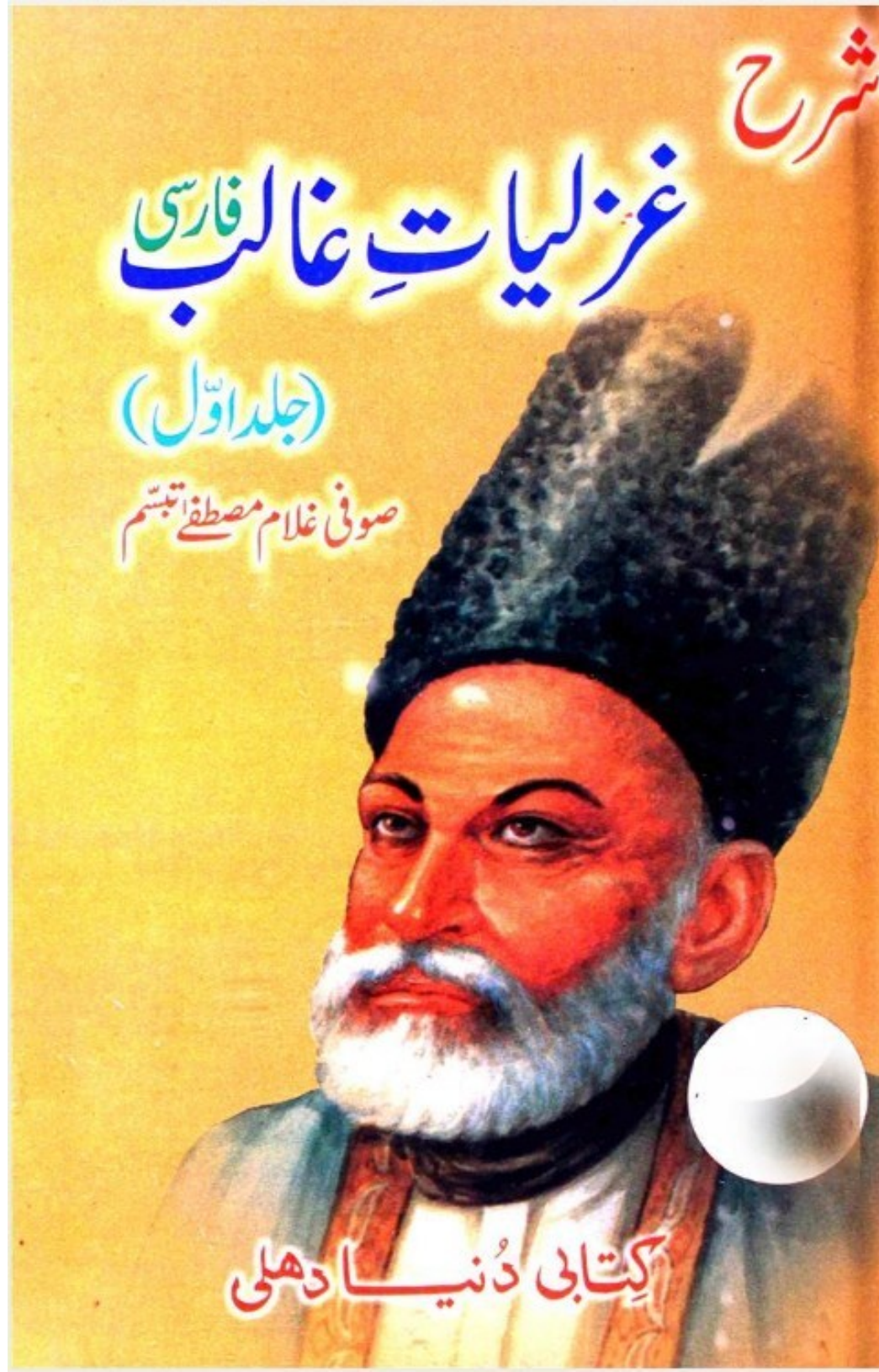
Sharah Ghazaliyat-e-Ghalib Farsi

(Vol. I)

by:-

Sufi Ghulam Mustufa Tabassum

Year of Edition : 2006

ISBN-81-89461-08-7

Price Rs. 400/-

نام کتاب	:	شرح غزلیاتِ غالب فارسی (جلداوّل)
شارح	:	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم
قیمت	:	۴۰۰ روپے
سنہ اشاعت	:	۲۰۰۶ء
ٹائٹل ڈیزائننگ	:	غلام مصطفےٰ
مطبع		کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Published by :-

Kitabi Duniya

1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan,
Opp. Anglo Arabic School, Turkman Gate, Delhi-110006
Mob: 9313972589, Ph: 011-23288452
E-mail:kitabiduniya@rediffmail.com

ترتیب

پیش لفظ

یہ ہمارے زمانے کا المیہ ہے کہ استاد محترم صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی عمر بے وفائی سے اپنی اس کتاب کی طباعت اور اشاعت خود نہ کرا سکے۔ غالب کی فارسی غزلیات کی شرح کی اہمیت کسی ذی علم شخص سے پوشیدہ نہیں۔ فارسی زبان آج سے سوا سو سال پہلے تک پنجاب کی سرکاری زبان تھی۔ تب پنجاب کا ہر لکھا پڑھا آدمی اس زبان کو کسی حد تک سمجھتا، بولتا اور لکھتا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں انگریزی زبان نے اس کی جگہ لی تو فارسی کا رواج رفتہ رفتہ کم ہونے لگا اور آج یہ حالت ہے کہ پورے پاکستان میں نہ کوئی فارسی بولتا ہے نہ لکھتا ہے۔ فقط وہ شخص جس کے درسی نصاب میں کبھی فارسی کی کچھ کلاسیکی کتابیں شامل رہی ہوں۔ اسے ایک حد تک صرف سمجھ سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی کے توسط میں جو جدید علوم وفنون ہم تک پہنچے ہیں وہ اپنی جگہ پر نہایت مفید ہیں، بلکہ ان کے بغیر ہم آج کی دنیا میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ لیکن فارسی ادب کے ذوق وشوق کے بغیر ہم اس تہذیب وثقافت کی اساس کو، جس سے ہمارا تشخص ہوتا ہے، نہیں پا سکتے۔ یونانی، عربی اور عجمی فلسفے اور اساطیر کی سینکڑوں تلمیحات ہمارے قومی ادب یعنی اردو کی نظم ونثر کا حصّہ بن چکی ہیں۔ لیکن انھیں کماحقہ سمجھنے کے لئے ہمیں فارسی کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے۔

اس رجوع کا ایک ثقہ ذریعہ غالب کی فارسی غزلیات ہیں۔ غالب کے اردو کلام کو پچھلے ساٹھ ستر سال میں جو شہرہ اور وقار حاصل ہوا ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ اس

شہرت کے باعث بے شمار پڑھے لکھے لوگوں کو اب شوق پیدا ہو رہا ہے کہ غالب کے فارسی کلام کو بھی سمجھیں۔ لیکن غالب جس کی اردو مشکل ہے، فارسی اور بھی مشکل ہے۔

استاذی صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا یہ احسان موجودہ اور آئندہ آنے واے طالب علموں پر ہمیشہ رہے گا کہ انھوں نے غالب کی فارسی غزلوں کی تشریح آسان اردو میں کر دی ہے۔ عرب وعجم کی تہذیب وثقافت کے تصورات سے شناسائی کے ذریعے اور بھی ہوں گے لیکن جس آسانی اور مسلسل لطف کے ساتھ انھیں کلام غالب کے توسط سے سمجھا جا سکتا ہے وہ کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ اسی لئے کتابی دنیا کا ادارہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم مرحوم کی شرح غزلیات غالب کا طبع اور شائع کرنا اپنے لئے فخر وسعادت سمجھتا ہے خدا کرے کہ اس سے ہمارے نوجوانوں میں نہ صرف فارسی فہمی کا شوق بڑھے بلکہ یہ ان کے لئے خود شناسی اور خودگری کا بھی ایک ذریعہ بن جائے۔

سید بابر علی

تعارف

غالب کی فارسی غزلیات کا ترجمہ اور تشریح ہمارے وقت کی ایک ایسی ضرورت تھی جسے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے پورا کر کے وطن کے اہل علم اور اہل ذوق لوگوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ تبسم مرحوم فارسی کے ممتاز شاعر اور استاد تھے جنھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں طلبہ کی کئی پشتوں کو فارسی ادب کی تعلیم دی۔ غالب کی فارسی غزلیات کی تشریح کے لئے پاکستان میں شاید ہی ان سے بہتر کوئی اور شخص ہوتا۔ یہ کام انھوں نے آج سے تقریباً آٹھ دس سال پہلے شروع کیا تھا اور کوئی تین سال ہوئے کہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ ایک ٹریجڈی ہے کہ وہ خود اپنی اس تصنیف کو طبع اور شائع ہوتا نہ دیکھ سکے اور ۱۹۷۸ء میں اسلام آباد سے لاہور آتے ہوئے حرکت قلب کے رک جانے سے فوت ہو گئے ان کے بعد ان کی اس کتاب کی طباعت اور اشاعت کا کام کتابی دنیا کے ادارے نے بھی اپنے ذمے لے لیا جس کا نتیجہ اب آپ کے سامنے ہے۔

بہت وقت نہیں گزرا کہ ہمارے یہاں فارسی بطور سرکاری اور مجلسی زبان مروج تھی۔ انگریز اور انگریزی کے آجانے سے یہ نقشہ بدل گیا۔ فارسی کا فہم عام نہ رہا اور وہ ہمارے لئے ایک اجنبی زبان بن کر رہ گئی۔ لیکن جو کچھ اس زبان میں یہاں پچھلے سات یا آٹھ صدیوں میں لکھا گیا اس کی اہمیت ہماری ملت کے لئے کم نہیں ہوئی اور اس کے مطالب ومعانی کا جاننا اب بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ پہلے تھا۔ فارسی نظم ونثر کے ذریعے صوفیانہ روایات، علوِ اخلاق، غیرت مندی

عالی حوصلگی اور آداب مجلس کے جو سبق، اور فکر باریک نزاکت احساس اور شوخی تخیل کا جو ورثہ ہم تک پہنچا ہے وہ برصغیر کی عجیب و غریب رسوم، بھونڈے بھدے فنون[1] اور بھانت بھانت کی بولیاں رکھنے والی غیر دوستانہ قوموں کے درمیان ہمارا امتیاز اور تشخص بن گیا ہے۔اس میں شک نہیں کہ دینی اعتقادات اور اوامر و نواہی ہماری ملت کے تشخص کی اصل بنیاد ہیں۔لیکن فارسی ادب کے اثرات ہر عہد میں اسے تقویت پہنچا کر اس کا تکملہ کرتے رہے ہیں۔

غالب وقت میں خسروؒ اور فیضی وغیرہ کی بہ نسبت ہم سے نزدیک تر ہے۔اور قدیم کے ساتھ جدید مسائل پر بھی کہیں کہیں نظر ڈالتا ہے۔ہم اپنے زمانے سے پچھلی طرف دیکھیں تو اس کا کلام برصغیر میں فارسی شعر کا ملخص اور تکملہ معلوم ہوتا ہے۔کلام غالب میں قدیم عرب و عجم اور روم و یونان کے اساطیر و توہمات اور تصورات و مسائل کے ساتھ ساتھ ہمیں ہند و فرنگ سے اپنی آویزشوں پر شاعرانہ اشارے ملتے ہیں۔مثال کے طور پر یہاں از منہ وسطیٰ و عتیق کے ان مسائل کا ذکر تو ہے ہی جو آسمانوں اور سیاروں کی گردش، شاہد و مشہور، تفریق ذات و صفات، وجود حادث اور جبر و اختیار سے متعلق تھے۔یا جو ہندوستان کے زناری برہموں اور ان کے بتکدوں کے اسرار و طلسمات سے تعلق رکھتے تھے، لیکن یہاں آس سلحشور انگلستان کی دو رخی کا گلہ بھی ہے جو کبھی فعّال ما یرید ہے اور کبھی ایک جرعۂ مے کے عوض ہم سے ہمارا دین طلب کرتا ہے۔غالب ان اور دوسرے بے شمار مضامین کو شعر کے سانچے میں ڈھالتا چلا جاتا ہے جس سے ان دقیق مسائل کا بیان آسان، شگفتہ اور پر لطف ہو جاتا ہے ان مضامین سے آگہی ہماری ثقافت کا جزو ہے اور جیسا کہ پہلے عرض ہوا، کہ اس کا غالب کے شعر سے اخذ کرنا طالب علم کیلئے ایک پر لطف عمل ہے۔ہماری بات اب تک صرف اساطیر، تصورات و مسائل کے علم سے متعلق تھی۔لیکن غالب کا شعر جو بطور شعر لذت رکھتا ہے یہ ایک الگ باب ہے۔اس کے شعر میں جو ترکیبوں کی نیرنگی، تصویر

---

[1] البیرونی اور بابر کے معروف تبصرے ہماری صداقت کے شاہد ہیں۔

نگاری، الفاظ کی نغمگی اور واردات عاشقی کی نفسیات ملتی ہیں وہ ذوق سلیم کو وجد و اہتزاز میں لانے والی ہیں۔جو خوش قسمت شخص شعر غالب سے کسب لذت کرتے ہوئے اس سے اپنے احساسات، جذبات اور فکر کی تہذیب کرتا ہے۔وہ ایسی دولت کا مالک ہے جسے زوال نہیں، اور جو صحیح معنوں میں پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کی ثقافت کا وارث ہے۔لیکن یہ بیش بہا خزانہ فارسی زبان کے جانے بغیر نہیں ملتا۔اس لئے یہ کہنا ایک سچائی ہوگی کہ غالب کے فارسی اشعار کا ترجمہ اور تشریح ایک بہت بڑی ملی خدمت تھی۔جو صوفی تبسم مرحوم نے ہمارے زمانے میں انجام دی۔

اگرچہ غالب اپنے بہت سے مضامین، فارسی اور اردو اشعار دونوں میں دہراتا ہے لیکن اسے اپنی فارسی پر بڑا ناز ہے، وہ اسے اردو پر ترجیح دیتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ میرا اصل رنگ دیکھنا ہو تو میرا فارسی کلام دیکھو:

فارسی بین تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است

وہ اپنے فارسی دیوان کی خوبیوں کے بیان میں اتنا غلو کرتا ہے کہ اسے ایک الہامی کتاب کا درجہ دیتا ہے:

غالب اگر این فن سخن دین بودی
آن دین را ایزدی کتاب این بودی

وہ پورے ارادے سے شاعری کی عام راہ کو چھوڑ کر مشکل گوئی کو اپنا طرۂ امتیاز بنا لیتا ہے اور دعوی کرتا ہے کہ اس کے شعر بلکہ لفظ تک معانی کا ایک خزانہ اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں۔دیکھیے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل

گویم مشکل و گر نگویم مشکل

اور

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

غالب کی یہ رائے چونکہ خود اپنے اور اپنے کلام کے متعلق ہے اس لئے اسے شاعرانہ تعلّی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔لیکن اس سے معاصر اہل ذوق بھی اس کی رائے کے مؤید نظر آتے ہیں۔اور اس کے کلام خصوصاً فارسی کلام، کی عظمت کے قائل ہیں۔مولانا الطاف حسین حالی سے زیادہ ہندوستان کی فارسی شعری روایت کے سمجھنے پرکھنے والا اور کون ہوسکتا ہے۔وہ غالب کے مقام کے متعلق فرماتے ہیں۔

قدسی و صائب و اسیر و کلیم

لوگ جو چاہیں ان کو ٹھرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے

ہے ادب شرط منھ نہ کھلوائیں

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت

خاک کو آسماں سے کیا نسبت

اس آسماں کی رسائی کی مشکل کو صوفی تبسم مرحوم نے آسان بنانے کی جو کوشش کی ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔صوفی صاحب کی تشریحات جیسی وہ کر گئے ہیں، ان کی امانت ہیں جنھیں ہم ردو بدل کے بغیر آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ان کا مسودہ دیکھتے ہوئے بعض جگہ ایسا احساس ہوتا ہے کہ ان کی تشریح ایک اوسط درجے کے طالب علم کے لئے کافی نہ ہوگی۔اور اسے تشنہ رکھے گی۔بعض دوسری جگہوں پر نظر آتا ہے کہ شارح شعر کے اصل خیال کو چھوڑ کر صرف ونحو کے کسی ضمنی مسئلے کی طرف نکل گیا ہے۔اور کئی جگہ تشریح کی بجائے صرف ترجمے پر اکتفا کی ہے،

حالانکہ وہاں تشریح کی ضرورت تھی۔لیکن جیسا کے عرض ہوا یہ میٹیریل صوفی صاحب کی امانت ہے، اس میں ردو بدل کا کسی کو حق نہیں۔ان اسقام پر، جو بہت کم ہیں نظر ڈالتے ہوئے یہ خیال رکھنا چاہئے کہ غالب کی فارسی غزلیات کی تعداد ساڑھے تین سو کے قریب ہے اور ان کی تشریح ہزار صفحے سے زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے۔اتنے بڑے کام کو، جو برسوں کی محنت سے انجام تک پہنچا ہے، یکساں توجہ سے کرتے چلے جانا کسی جوان شخص کے لئے بھی مشکل ہوتا۔چہ جائیکہ اس شخص کے لئے جس کی عمر ستر سے متجاوز تھی۔یہ کام جیسا بھی ہوا ہے ہماری پوری ملت پر ایک احسان ہے کہ اس کے ذریعے اس کا فراموش شدہ ثقافتی ورثہ اسے واپس دلایا جارہا ہے، ہم صوفی صاحب مرحوم کی اس بے بہا خدمت کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔

ہمیں کتابی دنیا اور سید بابر علی صاحب کی دریا دلی کا معترف اور ممنون ہونا چاہئے کہ وہ اس کتاب کی طباعت پر ہزار ہا روپے کا خرچ برداشت کر رہے ہیں۔سید بابر علی کو اپنے مرحوم استاد صوفی تبسم کا پاس تو ہے ہی لیکن اس کام سے جو انہوں نے قوم وملّت کی خدمت کی ہے اس کے لئے وہ عنداللہ ماجور ہوں گے۔

ڈاکٹر سید نذیر احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شرح غزلیات فارسی غالب

"ردیف الف"

غزل نمبر(۱)

ای بخلا وملا خوئی تو ھنگامہ زا

با ھمہ در گفتگو، بی ھمہ با ماجرا

دستور کے مطابق دیوان غزلیات کی پہلی غزل حمد کی ہوتی ہے۔ چنانچہ مرزا غالب کی یہ غزل بھی حمد ہی کی ہے۔

خلا وملا دو اصطلاحیں ہیں جو فلسفۂ مابعد الطبیعات میں مستعمل ہیں۔ فلسفیوں کے نظریۂ تکوین کائنات کے مطابق جب دنیا وجود میں نہیں آئی تھی تو خلا کا عالم تھا۔ کائنات کے وجود میں آنے کے بعد یہی خلا ملا میں تبدیل ہوگیا۔ خلا کا لغوی مفہوم خالی ہونا ہے اور ملا اس کی ضد ہے یعنی پر ہونا۔ گویا خالی جگہ پر ہوگئی۔

شعر کا سادہ اردو ترجمہ یہ ہے:

خدایا تیری ذات، خلا ہو یا ملا، ھنگامہ آفرینی کی خوگر ہے۔ سب کے موجود ہونے پر تو ان سے محو گفتگو ہوتا ہے، جب کچھ نہ ہو تو تیری ذات پھر بھی اپنی پوری شان میں ہوتی ہے۔

غالب کا یہ اردو شعر دیکھیے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یعنی اللہ کی ذات ازلی اور ابدی ہے۔ یہ فانی انسان درمیان میں کیا آ گیا۔

اللہ تعالی کی جلوہ گری اور شان خدائی ہر عالم میں اور ہر آن قائم رہتی ہے اور اس کی موجودگی کا ہر ایک کو احساس ہے۔ گویا وہ ہر ایک مخلوق سے محو گفتگو ہے۔ جب یہ حالت نہ تھی تو اس وقت بھی وہ اپنی شان خودنمائی میں مصروف تھا۔ اور اس کے حسن کی ادائیں مصروف کار تھیں۔ حالانکہ ان کا دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ کائنات میں اس کی ذات کے جاری وساری ہونے کو مرزا غالب نے ہنگامہ زائی یا ہنگامہ آفرینی کہا ہے اور جب یہ ہنگامے نہیں تھے اور ذات حق کی اداکاریاں اپنے پورے جوبن پر تھیں، اسے غالب نے بے ہمہ در ماجرا سے تعبیر کیا ہے۔

شاھد حسن ترا، در روش دلبری

طرۂ پرخم صفات موی میان ما سوا

الفاظ کی تشریح:

"شاہد حسن" میں اضافت، اضافت تشبیہی ہے۔ یعنی حسن جو ایک معشوق کی طرح ہے۔ مراد خود حسن ہی ہے۔ طرۂ پرخم زلف پر پیچ ہے اور موے میاں، موے کمر۔

ماسوا ہر وہ شے جو اللہ تعالی کی ذات کے علاوہ ہے۔ صوفیہ کے نزدیک، کائنات میں وجود باری تعالی کے علاوہ، تمام اشیاء کا وجود غیر حقیقی ہے۔

صوفیا اور فلاسفہ میں خدا کی ذات اور اس کی صفات کا مسئلہ ہمیشہ زیرِ بحث رہا ہے۔
اس بحث کا سادہ اور مرکزی نقطہ یہ ہے کہ کیا ذات اور صفات الگ الگ ہیں یا ایک ہی ہیں۔
بہر حال شعر میں صفات سے مراد صفات الٰہیہ ہیں۔

مرزا غالب نے شاہد حسن کی صفات یعنی صفات الٰہیہ کو طرۂ پُرخم کہا ہے اور اس کی ذات کے علاوہ جو کچھ ہے یعنی ماسوا کو موئے کمر سے تشبیہ دی ہے۔ شعرا معشوق کی نازک کمر کو بال سے تشبیہ دیتے ہیں بلکہ اس حد تک مبالغہ کرتے ہیں گویا وہ ہے ہی نہیں۔ چنانچہ مرزا غالب خدا سے خطاب کر کے کہتے ہیں۔ کہ تیرے حسن کی شان دلبری یہ ہے کہ اس کی صفات زلف پُر پیچ کی طرح الجھی ہوئی ہیں ان کو سلجھایا نہیں جا سکتا یعنی ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اور پھر تیرا ماسوا شاہد حسن کی کمر کی طرح ہے، جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

مرزا غالب نے اپنے ایک اردو شعر میں دنیا کو شاھد ہستی مطلق کی کمر کہا ہے۔

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

یعنی دنیا کا حقیقی وجود کچھ نہیں، یہ معشوق ازلی کی کمر ہے۔

دیدہ وران را کند، دید تو بینش فزون
از نگہ تیز رو، گشتہ نگہ توتیا

دیدہ ور: صاحب بصیرت۔

توتیا: سرمہ، کہتے ہیں کہ سرمہ بینائی میں اضافہ کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تیرا دیدار، صاحب بصیرت لوگوں کی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ ان لوگوں کی نگاہ کی تیز روی (یعنی ان کی تیز نگاہی) نے ان کی نگاہ کو سرمہ بنا دیا ہے۔ جس سے ان کی بینائی بڑھ گئی ہے۔

آب نہ بخشی بہ زور، خونِ سکندر ھدر
جان نہ پذیری بہ ہیچ، نقد خضر نا روا

خون ہدر، خون رائگاں کو کہتے ہیں۔ وہ خون جس کا کوئی صلہ نہ ملے اور ضائع ہو جائے۔ نقد، کھرا یا رائج سکہ ہوتا ہے اور ناروا کھوٹا سکہ جو رائج نہ ہو۔

اس شعر میں خضر اور سکندر کے ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ دونوں آب حیات کی تلاش میں نکلے۔ راستے میں سکندر راہ بھول گئے اور خضر نے آب حیات کو پالیا اور اسے پی کر عمر جاوداں حاصل کر لی۔

مرزا غالب کا اردو شعر ہے۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

اس واقعہ کے بیان سے شعر میں ایک صنعت آ گئی ہے جسے صنعت تلمیح کہتے ہیں۔
شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اے خدا تیری بے نیازی کے کیا کہنے! اگر کوئی زور آور کوشش سے پانی حاصل کرنا چاہے تو تو اسے نہیں دیتا۔ سکندر کا خون پانی کی تلاش وجستجو میں ضائع ہو گیا۔ اور اگر کوئی جان دینا چاہے تو اسے مفت بھی قبول نہیں کرتا۔ خضر کا نقد جاں کھوٹا سکہ بن کر رہ گیا ہے چاہتا ہے کہ مرے اور نہیں مرتا۔ نقد و ناروا ایک دوسرے کی ضد ہیں اس سے شعر میں صنعت تضاد بھی آ گئی ہے۔

بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب
ساز ترا زیر و بم واقعہ کربلا

بزم ترا اور ساز ترا دونوں میں ''را'' اضافت کا مفہوم دے رہا ہے۔ ایسے را کو رائے

اضافی کہتے ہیں۔

شعر کی نثر یہ ہوگی:

خستگی بوتراب شمع وگل بزم تو و واقعۂ کربلا زیر و بم ساز تو (ہست)۔

ایک روز حضرت علیؓ زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے انھیں اس حالت میں دیکھ کر پکارا۔ ''یا ابوتراب'' اسی دن سے حضرتؓ کا لقب ابوتراب ہوگیا۔ یہ لقب کنیت کی صورت میں ہے۔

حضرت علیؓ اور امام حسینؓ دونوں کی شہادت ہماری تاریخ کے بڑے المناک واقعات ہیں۔ مرزا غالب اس شعر میں بھی خدائے پاک کی بے نیازی کو یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ بوتراب، شہید ہوئے ان کی شہادت اور خستہ حالت تیری بزم بے نیازی کے لیے شمع وگل بنی اور سانحۂ کربلا تیرے سازِ بے نیازی کا زیر و بم ہوا۔ زیر و بم اونچے اور نیچے سروں کو کہتے ہیں۔

یعنی اتنی عظیم اور عزیز ہستیاں یوں مظلومانہ موت کا شکار ہوگئیں اس کی بے نیازی کے قربان کہ وہ دیکھتا رہا۔

نکبتیان ترا قافلہ بی آب و نان

نعمتیان ترا مائدہ بی اشتہا

نکبت، نعمت کی ضد ہے۔ نکبتی اور نعمتی دونوں میں ''ی'' فاعلی ہے جس سے نکبتی کا مفہوم بدبخت یا بدنصیب اور نعمتی کا مفہوم خوش بخت یا خوش نصیب ہے۔ قرآنی رو سے نکبتی سے مراد مغضوب لوگ ہیں۔ اور نعمتی وہ ہیں جنھیں ''انعمت علیھم'' کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ پچھلے شعر کی طرح اس شعر میں بھی ترا میں ''را'' کا حرف اضافت کا مفہوم دے رہا ہے۔ مفہوم شعر یہ ہے کہ جو لوگ تیرے مردود ہیں ان کا قافلہ حیات پانی اور روٹی کو ترستا ہے۔ اور جن پر

تیرا فضل وکرم ہوا انھیں بغیر بھوک کے (کھانوں سے چنے ہوئے) دسترخوان میسر آتے ہیں۔

گرمی نبض کسی کز تو بدل داشت سوز

سوختہ در مغز خاک ریشۂ دارو گیا

دارو گیا، داروگیاہ کا مرخم ہے یعنی اس کا آخری حرف (ہ) گرا دیا گیا ہے جسے قواعد صرف ونحو کی رو سے ترخیم کہتے ہیں۔ ایسے شخص کی نبض کی گرمی سے، جس کے دل میں تیرا سوز محبت تھا، زمین کے اندر (مغز میں) داروگیا کی جڑیں جل گئیں۔

مصرف زهر ستم داده بیاد تو ام

سبز بود جائی من در دهن اژدها

اس شعر میں مرزا غالب نے محبوب کی ستم رانیوں کی تلخی کو زہر ستم کے نام سے یاد کیا ہے۔ کہتا ہے محبوب کی یاد میں زہر ستم رچا ہوا ہے۔ اگر میں اس عالم میں دہن اژدھا میں جا بیٹھوں تو میری جگہ سبز ہوگی۔

اب سبز کے لفظ کے دو معنوی پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ سرسبز کا مفہوم دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ زہر خوردہ انسان کے بدن کا رنگ سبزی مائل ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ''سبز بود جائی من'' یعنی میری جگہ سبز ہوگئی، یعنی وہاں بھی زہر پھیلائے گی۔

اب پہلے مفہوم کے اعتبار سے اس مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس قدر زہر ستم کھائے ہوا ہوں کہ اژدھا کے منہ میں بجائے زہریلے پن کے مجھے آسودگی محسوس ہوگی۔ دوسرے یہ کہ اژدھا جس کا دہن سخت زہر آلود ہے، خود میرے زہر سے زہر آلود ہو جائے گا یہ بات شعر میں صنعت ایہام پیدا کر دیتی ہے۔

کم مشمر گریہ ام زان کہ بعلم ازل

بود درین جوی آب گردش ھفت آسیا

ہفت آسیا سے مراد ہفت آسماں ہیں۔

جوئی آب آنسوؤں کے طوفان کے لئے آیا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ میرے رونے کو حقیر مت جان، کہ کبھی میرے ان آنسوؤں کے سیلاب میں سات آسمان گردش کررہے تھے، اور یہ بات علم ازل میں تھی۔

سادہ ز علم و عمل مہر تو ور زیدہ ایم

ھستی ما پایدار، بادۂ ما ناشتا

ناشتا ناہار کو کہتے ہیں اور ناہار معدے کی خالی حالت کو۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم لوگ علم اور عمل دونوں سے عاری ہیں۔ ہاں ہم میں ایک وصف ضرور ہے اور یہ کہ ہم نے تجھ سے عشق کیا ہے۔ اور عشق کی مستی بڑی پایدار ہے۔ اس میں خمار کی نوبت نہیں آنے پاتی اس لئے کہ جو شراب (یعنی شراب محبت) ہم پیتے ہیں اس میں کسی چیز کے کھانے کی نوبت ہی نہیں آتی، مسلسل شراب پیتے چلے جاتے ہیں۔

خلد بہ غالب سپار، زانکہ بدان روضہ در

نیک بود عندلیب خاصہ نو آئیں نوا

روضہ سے مراد روضۂ خلد ہے۔ نو آئین نوا وہ پرندہ ہے جو نئے نئے نغمے گاتا ہے۔

بداں روضہ در کا مطلب ہے اس روضے میں یعنی روضۂ خلد میں۔ بداں روضہ کی ''ب'' میں کے معنی دیتی ہے اور در زائد ہے۔ جیسے کہ سعدی کے اس شعر میں۔

بدریا در منافع بی شمار است

وگر خواہی سلامت بر کنار است

بدریا میں ''ب'' در کے معنی دے رہا ہے اس لئے دوسرا در زائد ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ اے خدا! باغ خلد میرے سپرد کردے کیونکہ اس باغ میں ایک بلبل کا ہونا اچھی بات ہے، خاص کر ایسی بلبل جو نئے نئے نغمے گاتی ہو، یعنی نوفکر شاعر ہونے کی حیثیت سے میں اس کی بات کا مستحق ہوں کہ مجھے جنت عطا کی جائے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۲)

تعالی اللہ برحمت شاد کردن بی گناھان را

خجل نپسند د آزرم کرم، بی دستگاھان را

روایت کے مطابق یہ غزل نعت کی ہے

''بی گناہان'' = بے گناہ لوگ، وہ لوگ جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں۔

''بی دستگاہان'' = بے گناہاں کی ضد ہے۔ وہ لوگ جو بے سرمایہ ہیں یعنی جن کے پاس نیک عملوں کی دولت نہیں۔

آزرم۔ مہربانی اور شفقت۔

مرزا رسول پاک ﷺ کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ سبحان اللہ! آپ کی شان یہ ہے کہ آپ نیکوکار بندوں کو رحمت سے نوازتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ آپ کی بخشش کی مہربانیاں بے گناہوں کو اپنی بے اعمالی پر شرمندہ ہوتے دیکھنا برداشت نہیں کر سکتیں۔ یعنی آپ کی

رحمت کی وسعت کا تقاضا ہے کہ نیک اور بد دونوں اس سے فیضیاب ہوں۔

خوئی شرم گنہ در پیشگاہ رحمت عامت
سھیل و زھرہ افشاند زسیما روسیاھان را

خوی شرم=عرق شرم، ندامت پسینہ۔ سہیل و زہرہ=دو ستارے ہیں۔
روسیاہ سے مراد گناہ گار لوگ۔ سیما=پیشانی۔

تیری بارگاہ رحمت میں ندامت گناہ سے جو پسینہ گناہ گاروں کی پیشانی سے بہتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ پسینے کے قطرے نہیں بلکہ سہیل اور زہرہ ستارے ہیں۔ روسیاہوں کی رعایت سے یہ چمکدار ستارے مذکور ہوئے ہیں۔

زھی دردت کہ بایک عالم آشوب جگر خائی
دود در دل گدایان را و در سر پادشاھان را

بایک عالم آشوب جگر خائی= جگر کاویوں کے دکھوں کے باوجود
"دردل گدایان را"=یعنی دردل گدایاں
"در سر پادشاہان را"=یعنی در سر پادشاہاں
"را" دونوں جگہ اضافت کا مفہوم دیتا ہے۔

تمہارے درد محبت کے کیا کہنے کہ باوجود اس کے کہ اس میں دکھوں کی ایک دنیا بسی ہوئی ہے۔ گداؤں کے دلوں میں بادشاہوں کے سروں میں سمایا ہے۔
یعنی شاہ ہو کہ گدا کوئی بھی تیرے درد محبت سے خالی نہیں۔ شاعر نے گداؤں کے دل اور پادشاہوں کے لئے سر کا استعمال کیا ہے۔ دل کا لفظ گرمجوشی محبت کے لئے موزوں ہے اور سر

کاوش خیال کے لیے۔

بہ حرفی، حلقہ در گوش افگنی آزاد مردان را
نجوابی مغز در شور آوری بالین پناھان را

حلقہ در گوش افگندن =غلام بنالینا
مغز در شور افگندن =پریشان کردینا۔
بالیں پناہاں=جمع ہے بالیں پناہ کی، وہ شخص جو بڑے سکون سے تکیے کا سہارا لیے ہوئے لیٹا ہو یا آرام سے سویا ہو۔ تو ایک بات کر کے آزادوں کو اپنا غلام بنالیتا ہے اور ایک خواب کے ذریعے سکون سے سونے والوں کی نیند پریشان کردیتا ہے۔

ز شوقت، بیقراری آرزو، خارا نھادان را
بہ بزمت، لای خواری آبرو، پرویز جاھان را

خارانہاداں= سخت طبیعت لوگ، سنگدل۔
پرویز جاہاں=پرویز کی سی جاہ و حشمت رکھنے والے لوگ۔
شاہانہ ٹھاٹھ کے لوگ۔ لا= دُرد، تلچھٹ، وہ میل جو خم ے کے نیچے بیٹھ جاتا ہے۔
پرانے زمانے میں دستور تھا کہ جب میخوار خم ے کو کھولتے تھے تو اوپر کے حصہ کی شراب، جو صاف اور پاکیزہ ہوتی تھی، خود پیتے تھے اور نیچے کی شراب (دُرد) گداؤں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

بڑے بڑے سخت طبیعت لوگ تیرے شوق محبت سے بیقرار ہونے کی آرزو کرتے ہیں۔ اور خسرو پرویز جیسی شان رکھنے والے تیری بزم میں دُرد خواری کو بھی اپنی آبرو خیال کرتے

ہیں۔ خسرو پرویز (شیریں کا شوہر) ایران کے ساسانی خاندان کے شہنشاہوں میں اپنی شان و شوکت کے باعث مشہور ہے۔

بہ داغت شادم اما زین خجالت چون برون آیم
کہ رشکم درجحیم افگند، خلد آرامگاھان را

داغ سے داغِ محبت مراد ہے۔

نیکوکار لوگ اپنے اعمالِ صالحہ کے باعث جنت میں جائیں گے۔ ایسے لوگوں کو مرزا غالب نے خلد آرام گاہ کہا ہے کہ وہ باغ خلد میں چین سے پڑے ہیں اور ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے سرمایہ خیال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نیکوکار، خلد آرامگاہ ہیں۔ میرے پاس کوئی ایسا عمل نہیں۔ البتہ ایک تیری محبت کا داغ ہے جو سینے میں لیئے ہوئے ہوں۔ یہی میرے لئے کافی سرمایہ ہے۔ اور اسی پر نازاں بھی ہوں لیکن اس بات کا کیا علاج کہ مجھے دیکھ کر یہ خلد آرامگاہ لوگ رشک سے جل رہے ہیں۔ اور رشک کی آگ نے انھیں جہنم میں ڈال رکھا ہے۔ اور میں ان کی حالت زار کو دیکھ کر سخت شرمندہ ہوں اور اس خجالت کے احساس سے باہر نہیں نکل سکتا۔

بہ دلھا ریختی یکسر شکستن ھم ز یزدان دان
کہ لختی بر خم زلف و کلہ زد کج کلاھان را

فارسی میں "شکستن" کے بہت سے معنوی پہلو ہوتے ہیں۔ انھی میں ایک بل کھا جانا ہے۔ چنانچہ 'زلف شکستہ' وہ زلف ہے جو پر خم ہو۔

دل شکستن = دل توڑنا۔

"بہ دلہا ریختی یکسر شکستن" کا مفہوم یہ ہے کہ تو نے دلوں کو سرتا پا شکست کے عالم میں

ڈال دیا یعنی دلوں کو توڑ دیا۔ یہ بات بھی اللہ کی دین ہے کہ جس نے کج کلاہ معشوقوں کی زلف و کلاہ میں کچھ شکن ڈال دیے ہیں کہ جس کے بل پر انھوں نے عاشقوں کے دلوں کو پیچ و تاب میں ڈال رکھا ہے۔ "شکستن" کی رعایت لفظی نے شعر میں بلاغت پیدا کی ہے۔ مرزا غالب کی ندرت خیال و بیان دیکھیے کہتے ہیں کہ حسن اس بات پر نازاں ہے کے اس نے دلوں کو شکستہ کر دیا، حالانکہ یہ عنایت ایزدی ہے۔ جس کی بدولت حسن میں بھی تھوڑی شکن زلف و شان کج کلاہی آئی ہے اور وہ دلوں کو توڑنے کے قابل ہوا ہے۔

بنازم خوبی خون گرم محبوبی کہ در مستی
کند ریش از مکیدن ھا، زباں عذر خواھان را

عذر خواہاں = وہ لوگ جو اپنی خطاؤں کے لئے معافی کے خواستگار ہوں" میں اس گرم جوش محبوب کی خوبیوں پر ناز کرتا ہوں جو کہ مستی میں، اپنے عذر چاہنے والوں کے لبوں کو چوم کر زخمی کر دیتا ہے۔

بہ می آسائش جانھا بدان ماند کہ ناگاھان
گذر بر چشمہ افتد تشنہ لب گم کردہ راھان را

شراب سے انسانی جانوں کو وہی آسودگی نصیب ہوتی ہے جیسی، پیاسے، بھولے بھٹکے راہیوں کو چلتے چلتے، اچانک کسی چشمے پر پہنچ جانے سے ہوتی ہے۔

ز جورش داوری بردم بہ دیوان، لیک زین غافل
کہ سعی رشکم از خاطر برد نامش گواھان را

میں اس کے جور و ستم کے خلاف، عدالت میں، انصاف، طلب کرنے کے لئے حاضر

ہوا، لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ میرے جذبہ رشک کے اثر سے، گواہوں کو اس کا نام بھول جائے گا۔

گسست تار و پود پردۂ ناموس را نازم

کہ دام رغبتِ نظارہ شد رسوا نگاھان را

رسوا نگاہاں = وہ لوگ جو اپنی شوخ اور بے باک نظروں کے باعث بدنام ہوں۔ میں اپنے پردۂ ناموس کے تار و پود کے بکھر جانے پر خوش ہوں۔ کہ میرا اس طرح بے ننگ و نام ہو جانا ہر طرف بے باک نظریں ڈالنے والے معشوقوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

اس شعر میں رسوا نگاہاں کے لفظ میں بڑی معنویت ہے۔ اس سے مقصود ایسے لوگ ہیں جو نہ فقط خود اپنی بے باک نگاہی کے لیے بدنام ہیں بلکہ وہ دوسروں کو رسوا ہوتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اس کی عیب پوشی کریں، ادھر خصوصیت کا اظہار کر کے، دوسروں کو ادھر توجہ کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔

اس شعر میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ یہی رسوا نگاہ معشوق عاشق کے پردۂ ناموس کو چاک کرنے والے بھی ہیں۔

نشاط ھستی حق دارد از مرگ ایمنم غالب

چراغم چون گل آشامد، نسیم صبحگاھان را

حق قائم و دائم ہے۔ مرزا غالب کہتے ہیں میں ہستی حق کے تصور میں مست ہوں، مجھے موت کا کیا خوف۔ میرا چراغ، بجائے اس کے کہ صبح کی ہوا کے چلنے سے بجھ جائے، پھول کی طرح، نسیم سحر کو پی کر شگفتہ ہوتا ہے۔

شاعر نے مرگ کے لیے نسیم صبح گاہاں کا نادر استعارہ استعمال کیا ہے۔

❀❀❀
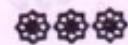
غزل نمبر (۳)

خاموشی ما گشت بدآموز بتان را

زین پیش و گرنہ اثری بود فغان را

ہمارے خاموش ہو جانے نے بتوں کو غلط سبق پڑھایا، ورنہ اس سے پہلے، ہماری فریاد کا کچھ نہ کچھ اثر ہوا کرتا تھا۔ یعنی میرا محبوب میری خاموشی کا غلط مفہوم سمجھا اس نے یہ خیال کیا کہ اس کے دل میں عشق کا جذبہ ہی نہیں ورنہ یہ ضرور آہ و فریاد کرتا۔

غالب کا یہ شعر دیکھیے۔

ہو گئی ہے غیر کی جادو بیانی کارگر

عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

منت کش تاثیر و فائیم کہ آخر

این شیوہ عیان ساخت عیارد گران را

منت کش = احسان مند۔

"ایں شیوہ" سے شیوۂ وفا مراد ہے جس کا ذکر پہلے مصرعے میں آیا ہے، دگراں سے مراد غیر، رقیب ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ ہم اپنے شیوۂ وفا کے احسان مند ہیں کہ اس سے کم از کم اتنا تو ہوا کہ رقیبوں کے دعویٰ عشق کے جھوٹے ہونے کا راز کھل گیا۔ پتا چل گیا کہ ان کا معیار عشق کیا ہے۔ یعنی ہمارے خلوص محبت سے ان کی قلعی کھل گئی۔

در طبع بهار این همه آشفتگی از چیست

گوئی که دل از بیم تو خون گشته خزان را

شاعر محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے:

بہار کی طبیعت میں یہ پریشانی کس وجہ سے ہے؟ معلوم ہوتا ہے یہ بہار نہیں خزاں ہے جس کا دل تیرے خوف سے خون ہوگیا ہے۔ مرزا غالب نے بہار کی شگفتگی کا نہیں، آشفتگی کا ذکر کیا ہے۔ اور اسے خزاں خوں شدہ دل کہا ہے اور پھر اُسے محبوب کے حسن سے خوف زدہ ہونے کا نتیجہ کہا ہے جو اس کی ندرت فکر و بیاں کو ظاہر کرتا ہے۔

اس شعر میں ردیف ''را'' بھی اضافی ہے یعنی دل از بیم تو خوں گشتہ خزاں را دراصل ''دل خزاں، از بیم تو خوں گشتہ'' ہے۔

موی که برون نامده باشد چه نماید

بیهوده در اندام تو جستیم میان را

شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ جو بال ابھی (جسم سے) باہر نہیں آیا وہ کیا نظر آئے گا ہم یونہی تیرے جسم میں (تیری) کمر کو ڈھونڈتے رہے۔

شاعر نے مبالغہ آمیزی سے کام لے کر، معشوق کی کمر کو ایسے بال سے تشبیہ دی ہے، جس کا وجود ہی نہیں۔

غالب کا یہ شعر دیکھئے:

فریب وعدۂ بوس و کنار یعنی چہ

دهن دروغ دروغ و کمر دروغ، دروغ

طاقت نتوانست بهنگامه طرف شد

دادیم بدست غمت از ناله عنان را

''از نالہ عناں را'' کے الفاظ میں از اضافت کا مفہوم دے رہا ہے۔ چنانچہ دوسرے مصرعے کی نثر یوں ہوگی:

عنان نالہ را بدست غم تو دادیم۔ ہنگامہ سے مراد ہنگامہ عشق ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہماری کمزور طاقت ہنگامہ عشق کی تاب نہ لاسکی چنانچہ ہم نے آہ و فریاد کی باگ ڈور تیرے غم کے ہاتھ میں دے دی۔

یعنی عشق کے صدموں سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تو نالہ و فریاد کرنے لگے۔

تا شاهد رازت بخموشی شده رسوا

چون پرده به رخسار فروهشت بیان را

راز جب تک خموشی میں رہے، پنہاں رہتا ہے۔ جب اظہار و بیاں میں آئے افشا ہو جاتا ہے۔ مرزا غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ راز حقیقت کی شرح و بیان میں نہیں آسکتا۔ اس بات کو خدا سے خطاب کرتے ہوئے یوں ادا کیا کہ اے خدا تیرا شاہد راز، اپنی خموشی کے باعث (کیونکہ وہ کسی سے بات نہیں کرتا) رسوا ہوگیا ہے۔ اس نے بیان کو نقاب کی طرح اپنے چہرے پر ڈال لیا ہے۔ یعنی راز یوں تو ظاہر ہے لیکن اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کا یہ اردو شعر اسی نکتے کا آئینہ دار ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یعنی تو ہی نغمہ ہائے راز سے آگاہ نہیں ورنہ یہاں جس کو تو حجاب کہہ رہا ہے وہی ساز کا سُر ہے۔

در مشرب بیداد تو خونم مئی ناب است

کز ذوق بخمیازه در افگنده کمان را

خمیازہ انگڑائی کو کہتے ہیں۔

خمیازہ کشیدن = انگڑائی لینا۔ درخمیازہ افگندہ = کسی کو انگڑائی کی حالت میں ڈال دینا۔

شراب پینے والوں کا جب نشہ اتر رہا ہو یا پورا نہ ہوا ہو تو وہ انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ انگڑائی لیتے وقت، انسان کے دونوں بازوں یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے کمان ہو۔ کہنا یہ ہے کہ معشوق تیر پہ تیر چلاتا چلا جارہا ہے۔ مگر اس کا شوق ستم کم نہیں ہوتا۔ اسے یوں بیان کیا۔

”تیرے مسلک بیداد میں میرا خون، شراب ناب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی کیفیت سے کمان پر (بجائے نشے کے) خمار کی حالت طاری ہورہی ہے۔ اور وہ انگڑائیاں لے رہی ہے“

مسلک، مشرب، مذہب تینوں لفظ مترادف ہیں اور طریق یا طریقے کے معنی دیتے ہیں۔ اس شعر میں شاعر نے مشرب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو مئے وشراب کے اعتبار سے بے حد موزوں اور بلیغ ہے۔

بر طاعتیان فرخ و بر عشرتیان سهل

نازم شب آدینۂ ماه رمضان را

طاعتیاں، طاعتی کی جمع اور عشرتیاں، عشرتی کی جمع ہے۔ دونوں میں ”ی“ فاعلی ہے۔ طاعتیاں، اطاعت گذار بندے اور عشرتیاں، اصحاب عیش و نشاط ہیں۔

شب آدینہ، جمعہ کی رات، جمعہ چھٹی کا دن ہوتا ہے اس لیے شب آدینہ یعنی جمعہ کی رات، خاص کر رمضان کے مہینے میں، اطاعت گذاروں اور عیش و نشاط والوں دونوں کے لئے موزوں ہے۔ اطاعت گذاروں، کے لئے یہ رات مبارک ہے کہ وہ جتنی چاہیں عبادت کریں اور

شرابیوں کے لئے اس میں سہولت ہے کہ جب تک چاہے جی کھول کر پیتے رہیں۔ دوسرے مصرعے میں ردیف ”را“ پر کے معنوں میں آیا ہے۔ جس سے مصرعے کا مفہوم یہ ہوگیا ہے۔ کہ میں ماہ رمضان کی شب آدینہ ”پر“ ناز کرتا ہوں۔

اینک زده‌ام بال تقاضا ز دو مصرع

تا مژدهٔ معراج دهم سعی بیان را

فارسی میں ”بال زدن“ پر مارنا ہے تا کہ پرندہ اڑ سکے۔ تقاضا سے مقصود، تقاضائے زور بیاں ہے۔

کہتا ہے کہ لو میں نے اب دو مصرعے لے کر انھیں پر بنالیا ہے تا کہ میں پرواز کروں اور اس سے اپنی سعی بیان کو معراج کی خوش خبری سناؤں۔

ان دو مصرعوں کو شاعر نے ایک نیا مطلع بنایا ہے اور اس مطلع میں اپنے بیان کی بلند پروازی دکھائی ہے۔

معراج، بلندی ہے لیکن یہاں اس لفظ میں ایک لطیف نکتہ بھی پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ یہاں سے اشعار میں نعتیہ رنگ آ گیا ہے۔

زینسان که فرو رفته بدل پیر و جوان را

مژگان تو جوهر بود آئینۂ جان را

”بدل پیر و جواں را“ میں را اضافت کا ہے۔ چنانچہ الفاظ کی ترتیب یوں ہے ”بدل پیر و جواں“ دوسرے مصرعے کی نثر بھی یوں ہوگی:

مژگان تو جوهر آئینه جان بود

جوہر آئینہ سے مراد آئینے کی چمک ہے۔

شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ تیری مژگاں، ہر بوڑھے اور جوان کے دل میں اس طرح سے چبھی ہوئی ہیں کہ وہ آئینہ جاں کا جوہر بن گئی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تیری نگاہیں ہر پیر و جواں کی روح کو جلا بخشتی ہیں، گویا وہ روح رواں ہیں۔

واداشت سگ کوئی تو زین حد نشناسی

در پائی تو می خواستم، افشاند روان را

حد نشناسی = اپنے مقام اور حد کو نہ پہچاننا، حد سے گزر جانا۔ وا داشتن = روک دینا۔

میں چاہتا تھا کہ اپنی جان تیرے قدموں پر نثار کر دوں، اس جرأت اور حد سے تجاوز کرنے پر تیرے سگ کوچہ نے مجھے روک دیا۔

کتے کا خاصہ ہے کہ وہ کسی غیر آدمی کو گلی میں آنے سے روکتا ہے اور اگر آ جائے تو اسے کسی غیر حرکت سے باز رکھتا ہے۔

بر تربتم از نخل قدت جلوہ فرو بار

تا خاک کند نو بر از آن پای نشان را

'پائے نشان را' میں را اضافی ہے یعنی نشان پا۔ نو بر جسے نوبادہ بھی کہتے ہیں۔ وہ پھل جو بازار میں تازہ آیا ہو۔ دستور ہے کہ جب کوئی پھل پہلے پہل بازار میں آتا ہے تو اسے لوگ ضرور چکھتے ہیں۔ اسے نو بر کردن یا نوبادہ کردن کہتے ہیں۔

اب ذرا تصور کیجئے کہ عاشق کی موت تازہ واقع ہوئی ہے اور قبر پر عزیز و احباب کی آمد ابھی شروع نہیں ہوئی۔ وہ چاہتا ہے سب سے پہلے اس کا محبوب آئے اور اس کی خاک مزار کو نوازے اور میری تربت پر اپنے درخت جیسے قد کا سایہ ڈال (جلوہ افشانی کر) تا کہ میری خاک تیرے نشان پا کو چوم سکے (مزہ چکھ سکے) گویا محبوب کے قدموں کے نشان اس تازہ پھل کی

طرح ہوں گے جسے لوگ بڑی خواہش سے کھاتے اور اس کا مزہ چکھتے ہیں۔

جستیم سراغ چمن خُلد بہ مستی

در گرد خرام تو، رہ افتاد گماں را

گماں را رہ افتاد = خیال ادھر کو چل پڑا۔

ہم یونہی مستی میں چمن خلد کو تلاش کر رہے تھے۔ (اچانک) خیال اس گرد کی طرف چلا گیا جو تیری خرام کی وجہ سے اُٹھ رہی تھی۔ یعنی اس گرد پر ہمیں یہ شبہ ہوا گویا وہ گرد و غبار نہیں بلکہ چمن خلد کھلا ہوا ہے۔

اس لحاظ سے گماں کا لفظ شعر میں بڑا پر معنی ہے۔ پہلے مصرعے میں مستی کا لفظ شعر کی جان ہے اور اردو کا لفظ ''دھن'' اس کے مفہوم کے قریب آتا ہے۔

مرزا غالب کے نزدیک خلد درحقیقت محبوب کی رہگزر ہی ہے اور کچھ نہیں۔ اس خیال کو جگہ جگہ مختلف پرایوں میں ادا کیا ہے۔ مثلاً یہ شعر۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست

لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

ای خاک درت قبلہ جان و دل غالب

کز فیض تو پیرایہ ھستی است جھان را

یہاں سے صاف نعتیہ رنگ شروع ہوتا ہے۔

تیرے دروازے کی مٹی غالبؔ کے جان و دل کا قبلہ ہے۔ کیونکہ تیرے فیض سے ہستی کائنات کی آرائش ہے۔

تا نام تو شیرینی جان داده به گفتن
در خویش فرو برده دل از مهر زبان را

تیرا نام لینے سے میری گفتار میں جان کی سی شیرینی آ گئی ہے، اس شفقت اور محبت کے اثر سے میرے دل نے زبان اپنے اندر کھینچ لی ہے یعنی خاموش ہو گیا۔

خاموش ہونے کے دو پہلو ہیں:

ایک تو یہ کہ اس بات کا شکر لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا، دوسرے یہ کہ دل اندر ہی اندر مزے لے رہا ہے۔

اسی لیے تو مرزا غالب نے ''شیرینی جان'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں گویا رسول پاک ﷺ کا نام لینے سے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جسم میں جان تازہ آ گئی ہے۔

بر امت تو دوزخ جاوید حرام است
حاشا که شفاعت نه کنی سوختگان را

آپ ﷺ کی امت پر ہمیشہ دوزخ حرام ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ جلنے والوں کی شفاعت نہ کریں۔ یعنی یقیناً رسول پاک ﷺ اپنے گناہگار امتیوں کی شفاعت کریں گے اور وہ بخشے جائیں گے۔

غزل نمبر (۴)

چون عذار خویش دارد، نامه اعمال ما
ساده پُرکارِ فراوان شرم، اندک سال ما

عذار = رخسار   فراواں شرم = بے حد شرمیلا
سادہ = بھولا بھالا   اندک سال = کم سن۔
پرکار = ہشیار

شعر کے دوسرے مصرعے میں شاعر نے اپنے محبوب کی صفات گنوائی ہیں: وہ بھولا بھالا ہے اور پھر شوخ اور چالاک بھی ہے اور اس پر بے حد شرمیلا اور کمسن بھی۔ جب معشوق میں یہ اوصاف موجود ہوں تو عاشق کو حسن کی بارگاہ میں کسی طرح کی گستاخی کی جرأت نہیں ہو سکتی بلکہ وہ اس میں پاکیزہ جذبات کو پیدا کرتا ہے۔ اور اس کا اعمال نامہ ویسا ہی سادہ رہتا ہے جتنا اس معشوق کا حسن یا چہرہ سادہ ہے۔ عذار محبوب اور نامہ اعمال عاشق میں باعث مشابہت، دونوں کا پاک وصاف ہوتا ہے۔ حسن معصوم ہے عشق بھی پاکیزہ ہے۔

میل ما سوی وی و میلش بسوی چون خودی است
آرد از خود رفتنش ناگه باستقبال ما

ازخود رفتن = بے خود ہونا

ہم تو اس کی طرف مائل ہیں اور وہ اپنے جیسے کسی اور حسین پر فریفتہ ہے۔ یہ فریفتگی اور عالم وارفتگی کسی نہ کسی دن اچانک، اسے ہمارے استقبال کے لئے لے آئے گی۔ یعنی اسے ہماری محبت اور دلبستگی کا احساس ہوگا۔

حال ما از غیر می پرسی و منت می بریم
آگهی باری کہ آگہ نیستی از حال ما

تو ہمارا حال غیر (رقیب) سے پوچھتا ہے اور ہم اس پر بھی ممنون ہیں۔ اس سے کم از کم یہ پتا تو چلتا ہے کہ تجھے اتنا احساس تو ہے کہ تو ہمارے حال سے آگاہ نہیں۔ (معشوق کا عاشق کے بارے میں پوچھنا ہی اس کی دلچسپی کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے)

عیش و غم در دل نمی استد، خوشا آزادگی
بادہ و خونابہ یکسان است در غربال ما

دنیا کا عیش اور غم کوئی بھی ہمارے دل میں آکر نہیں ٹھہرتا۔ کیا اچھی آزادمنشی ہے ہماری چھلنی میں شراب اور خون دونوں برابر ہیں یعنی دونوں بہہ جاتے ہیں۔

نقش ما در خاطر یاران دژم صورت گرفت
بسکہ رو درهم کشید آئینہ از تمثال ما

چونکہ ہماری صورت سے آئینے نے ناک بھوں چڑھائی، ہمارے دوستوں کے دل میں بھی ہمارا نقش ٹیڑھا بیٹھ گیا۔

نیشتر سازید و بگدازید هرجا تیشہ ایست
خون گرم کوهکن دارد رگ قیفال ما

قیفال = یونانی الاصل لفظ ہے۔ ایک رگ جہاں فصد کھولتے ہیں۔
ہماری رگ قیفال میں کوہکن (فرہاد) کا خون گرم جوش مار رہا ہے، اس لیے جہاں بھی

تیشہ ملے، اسے لو، پگھلاؤ اور نشتر بنالو تا کہ فصد کھولی جائے اور یہ خون گرم بہہ جائے۔
فرہاد کا جوش عشق تیشے کی ضرب سے کم ہوا تھا، ہمارے خون گرم کو سرد کرنے کے لیے اسی تیشے ہی سے بنا ہوا نشتر مفید ہوگا۔

ما ہمای گرم پروازیم، فیض از ما مجو
سایہ همچو دود بالا می رود از بال ما

ہما ایک پرندہ ہے، جس کا سایہ مبارک سمجھا جاتا ہے۔
شاعر کہتا ہے کہ ہم بلند پرواز ہما ہیں، ہم سے کسی فیض کی توقع نہ رکھ کیونکہ ہمارا سایہ ہمارے پروں سے بجائے نیچے پڑنے کے، دھوئیں کی طرح اوپر کو جاتا ہے۔
یعنی ایسے بلند مقام پر ہیں کہ کسی کی وہاں تک رسائی نہیں ہوسکتی۔

خضر در سرچشمۂ حیوان فرو غلتیدنش
لغزش پائی است کش رودادہ در دنبال ما

مرزا غالب نے اس شعر میں ایک تصویر کھینچی ہے جس کے نقش کچھ اس طرح ابھرتے ہیں کہ غالب اور خضر دونوں ہم سفر ہیں۔ غالب بہت آگے ہیں اور خضر بہت پیچھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سفر کے دوران میں چشمۂ حیواں آیا۔ تو خضر (حیات جاودانی حاصل کرنے کے لیے) اس چشمۂ حیوان ہی میں غوطہ زن ہو گئے اور غالب آگے نکل گئے۔
مرزا غالب کی نظر میں خضر کا یہ عمل ایک طرح کی لغزش پا تھی ورنہ سفر زندگی اور اس کی تگ و دو یوں ختم نہیں ہو جاتی۔ چنانچہ شعر میں اس بات کو یوں بیان کیا کہ---
خضر کا چشمۂ حیواں میں غلطاں ہونا ایک ایسی لغزش پا ہے جو اسے یعنی خضر کو ہمارے عقب میں رہ کر پیش آئی۔

خاک را از ابر ادرار معیّن دادہ اند

بی مَی پارینہ برما راندہ اند امسالِ ما

ادرار = بہنا۔ اسی لیے زور کی بارش کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ اس شعر میں ابر کی رعایت سے آیا ہے۔

پارینہ = پچھلے سال کی یا پرانی

خاک پر بادل سے مقرر، مقدار ہی میں بارش ہوتی ہے۔ اس سال کو بغیر مے پارینہ کے ہماری طرف دھکیل دیا گیا ہے۔ یعنی ابر رحمت سے اس سال بارش مے نہیں ہوئی۔ یہ سال خالی گیا۔

اب مے پارینہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ امسال کی رعایت سے مے پارینہ سے مراد وہ شراب ہے جو گذشتہ سال یعنی پارسال میسّر آئی تھی۔ اور دوسرے معنی شراب کہن ہیں، جو پرانی ہونے کے باعث تیز اور عمدہ سمجھی جاتی ہے۔

با چنین گنجینہ ارزد، اژدہائی ہم چنیں

حلقہ بر گرد دل ما زد زبان لال ما

زبان لال = زبان گنگ، زبان خاموش

پرانے زمانے میں لوگ اپنے خزانے کسی ویرانے میں دفن کر دیتے تھے تا کہ چرائے نہ جاسکیں اسی سے یہ توہم بھی لوگوں میں پھیل گیا کہ اس خزانے پر سانپ بیٹھتا ہے شعر میں اسی عام عقیدے کی طرف اشارہ ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ ہماری خاموش زبان ہمارے دل کے گرد حلقہ ڈال کر بیٹھ گئی ہے۔ ہاں، ایسے خزانے کے لیے (یعنی دل کے خزانے کے لیے) ایسا ہی اژدہا ہونا چاہیے۔

خاموش رہنے سے انسان کے خیالات کا خزانہ چھپا رہتا ہے۔

جانِ غالب! تاب گفتاری گمان داری ہنوز

سخت بیدردی کہ می پرسی ز ما احوال ما

مرزا غالب اپنے محبوب سے خطاب کر کے کہتے ہیں: جان غالب! تجھے ہم سے ابھی تک تاب گفتار کی توقع ہے۔ تو سخت بے درد واقع ہوا ہے۔ کہ ہم سے ہمارا حال پوچھ رہا ہے۔

تاب گفتار کے نہ ہونے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اب صورت حال عرض حال کے مرحلے سے گزر چکی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ عرض حال کی طاقت ہی نہیں رہی۔ ان دو حالتوں کے پیش نظر پرسش حال کرنا بے دردی نہیں تو اور کیا ہے۔

غزل نمبر (۵)

گر بیائی مست، از در گلزار ما

گل ز بالیدن رسد تا گوشۂ دستار ما

اگر تو مستانہ وار، اچانک ہمارے باغ کے دروازے سے اندر آجائے تو (تیرے جلوۂ حسن سے) پھول اتنے پھولیں پھلیں، (ان میں اتنی شگفتگی آجائے) کہ وہ خود بخود ہمارے گوشۂ دستار تک پہنچ جائیں۔

یعنی پھولوں میں وہ رعنائی آجائے کہ ہم انھیں اپنے زیب دستار کریں کہ وہ تمہارے حسن ہی سے چمکتے ہیں۔ مرزا غالب نے بالکل یہی خیال اردو کے اس شعر میں ادا کیا ہے۔

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

وحشتی در طالع کاشانۂ ما دیدہ است
می پرد چون از رخ، سایہ از دیوار ما

ہمارے گھر کے نصیبے میں اُس نے کچھ ایسی وحشت دیکھی ہے کہ ہماری دیوار کا سایہ، دیوار سے یوں بھاگتا ہے جیسے چہرے سے رنگ اڑ جاتا ہے۔

مرزا غالب نے اپنے گھر کی پریشان حالت کو یوں بیان کیا ہے کہ اس کے در و دیوار پر وحشت برستی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے اس کا سایہ بھی اس سے گریزاں ہے۔

گوشہ گیرانیم و محو پاس ناموس خودیم
آبروئی ما گداز جوھر رفتار ما

ہم گوشہ نشیں ہو گئے ہیں اور خلوت میں بیٹھے اپنے پاس ناموس میں محو ہیں۔ اس گوشہ نشینی ہی میں ہماری عزت محفوظ ہے۔ گویا ہماری (طاقت) رفتار کا جوہر گداز ہو کر ہماری آبرو کا سامان بن گیا ہے۔

جب کوئی چیز گداز ہو جائے تو اس میں ایک چمک سی آجاتی ہے۔ شاعر نے اسی لحاظ سے آبرو کا سامان کہا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ اب اس گوشہ نشینی ہی میں عزت و آبرو محفوظ ہے

خستۂ عجزیم و از ما جز گنہ مقبول نیست
تکیہ دارد بر شکست توبہ استغفار ما

ہم خستۂ عجز ہیں کہ ہم سے سوائے گناہ کے کوئی چیز قبول نہیں کی جاتی۔ ہمارا استغفار شکست توبہ کا سہارا لیے ہوئے ہے۔ یعنی ہم توبہ کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالی سے معافی مانگتے ہیں۔ لیکن یہ توبہ، توبہ نہیں بلکہ شکست توبہ ہوتی ہے کیونکہ فوراً ٹوٹ جاتی ہے۔

توبہ کو توڑنا بھی اک گناہ ہے اس طرح سے گناہ کرنا اور گناہوں سے توبہ کرنا برابر ہے۔

اس بات کو شاعر نے یوں ادا کیا ہے کہ سوائے گناہ کے ہماری کوئی چیز مقبول نہیں۔ اور یہی بات اس کے عجز کی دلیل بھی ہے۔

سخت جانیم و قماش خاطر ما نازک است
کارگاہ شیشہ پنداری بود کھسار ما

قماش، کا لفظ رخت و سامان، جامہ اور جوہر تینوں معنی دیتا ہے۔ یہاں جوہر کے مفہوم میں آیا ہے۔ قماش خاطر ما نازک است کے معنے ہیں، ہمارا مزاج نازک ہے۔ شاعر نے اپنی سخت جانی کو کہسار کہا ہے اور اپنی نازک مزاجی کو کارگاہ شیشہ یعنی شیشے بنانے کا کارخانہ۔

یوں تو ہم سخت جان ہیں۔ دکھ پہ دکھ اٹھائے چلے جاتے ہیں اور مرتے نہیں۔ لیکن ساتھ ہی مزاج اتنا نازک واقع ہوا ہے کہ شیشے کی طرح ہلکی ٹھیس بھی برداشت نہیں کرتا۔

می خزاید در سخن رنجی کہ بر دل می رسد
طوطی آئینۂ ما می شود زنگار ما

طوطی آئینہ: پرانے زمانے میں دستور تھا کہ طوطی کو باتیں کرنا سکھانے کے لیے اسے

ایک آئینے کے سامنے بٹھا دیتے تھے۔ اور ایک شخص یا ایک طوطی آئینے کے پیچھے بیٹھ کر وہ باتیں کرتا جو سکھانی مقصود ہوتیں، طوطی اپنا عکس آئینے میں دیکھ کر یہ سمجھتا کہ یہ باتیں اس کا حریف یا مدمقابل جو آئینے میں ہے، کر رہا ہے۔ اور پھر وہی باتیں کرتا۔ طوطی آئینہ سے مراد وہ طوطی ہے جو آئینے میں ہے۔ اسی سے طوطی پس آئینہ وہ شخص ہے جو آئینے کے پیچھے بیٹھ کر طوطی کو باتیں سکھاتا ہے۔

طوطی کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ زمانہ قدیم میں آئینہ فولاد کا ہوتا تھا۔ اور موسم باراں میں زنگ آلود ہو جاتا ہے جسے صاف کرنا پڑتا تھا۔ اسے زنگار بھی کہتے ہیں۔ اس شعر میں طوطی کے رنگ کی رعایت سے زنگار کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

شعر کا سادہ اردو ترجمہ یہ ہے:

جو دکھ اور رنج دل کو پہنچتا ہے وہ گفتار میں آ کر بڑھ جاتا ہے، ہمارا زنگار ہمارا طوطی آئینہ بن جاتا ہے۔

شاعر نے دکھی دل کو زنگار کہا ہے۔ اور سخن یا گفتار کو طوطی آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔ دل آئینے کی طرح ہوتا ہے۔ اور رنجیدہ ہونے پر، گویا زنگ آلودہ ہو جاتا ہے اس کے زنگار آلودہ یا زنگ آلودہ ہونے کی رعایت سے شاعر نے اسے طوطی آئینہ بھی کہہ دیا ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دل کو کوئی دکھ پہنچے تو وہ دکھ تلخ فریاد بن کر لب پر آ جاتا ہے۔ گویا یہ زنگار طوطی آئینہ یا طوطی گفتار بن جاتا ہے۔

از گداز یک جهان هستی، صبوحی کرده ایم

آفتاب صبح محشر، ساغر سر شار ما

صبوحی اس شراب کو کہتے ہیں جو صبح سویرے پی جائے۔ ساغر سرشار، ایسا جام ہے جو مستیوں سے لبریز ہو۔

قیامت کے دن ہستی کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس فنائے ہستی کو شاعر نے گداز ہستی کہا ہے اور اسی رعایت سے یہ کہا ہے کہ ہم نے ہستی کے گداز کو صبوحی بنا کر پی لیا۔ یہ آفتاب قیامت ہمارا جام سرشار ہے۔

سر گرانیم از وفا و شرمساریم از جفا

آه از ناکامی سعی تو در آزار ما

سرگراں = متکبر اور مغرور کو کہتے ہیں اس کا مفہوم بے اعتنا اور بے نیاز کا بھی ہے اور یہاں اسی مفہوم میں آیا ہے۔

معشوق کا شیوہ، عاشق کو آزار پہنچانا ہے۔ معشوق اور عاشق کے مابین، یا رابطۂ وفا ہو سکتا یا رابطہ جفا۔

مرزا غالب کہتے ہیں کہ ہم لوگ وفا سے بے نیاز ہیں اور جفا سے ہمیں شرمساری ہوتی ہے کہ ہمیں ممنون احساس فرمایا گیا۔ اب وفا ہو کہ جفا دونوں حالتوں میں محبوب کی آزار رسانی کی کوشش ناکام رہتی ہیں جس کا ہمیں افسوس ہے۔

چاک لا اندر گریبان جهات افگنده ایم

بی جهت بیرون خرام از پردهٔ پندار ما

اس خیال کو کہ شش جہت میں اس کی ذات کے سوا کوئی موجود نہیں، یوں ادا کیا کہ ہم نے جہات کے گریباں کو لا سے چاک کر ڈالا ہے۔

ذره جز در روزن دیوار نگشود است بار

جنس بیتابی به دزدی برده از بازار ما

بارکشودن = بوجھ اتار کر رکھنا

بہ دزدی بردن = چرا کر لے جانا

ذرے فضا میں بے تاب اور سرگرداں رہتے ہیں۔ انھیں کہیں قرار نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ ذرات ایک جگہ اپنا سامان کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور وہ جگہ روزن دیوار ہے۔ وہ دیوار کے اندر یعنی مکان میں نہیں ٹھہرتے۔ یقیناً انھوں نے بیتابی کا سامان ہمارے بازار سے چرا لیا ہے۔

از نم باراں نشاط گل بد آموز تو شد
گریۂ ابر بھاری کردہ آبی کار ما

بارش کے برسنے سے پھولوں کی تازگی اور شادابی نے تجھے غلط سبق پڑھایا۔ ابر بہار کے گریہ نے ہمارے کام پر پانی پھیر دیا۔ یعنی محبوب آمد، بہار سے پھولوں کے نظاروں میں محو ہو گیا اور اس کی توجہ ہماری طرف کم ہو گئی۔ بہار کیا آئی، ہماری خزاں آگئی ہے۔

غالب از صہبای اخلاق ظھوری سر خوشیم
پارہ بیش است از گفتار ما کردار ما

مرزا غالب جن شعرائے فارسی سے زیادہ متاثر تھے ان میں ایک ظہوری بھی تھے۔ انھوں نے ان شعرا کی بعض زمینوں میں غزلیں لکھی ہیں جن میں ایک غزل یہ ہے۔ مقطع کا دوسرا مصرعہ ظہوری ہی کا ہے۔

اس مقطع میں مرزا غالب نے اس تاثر کا اظہار کیا ہے۔ جو انھوں نے ظہوری کے افکار و بیان سے لیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم ظہوری کی مئے اخلاق سے سرشار ہیں۔

ہمارا کردار ہماری گفتار سے کچھ زیادہ ہے۔

"ہمارا کردار ہماری گفتار سے بلند تر ہے" یہی اخلاقی سبق ہے جو مرزا غالب کو مرغوب ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۶)

نمی بینیم در عالم نشاطی کآسمان ما را
چو نور از چشم نابینا، ز ساغر رفت صھبا را

شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں ہمیں کوئی ایسی خوشی نظر نہیں آتی جسے آسمان نے ہمارے ساغر شراب سے یوں نہ غائب کر دیا ہو۔ جس طرح ایک نابینا کی آنکھوں سے نور چھن جاتا ہے۔

مرزا غالب کے کلام میں شدید احساس غم پایا جاتا ہے۔ یہ شعر اسی احساس غم کا اظہار ہے اُن کا یہ شعر دیکھیے:

جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

مکن ناز و ادا چندین، دلی بستان و جانی هم
دماغ نازک من بر نمی تابد تقاضا را

اتنے ناز و ادا سے کام نہ لے۔ دل بھی لے لے اور جان بھی۔ میرا دماغ بڑا نازک ہے۔ اس سے تقاضا برداشت نہیں ہو سکتا۔

سراب آتش از افسردگی چون شمع تصویرم
فریب عشقبازی می جہم اھل تماشا را

سراب، وہ چمکتی ہوئی ریت جو دور سے پانی نظر آتی ہے۔ مرزا غالب نے اپنے دل کو جو افسردہ ہوگیا، لیکن عشق کا دعوے دار ہے، سراب کو آتش کہا ہے جو آگ کی طرح دکھائی دیتا ہے مگر آگ نہیں، محض سراب آتش ہے فریب نظر ہے اور پھر اس سراب آتش کو شمع تصویر سے تشبیہ دی ہے۔ جو بظاہر شمع نظر آتی ہے مگر اس میں سوز نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں کہ میں افسردگی کے ہاتھوں، شمع تصویر کی طرح سراب آتش بن گیا ہوں۔ محض دیکھنے والوں (اہل تماشا) کو عشقبازی کا دھوکا دیتا ہوں۔ اُن کا یہ شعر دیکھیے اسی حالت کی آئینہ داری کررہا ہے۔

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

من و ذوق تماشای کسی، کز تاب رخسارش
جگر بر تابہ چسپد، آفتاب عالم آرا را

تابہ =توا

دوسرے مصرعے میں را اضافی ہے یعنی جگر آفتاب عالم آرا۔ شاعر کہتا ہے کہ میں ایسے حسن کے نظارے میں محو ہوں کہ جس کے رخسار کی تابانی اور گرمی سے آفتاب جہاں تاب کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا جگر کسی تپتے ہوئے توے کے ساتھ چسپاں ہوگیا ہے۔

تاب کے لفظ کو بڑی خوبی سے استعمال کیا، اس کا مفہوم تابانی بھی ہے اور تپش بھی۔

تاب اور تابہ کے لفظوں میں تجنیس زائد ہے۔

چہ لب تشنہ است خاکم، کاستین گرد بادمن
چو اشک از چہرہ، از روی زمیں بر چید دریا را

لب تشنہ = پیاسا۔ گرد باد= بگولا۔

دریا فارسی میں سمندر کے معنوں میں آتا ہے۔

میری خاک کس قدر پیاسی ہے کہ خاک سے اٹھنے والے بگولوں کی آستین، روے زمین سے سمندر کو یوں چوس لیتی ہے جیسے چہرے سے آنسوں پونچھ لیتے ہیں۔

خیالش را بساطی بھر پا انداز می جستم
پسندیدم بہ مستی مخمل خواب زلیخا را

پا انداز= وہ قالین یا کپڑا جو پاؤں کے نیچے بچھایا جاتا ہے۔ بساط=فرش۔

شاعر نے محبوب کے خیال کو ایک مجسم صورت دی ہے۔ کہتا ہے کہ میں سوچ رہا تھا کہ کون سا فرش پا انداز اس کے خیال کے لیے موزوں ہوگا اور اس سوچ میں کھو گیا اور میں نے زلیخا کے بستر خواب کی مخمل کو پسند کیا۔

مرزا غالب اپنی ندرت بیان سے لفظوں کو نئے نئے معنوی سانچوں میں ڈھالتے ہیں۔ یہاں ''مستی'' کے لفظ میں بڑی بلاغت ہے۔ اور یہی شعر کی جان ہے۔ شاعر کا منشا یہ ہے کہ مخمل خواب زلیخا کو یونہی مستی میں انتخاب کرلیا گیا ورنہ وہ محبوب کے کوئی شایان شان شے نہ تھی۔

دل مایوس را تسکین بہ مردن می توان دادن
چہ امید است آخر خضر، ادریس و مسیحا را

دل مایوس کو مر جانے ہی سے تسکین دی جا سکتی ہے۔ سوچتا ہوں کہ آخر، خضر، ادریس اور مسیحا کس امید پر بیٹھے ہیں۔ ان کی زندگی جاویدانی ہے، کبھی مایوس ہوئے تو کیا کریں گے۔ موت تو آنے کی نہیں۔

بهاران است و خاک از جلوهٔ گل امتلا دارد

به رگ زن نشتر از موج خرام ناز صحرا را

امتلا = لغوی معنی بھر جانے کے ہیں۔ اصطلاح طب میں جوش خون یا زیادتی خون کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر لوگ نشتر سے فصد کھلواتے تھے اور کچھ خون نکل جانے سے، جوش خون کم ہو جاتا تھا اور تسکین ہو جاتی تھی۔

بہار آئی ہے اور زمین (سرخ) پھولوں کے جلووں سے لبریز ہے۔ (گویا اسے امتلائے خون ہو گیا ہے۔ اور اپنے خرام ناز سے صحرا کی رگ میں نشتر چبھو دے تا کہ یہ جوش بہاراں ماند پڑ جائے۔

مطلب یہ ہے کہ محبوب آئے گا تو بہاروں کے جلوے ماند پڑ جائیں گے۔

سر و کارم بود با ساقئی کز تندی خُویش

نفس در سینه می لرزد ز موج باده مینا را

مجھے ایک ایسے ساقی سے واسطہ پڑا ہے جس کی تندیِ خو کے باعث شراب میں لہروں کا جوش ابھرتا ہے اور اس سے صراحی کے سینے میں سانس لرزنے لگتا ہے۔

شراب کی تیزی اور تندی سے اس میں جوش پیدا ہوتا ہے اور لہریں ابھرتی ہیں۔ شاعر نے شراب کے اس جوش کو ساقی کی طرف منسوب کیا ہے گویا یہ اس کی تند طبیعت کا اثر ہے۔

خطی بر هستی عالم کشیدیم از مژه بستن

ز خود رفتیم و هم با خویشتن بردیم دنیا را

خط بر چیزی کشیدن = کسی چیز کو کاٹ دینا۔

اس شعر کا پس منظر یہ عقیدہ ہے کہ اس کائنات کا وجود خارجی نہیں بلکہ ذہنی ہے۔ ہم ہیں تو جہاں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم نے آنکھ بند کی اور اس سے وجود عالم پر لکیر کھینچ دی۔ یعنی عالم کا وجود ختم ہو گیا۔ ہم اپنے آپ سے گئے اور اپنے ساتھ دنیا کو بھی بھول لے گئے۔

در آغوش تغافل، عرض یک رنگی توان دادن

تهی تا می‌کنی پهلو، بما بنموده جا را

تغافل = ایسی غفلت جو بناوٹی ہو۔

محبوب اپنے عاشق سے غافل نہیں ہوتا لیکن ظاہر کرتا ہے کہ غافل ہے اور ارادتاً اس سے پہلو تہی کرتا ہے۔ اور اس کا ایسا کرنا ایک ادائے معشوقانہ خیال کیا جاتا ہے۔

اس شعر کا پس منظر متصوفانہ ہے۔ خدا ہمیں نظر نہیں آتا، بظاہر وہ ہم سے الگ رہتا ہے۔ لیکن اس کا الگ رہنا یا ہم سے پہلو تہی کرنا محض تغافل ہے۔ حقیقت میں وہ ہم میں موجود ہے۔ وہ اور ہم ایک ہیں۔ اسی حالت کو شاعر نے یک رنگی کہا ہے۔ جس میں "من و تو" کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں جب معشوق حقیقی ہم سے بظاہر پہلو تہی کرتا ہے تو ہمیں اس کا سراغ مل جاتا ہے اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ ہم سے دور نہیں ہمارے آغوش ہی میں ہے۔ محض پہلو تہی کر رہا ہے۔ جو ایک شان معشوقانہ ہے۔

نمی رنجد که در دام تغافل می تپد صیدش

نمی دانم چه پیش آمد نگاه بی محابا را

نگاہِ بی محابا = بے باک نگاہ۔ ایسی نگاہ جو بغیر کسی جھجک کے ڈالی جائے۔

ہمارے محبوب کو ذرا بھی اس بات سے تکلیف نہیں ہوتی کہ اس کا شکار اس کے دام تغافل میں پڑا تڑپ رہا ہے۔ اللہ جانے اس کی بے دھڑک نگاہوں کو کیا ہو گیا ہے اور وہ کیوں غفلت سے کام لے رہا ہے۔

زمین گوی است، کو مجنون، کہ من بردم زمیدانش

غبارم، در نورد خود، فرو پیچید صحرا را

گوے = گیند۔

گوئے ازمیدان بردن = جیت جانا۔ چوگان بازی میں حریف سے گیند چھین کر لے جانا، گویا اس سے سبقت لے جانا ہے۔ اسی سے ایک اور محاورہ، گوے سبقت بردن ہے۔ اور اردو میں بھی رائج ہے: گوے سبقت لے جانا۔

مجنوں کی صحرانوردی ضرب المثل ہے۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ زمین ایک گیند ہے۔ مجنوں کہاں ہے؟ اسے بتادو کہ میں اس گیند کو اس سے میدان ہی سے چھین کر لے گیا ہوں۔ یعنی میں صحرانوردی کی بازی جیت گیا ہوں۔ میری خاک کے گرد و غبار نے صحرا کو اپنی ایک لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اور میں نے صحرانوردی کے تمام مرحلے ایک ہی جست میں طے کر لیے ہیں۔

ازین بیگانگیھا می تراود، آشنائی ھا

حیا می ورزد و در پردہ رسوا می کند مارا

معشوق شرم و حجاب کی وجہ سے بظاہر عاشق سے بیگانگی اور بے رخی برتتا ہے لیکن اس کی بیگانگی کا انداز ایسا ہے کہ اس سے آشنائی کا رنگ ٹپکتا ہے اور تاڑنے والے تاڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ جس راز کو وہ چھپانا چاہتا ہے وہ نہیں چھپتا اور ہم اس کے ایسا کرنے سے درپردہ

رسوا ہو رہے ہیں۔

شاعر "بیگانگی ہا" اور آشنائی ہا" جمع کے الفاظ لایا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ معشوق جتنے بھی مختلف انداز بیگانگی اختیار کرتا ہے وہ سب کے سب آشنائی کے انداز بن جاتے ہیں۔

حذر از زمہریر سینہ آسودگان غالب

چہ منت ھا کہ بر دل نیست جان ناشکیبارا

زمہریر = فضا میں ایک کرۂ سرد ہے جو کرۂ ہوا کے وسط میں ہے اور بے حد سرد ہے۔ اسے زمہریر کہتے ہیں۔

زم سردی ہے۔ اسی سے زمستاں یعنی موسم سرما بنا ہے زم بریر، زم اور بریر سے مرکب ہے۔ معنی ہیں سرد کنندہ۔ قدیم نظریے کے مطابق جب بخارات، سمندر سے اٹھتے ہیں اور اس کرے میں پہنچے ہیں تو منجمد ہو کر بادل بن جاتے ہیں ۔

ایک عقیدے کے مطابق یہ وہ سرد جگہ ہے جہاں کافروں کو شدید سردی کے عذاب میں ڈالا جائے گا۔

آسودگاں سے مراد وہ لوگ ہیں جو درد و سوز محبت سے بالکل عاری ہیں۔ مرزا غالب نے ایسے لوگوں کے سینے کو زمہریر سے تشبیہ دی ہے جو سوز محبت سے بالکل خالی ہیں۔

کہتے ہیں غالب ان آسودہ دلوں کے سینے سے دور رہ۔ ان کا سینہ تو زمہریر ہے۔ یہ بدنصیب محبت کی گرمجوشیوں کی نعمتوں سے محروم ہیں۔ ہمیں دیکھو، ہم پر محبت کی آگ میں جلنے والی جان بیقرار کے کتنے احسان ہیں یعنی ہم نے سوز عشق سے کیا کیا لذتیں سمیٹی ہیں اور اس سے کتنا فیض حاصل کیا ہے۔

سوز عشق ہی ساز حیات ہے اور اسی سے علم و فن کے چشمے۔ پھوٹتے ہیں۔

❀❀❀

غزل نمبر(۷)

پس از کشتن بہ خوابم دید، نازم بدگمانی را
بخود پیچید کہ ھی ھی دی غلط کردم فلانی را

اس بدگمانی کے قربان جاؤں، مجھے قتل کرنے کے بعد اس نے مجھے خواب میں دیکھا اور اب خود ہی پیچ و تاب کھا رہا ہے، اور کہہ رہا ہے کہ ہائے فلاں آدمی کے قتل کے سلسلے میں مجھ سے اشتباہ ہوا اور میں نے غلطی سے اُسے مار ڈالا۔

دلم بر رنج نابرداری فرہاد می سوزد
خداوند! بیامرز آن شہید امتحانی را

رنج نابرداری = دکھ نہ اٹھا سکنا۔

فرہاد کو پہاڑ کاٹنے پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ دراصل اُس کے عشق کا امتحان تھا۔ بقول مرزا غالب وہ اس امتحان میں پورا نہ اُتر سکا اور تیشہ مار کر اپنی جان دے دی۔ اسی بنا پر اسے شہید امتحانی کا نام دیا اور کہا کہ اس میں دکھ سہنے کی پوری طاقت نہ تھی۔ ساتھ ہی اس کے حق میں دعا بھی دی۔ فرماتے ہیں، میرا دل فرہاد کے دکھ نہ اٹھا سکنے پر جلتا ہے۔ اے خدا! اس شہید امتحاں کو بخش دے۔

دریغ از حسرت دیدار، ورنہ جائی آن دارد
کہ بی رویت، بہ دشمن دادہ باشم زندگانی را

افسوس تیرے دیکھنے کی حسرت رہ جائے گی ورنہ صورت حال کا تقاضا یہی ہے کہ جب تیرا دیدار میسر نہیں آتا تو کاش اپنی زندگی کو دشمن یعنی رقیب کی نذر کر دیتا۔ اس شعر میں جان نذر کر دینا جذبۂ ایثار کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ عاشق کو رقیب پر رشک آ رہا ہے کہ وہ محبوب کے دیدار سے فیض یاب ہے اور میں نہیں ہوں۔ چنانچہ کہتا ہے کہ ایسی زندگی رقیب کو دے دوں تو اسے بھی محرومی دیدار کا دکھ ہو اور مزہ آ جائے۔ دیکھوں وہ کیسے ایسی محرومی کی تاب لاتا ہے۔

شعر میں لطیف نکتہ یہ ہے کہ رقیب تاب نہیں لا سکے گا اور اس کے دعوئ عشق کا بھرم کھل جائے گا۔

سرشتم را بپالودند تا سازند از لایش
پر پروانہ و منقار مرغ بوستانی را

سرشت = طینت، فطرت۔ لاے = وہ میل جو کسی مائع کے نیچے بیٹھ جائے۔ میری سرشت کو پاک صاف کیا گیا تا کہ اس میں سے جو میل نکلے اس سے پروانے کے پر اور مرغ بوستاں (طائر نغمہ سرا) کی منقار بنائی جائے۔

پر پروانہ سوز کی علامت ہے اور منقار مرغ بوستانی، نغمہ خوانی کی۔ یہ دونوں وصف ایک شاعر کے بھی ہیں کہ اُس میں سوز دل بھی ہوتا ہے اور سوز بیاں بھی۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ میرے خمیر فطرت سے پروانے کو پر اور مرغ گلستان کو نغمہ خوانی ملی۔ یہ سب میرے ہی سوز دل اور خوش نوائی کا اثر ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر میرے نالے غزل خواں ہوگئیں

چو خودرا ذرہ گویم، رنجد از حرفم زھی طالع
ز خود می دانم بی مھر، نازم مھربانی را

جب میں اپنے آپ کو از رہ انکسار ذرّہ کہتا ہوں تو وہ خفا ہوتا ہے۔اور نہیں چاہتا کہ میں ایسا کروں۔یہ میری خوش نصیبی ہے کہ وہ بے مہر مجھے عزیزوں میں شمار کرتا ہے۔(اپنے سے منسوب کرتا ہے)اور مجھے اس کی اس مہربانی پر ناز ہے۔

شعر میں نکتہ یہ ہے کہ اس کا محبوب باوجود بظاہر بے مہر ہونے کے دل ہی دل میں اسے چاہتا ہے۔اور اسے عزت واحترام سے دیکھتا ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ جب غالب اپنے آپ کو حقیر اور ناچیز کہتا ہے تو اس کے محبوب کے دل کو چوٹ لگتی ہے۔یہی اس کی در پردہ محبت کی دلیل ہے اور یہ واقعی فخر کا مقام ہے۔

بپایش جان نشاندن شرمسارم کرد، می دانم
کہ داند ارزشی نبود متاع رائگانی را

متاع رائگانی = بے فائدہ شے، ایسا سرمایہ جس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو۔میں اس کے پاؤں پر اپنی جان قربان کرکے شرمندہ ہوا اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ ایک بے فائدہ چیز (یعنی جان عاشق) کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ایسی حقیر شے کو نثار کردینا کون سی بڑی قربانی ہے۔

کنایہ یہ ہے کہ عام طور پر عشق میں جان دے دینا بہت بڑا ایثار سمجھا جاتا ہے۔مرزا غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جانفشانی تو ایک حقیر قربانی ہے۔

غالب کا اردو میں شعر دیکھیے۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

فدایت دیدہ و دل، رسم آرایش مپرس از من
خراب ذوق گل چینی، چہ داند باغبانی را

گل چیں = پھول چننے والا

باغباں = پھولوں کی پاسبانی کرنے والا

گل چینی اور باغبانی دو متضاد عمل ہیں۔گل چین، چمن کو ایک طرح برباد کرتا ہے۔اور باغباں اسے سنوارتا ہے۔

میرا دل اور میری آنکھیں تم پر فدا ہوں۔مجھ سے رسم آرایش کے بارے میں مت پوچھ۔جو شخص گلچینی کے ذوق کا مارا ہوا ہو وہ کیا جانے باغبانی کیا ہوتی ہے۔

''خراب'' کا لفظ فارسی میں رند اور مست کا مفہوم بھی دیتا ہے۔اور بدحالی کا بھی۔اس شعر میں اس لفظ کے دونوں معنوی پہلو پائے جاتے ہیں۔''خراب ذوق گل چینی'' کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ شخص جو گلچینی کے ذوق میں سرشار ہوا اور یہ بھی ہے کہ ذوق گل چینی نے جسے بدحال کردیا ہو۔چنانچہ انہی معنوی پہلوؤں سے شعر میں خوبی پیدا ہوئی ہے۔

چہ خیزد گر ھوس گنج امیدم در دل افشاند
درین کشور روائی نیست نقد شادمانی را

گنج امید میں اضافت تشبیہی ہے یعنی امید جو خزانے کی طرح ہوتی ہے۔امیدوں سے دل کو راحت ہوتی ہے جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔شعر میں گنج امید سے مراد امیدوں کا ہجوم ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ اگر میری خواہشوں اور تمناؤں نے میرے دل میں ہزار ہا۔امیدوں کا خزانہ لا کے ڈال دیا ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے کہ اس دیس میں تو خوشی کے سکے کا کوئی چلن ہی نہیں۔مطلب یہ ہے کہ جہاں خوشی کا وجود ہی نہ ہو یا فضا ہی ناسازگار ہو وہاں امیدوں سے کیا ہوتا ہے۔اسی خیال کو مرزا غالب نے ایک اردو کے شعر میں یوں ادا کیا ہے۔

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

نشاط لذت آزار را نازم کہ در مستی
ہلاک فتنہ دارد ذوق مرگ نا گھانی را

مرگ ناگہانی۔یعنی اچانک موت میں بھی ایک مزہ ہوتا ہے کہ اس سے دکھ سہ سہ کر مرنے سے نجات مل جاتی ہے۔لیکن محبوب کے ستم اٹھانے میں لذت ہوتی ہے اور اس سے جو خوشی نصیب ہوتی ہے وہ مرگ ناگہاں میں کہاں۔چنانچہ غالب کہتا ہے کہ میں تیرے آزار کی لذت اور خوشی پر ناز کرتا ہوں کہ جب یہ لذت اپنی پوری کیفیت پر آتی ہے تو مرگ ناگہانی کا ذوق ماند پڑ جاتا ہے۔

اسے یوں ادا کیا کہ مرگ ناگہانی کی لذت، محبوب کی آزار رسانیوں کے فتنے پر قربان ہوجاتی ہے۔

مپرس از عیش نومیدی کہ دندان در دل افشردن
اساس محکمی با شد، بھیشت جاودانی را

دندان در دل افشردن = دانتوں کو دل میں چبھونا یعنی انتہائی رنج و الم۔ناامیدی کے

عیش و نشاط کا الم نہ پوچھ غم میں دانتوں کو دل میں چبھو لینا ایسا ہے جیسے بہشت جاودانی کی بنیاد کو مضبوط کرنا۔

ناامیدی میں جو راحت اور فراغت حاصل ہوتی ہے وہ گویا بہشت جاودانی کی راحت ہے۔

سراسر غمزہ ھایت لاجوردی بود و من عمری
بہ معشوقی پرستیدم بلائی آسمانی را

لاجوردی = نیلگوں

چونکہ چرخ لاجوردی کی گردش کے ساتھ ہر طرح کی آفتوں کو منسوب کیا جاتا ہے۔اور ان کا انداز ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے، اس لیے شاعر نے معشوق کے ناز و انداز کو لاجوردی کہا۔کہتا ہے کہ تیرے ناز و انداز سرتاپا آفت تھے۔اسی لیے میں عمر بھر آسمان سے ہر نازل ہونے والی بلا کو اس طرح پوجتا رہا جیسے کوئی معشوق ہو۔

بجز سوزندہ اخگر گل نہ گنجد در گیریبانم
بد آموز عتابم، برنتابم مھربانی را

میرے گریباں میں، سوائے جلانے والی چنگاری کے کوئی پھول نہیں سماتا۔میری عادتوں کو معشوق کے عتاب نے بگاڑا ہے۔میں انداز مہربانی کی تاب ہی نہیں لاسکتا۔

دلم معبود زر دشتست، غالب فاش می گویم
بہ خس یعنی قلم، من دادہ ام آذر فشانی را

زروشت یا زرتشت = پارسیوں یا آتش پرستوں کے پیغمبر کا نام ہے۔ آذر آگ ہے۔ آذرفشانی = آگ برسانا یا چھڑکنا۔

خس تنکے کو کہتے ہیں جو آگ میں فی الفور جل جاتا ہے۔ مرزا غالب نے اپنے قلم کو خس کہا ہے گویا وہ بآسانی بھڑک اٹھتی ہے۔ غالب! میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میرا دل زردشت کا معبود ہے یعنی آگ ہے اور میں نے خس یعنی قلم کو آگ برسانے کا کام سپرد کیا ہے۔ یعنی میرے قلم سے شعلے ٹپکتے ہیں۔

❀❀❀

غزل نمبر (۸)

محو کن نقش دوئی از ورق سینۂ ما
ای نگاھت، الف صیقل آئینۂ ما

الف صیقل = آئینہ پہلے فولاد کا ہوا کرتا تھا۔ برسات میں عام طور پر زنگ آلود ہو جاتا اور اسے صیقل کرنا پڑتا جس آلے سے اسے صیقل کرتے تھے۔ یہ ایک چھوٹی سی سلاخ ہوتی تھی۔ جس کا ایک سرا نوکدار اور تیز ہوتا تھا۔ جب مصقل سے آئینے کو صاف کرنے لگتے تو مصقل کی تیز نوک سے جو لکیر آئینے پر پڑتی اسے الف صیقل کہتے تھے۔ الف جو پہلا حرف ہے وحدت کی علامت ہے۔ صیقل کی لکیر کو شکل کے اعتبار سے اور ابتدائے صیقل کے اعتبار سے الف صیقل کہنا بہت موزوں ہے۔

نگاہ بھی لکیر کی طرح ہوتی ہے۔ اسی لیے شاعر نے کہا ہے: اے کہ تیری نگاہ ہمارے آئینے (یعنی آئینۂ دل) کا الف صیقل ہے، ہمارے سینے سے دوئی کے نقش کو مٹا دے۔

یعنی محبوب کی نگاہ دل کا تزکیہ کر کے اس میں توحید کا نقش جماتی ہے اور اگر کوئی غیر نقش وہاں ہوں تو انھیں یکسر مٹا دیتی ہے۔

وقف تاراج غم تست چہ پیدا چہ نھان
ھمچو رنگ ازرخ ما رفت دل از سینۂ ما

جو کچھ ظاہر ہے اور جو کچھ پنہاں ہے سب تیرے غم کے ہاتھوں لٹے جا رہے ہیں۔ جس طرح ہمارے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے۔ اسی طرح ہمارے سینے سے ہمارا دل غائب ہو گیا ہے۔

چہرے کے رنگ کا اڑنا ظاہر بات ہے اور دل کا سینے سے غائب ہو جانا پوشیدہ بات ہے۔ مرزا غالب نے اس تضاد سے شعر میں حسن پیدا کیا ہے جو اس کے ندرت بیان کی دلیل ہے۔

چہ تماشاست ز خود رفتہ خویشت بودن
صورت ما شدہ عکس تو در آئینۂ ما

اپنے آپ سے کھو جانا بھی عجب شے ہے۔ ترا عکس ہمارے آئینے میں آ کر ہماری صورت اختیار کر گیا ہے۔ یعنی ہم نے اپنے آپ کو کھو کر تجھے پا لیا ہے۔

عرصہ بر الفت اغیار چہ تنگ آمدہ است
خوش فرو رفتہ بہ طبع تو خوشا کینۂ ما

تیری طبیعت میں ہمارا کینہ اس قدر سمایا ہوا ہے۔ کہ اب اس میں غیروں کی محبت کے لئے جگہ تنگ ہو گئی ہے۔

اس شعر میں ''چہ'' اور ''خوش'' کے الفاظ بڑے خوب صورت معنوی پہلو لیے ہوئے ہیں۔
عرصہ چہ تنگ آمدہ است کا مفہوم ہے جگہ کس قدر تنگ ہو گئی ہے اس جملے میں ''چہ'' سے تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔ ''خوش فرو رفتہ'' یعنی کیا خوب سما گیا ہے۔ یہاں ''خوش'' تحسین کے لئے آیا ہے۔

محتشم زادۂ اطراف بساط عدمیم
گوھر از بیضۂ عنقاست بہ گنجینۂ ما

عنقا ایک فرضی پرندہ ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ اسی لیے شاعر نے اسے عدم سے منسوب کیا ہے بیضۂ عنقا اور گوہر میں وجہ شبہ ظاہر ہے۔
محتشم زادہ = صاحب عزت لوگ۔

ہم سرزمین عدم کے عالی خاندان اور ذی اقتدار باسیوں میں سے ہیں۔ بیضۂ عنقا ہمارے خزانے کا موتی ہے۔ شاعر نے انسان کے وجود کی فنا آمادگی کو کس خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

نیست مستانِ ترا تفرقۂ بدر و ھلال
بادہ مہتاب بود درشب آدینہ ما

ہلال۔ پہلے دن کا چاند اور بدر ماہ کامل ہے۔
ساغر شراب = ماہ کامل کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن اس میں چاند کی طرح کوئی تبدیلی نہیں

ہوتی، ہمیشہ لبریز رہتا ہے اور بدر کی طرح چمکتا ہے شب آدینہ جمعہ سے پہلی رات ہے چونکہ جمعہ کے دن چھٹی ہوتی تھی اس لیے لوگ بڑی فراغت سے بیٹھتے تھے اور رات رنگ رلیوں میں گزارتے تھے۔

تیرے مستوں کے لئے ہلال و بدر کا کوئی تفرقہ نہیں کہ آج بدر ہے تو کل ہلال نہ ہو جائے۔ ان کا چاند تو ساغر شراب ہے جو ہمیشہ بدر ہی رہتا ہے اور خاص کر جمعہ کی شب کو پورے جمال و جلال کے ساتھ چمکتا ہے۔

غالب اِمشب ھمہ از دیدہ چکیدن دارد
خون دل بود مگر بادۂ دوشینۂ ما

بادۂ دوشینہ یا بادۂ دوشین، وہ شراب جو گذشتہ رات پی گئی ہو۔ اے غالب شاید ہماری بادۂ دوشینہ، ہمارا اپنا خون دل تھا کہ آج وہی آنسو بن کر آنکھوں سے سارے کے سارا بہتا چلا جا رہا ہے۔

یعنی خوشی کی رات کے چند لمحے پھر غم کی نذر ہو گئے اور شراب، خون کے آنسوؤں میں تبدیل ہو گئی۔

غزل نمبر(۹)

سوزِ عشق تو پس از مرگ، عیان است مرا

رشتۂ شمعِ مزار از رگِ جان است مرا

رشتۂ شمع، وہ دھاگا یا ڈوری جو موم بتی کے درمیان میں ہوتی ہے۔ اور جس سے وہ جلتی ہے تیرے عشق کی گرمی مرنے کے بعد بھی بدستور قائم ہے۔ اور اس کا ہونا ظاہر ہے۔ دیکھ لو میرے مزار پر جو شمع ہے اس کا دھاگا میری رگِ جان ہے اور وہ اسی کے زور پہ چل رہی ہے۔

یعنی یہ شمعِ مزار میرے ہی سوزِ عشق سے فروزاں ہے۔

می نگنجم ز طرب درشکن خلوت خویش

حلقۂ بزم کہ چشم نگران است مرا

حلقۂ بزم = پرانے زمانے میں لوگ محفل میں حلقۂ باندھ کر بیٹھتے تھے، وہی حلقۂ بزم ہے۔ شاعر نے اسی دائرے کی مناسبت سے اسے چشمِ نگراں سے تشبیہ دی ہے۔

یہ کسی کا حلقہ بزم میری چشمِ نگراں بنا ہوا ہے کہ میں اپنی خلوت گاہ کے گوشے میں بیٹھا خوشی سے پھولا نہیں سما رہا۔ یعنی محبوب کی محفلِ طرب کے تصور سے مجھ پر انبساط کی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔

ھر خراشی کہ ز رشک تنم آفتد بر دل

در سپاس دم تیغ تو زبان است مرا

تیری تلوار کا وار میرے تن پر پڑتا ہے۔ (اور دل اس لذت سے بظاہر محروم رہتا ہے)۔ لیکن رشک سے دل پر بھی چرکے لگتے ہیں اور دل ان رشک کے چرکوں یا زخموں کا بھی

ممنون ہے ہر زخم جو دل پر یوں رشک کی وجہ سے لگتا ہے گویا ایک زبان ہے جو تیری تلوار کی دھار کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔

دل خود از تست وھم از ذوق خریداری تست

این ھمہ بحث کہ در سود و زیان است مرا

دل تیرا ہی ہے اور یہ جو میں اس دل کے بارے میں سود و زیاں کی بحث کرتا ہوں یہ بھی اس لذت کی وجہ سے ہے، جو تیری خریداری میں بحث کرنے سے مجھے حاصل ہوتی ہے۔

جوئی از بادہ و جوئی ز عسل دارد خلد

لب لعلِ تو ھم این است وھم آن است مرا

جنت میں ایک شراب کی نہر ہے اور ایک شہد کی۔ ہمارے لیے تیرے سرخ لب ہی شراب کی نہر اور شہد کی نہر ہیں۔

چون پری زاد کہ در شیشہ فرودش آرند

روئی خوبت بہ دل از دیدہ نہان است مرا

اس پری زاد کی طرح جسے شیشے میں اتارا جاتا ہے، تیرا حسین چہرہ میرے دل میں سمایا ہوا ہے اگرچہ آنکھوں سے نہاں ہے۔

بہ تگ و تاز من افزود گسستن یک دست

در رھست رشتۂ امید عنان است مرا

لگام ٹوٹ جائے تو گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگتا ہے۔ مرزا غالب نے رشتۂ امید کو لگام

سے تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں: رشتۂ امید میرے لیے عناں ہے کہ اس کے یکسر ٹوٹ جانے سے میری دوڑ دھوپ میں اضافہ ہوگیا۔ یعنی ناامیدی سے میری جدوجہد میں فرق نہیں آیا بلکہ امید کا رشتہ ٹوٹنے سے محبت کی راہ میں میری رفتار اور بھی بڑھ گئی ہے گویا

جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

بی خودی کردہ سبک دوش فراغتی دارم
کوہ اندوہ رگ خواب گران است مرا

بے خودی نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا اب مجھے پوری فراغت حاصل ہے اب تو غم کا پہاڑ میرے لیے بھاری نیند بن گیا ہے۔ یعنی طبیعت کو غموں سے نجات مل گئی ہے۔

خارھا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت
منتی برقدم راھروان است مرا

میری تیز رفتاری کے اثر سے راہ کے کانٹے جل گئے ہیں۔ آنے والے رہبروؤں کے قدموں پر میرا بہت بڑا احسان ہے۔ یعنی میں نے آئندہ آنے والوں کی رہنمائی کی ہے۔

رھرو تفتہ در رفتہ بہ آبم غالبؔ
توشہ بر لب جو ماندہ نشان است مرا

میں ایک جلا ہوا پیاسا مسافر ہوں جو پیاس کی شدت کی تاب نہ لا کر پانی میں ڈوب گیا ہو۔ میری زادِراہ (توشۂ راہ) جو کنارے پہ ہی رہ گئی ہے وہی میرے وجود کا پتہ دیتی ہے۔ کہ کبھی میں تھا۔

❀❀❀

غزل نمبر(۱۰)

آشنایانہ کشد خار رھت دامن ما
گوئی این بود ازین پیش بہ پیراھن ما

تیری راہ کا کانٹا، ہمارے دامن کو آشنا کی طرح کھینچتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کبھی ہمارے پیراہن میں تھا۔ مقصود یہ ہے کہ راہ عشق میں خلش خار ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ ایسے تلخ تجربات ہماری فطرت کا جز بن چکے ہیں۔

بی تو، چون بادہ کہ در شیشہ ھم از شیشہ جداست
نبود آمیزش جان در تن ما با تن ما

جس طرح شراب صراحی میں رہ کر بھی، صراحی سے جدا رہتی ہے اسی طرح تیرے فراق میں، ہماری روح ہمارے جسم میں ہے لیکن ایسے جیسے اس کا جسم سے کوئی علاقہ نہیں۔ فراق کے انتہائی درد و کرب کی حالت کو یوں بیان کیا ہے گویا انسان میں جان ہی ہے۔

سایہ و چشمہ بہ صحرا دم عیشی دارد
اگر اندیشۂ منزل نشود رھزنِ ما

بیابان میں سائے اور چشمے کا وجود، عیش و نشاط کی کیفیت پیدا کرتا ہے بشرطیکہ وہاں منزل کا خیال انسان کا رہزن نہ بن جائے۔ مرزا غالب نے ایک اور شعر میں اسی طرح کے خیال

کو یوں ادا کیا:

اگر بہ دل نہ خلد ہر چہ از نظر گذرد
خوشا روانی عمری کہ در سفر گزرد

وہ زندگی جو سفر میں گزرتی ہے۔ بہت خوب ہوتی ہے اگر نظر سے گزرنے والی چیزیں دل ہی میں کھب کے نہ رہ جائیں۔

تا رود شکوۂ تیغ ستم آسان از دل
بخیہ بر زخم پریشان فتد ازسوزن ما

عاشق ،معشوق کی تیغ ستم کے زخم سلواتا ہے لیکن جب سوئی سے ان زخموں کو بخیہ کیا جاتا ہے تو وہ بخیہ بکھرا بکھرا ہوتا ہے۔ وہ اس لیے کے تیغ ستم کے زخم سہنے سے جو شکایت عاشق کے دل میں پیدا ہوئی ہے وہ بآسانی ان نیم سلے اور نیم کشادہ زخموں سے نکل جائے۔

مقصود شاعر یہ ہے کہ عاشق کو معشوق کے ستم کا شکوہ نہیں ہوتا اور اگر وہ شکوہ کرتا بھی ہے تو محض اوپری دل سے کرتا ہے۔

دوست با کینہ ما مہر نھان می ورزد
خود زرشک است اگر دل برد از دشمن ما

اگر ہمارا محبوب ہم سے (بظاہر) کینہ رکھتا ہے تو اس کے اس کینے میں ایک پوشیدہ محبت بھی ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ جو رقیب سے دل چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ہم سے عداوت کی جہ سے نہیں کر رہا بلکہ اسے اس بات کا رشک ہے کہ میرے حسن کا گردیدہ ایک ہی کیوں ہو اور بھی کیوں نہ ہوں۔

می پرد مور مگر جان بہ سلامت ببرد
تا چہ برق است کہ شد نا مزد خرمنِ ما

بجلی گرتی ہے تو غلے کی ڈھیروں (خرمن) کو جلا دیتی ہے۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ یہ برق کیا ہے جسے ہمارا خرمن جلانے پر مامور کیا گیا ہے۔ یہ دراصل چیونٹی ہے جسے پر لگ گئے ہیں اور وہ اڑ رہی ہے کہ پرواز کر کے اور جان بچا کے کسی طرف نکل جائے۔

مرزا غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ برق ہمارے خرمن کو کیا جلائے گی وہ تو خود اپنا آپ بچائے پھرتی ہے۔

دعوی عشق زما کیست کہ باور نہ کند
می جھد خونِ دلِ ما ز رگِ گردنِ ما

کون ہے جو ہمارے دعوے عشق کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہمارے دل کا خون تو ہماری گردن کی رگوں سے اچھل اچھل کے باہر آرہا ہے۔ یعنی ہم تو سرتا پا تسلیم و رضا ہیں اور عشق کی راہ میں اپنے خون کا ہر قطرہ بہا دینے کے لیے آمادہ ہیں ہمارے دعوائے عشق کو کون جھٹلا سکتا ہے؟

سخنِ ما ز لطافت نپذیرد تحریر
نہ شود گرد نمایان ز رم توسن ما

توسن = گھوڑا   رم توسن = گھوڑے کی دوڑ یا تیز رفتاری

ہماری باتیں اتنی لطیف ہیں کہ تحریر کی صورت میں نہیں آسکتیں۔ ہمارے افکار کا گھوڑا جب دوڑتا ہے تو اس سے کوئی گرد و غبار نہیں اٹھتا۔

مرزا غالب اپنے شعر میں ایسے افکار لطیف کی بات کر رہے ہیں جو کسی طرح سے اظہار

بیان میں نہیں سما سکتے۔

طوطیان را نبود ھرزہ جگر گون منقار
خوردہ خونِ جگر از رشکِ سخن گفتنِ ما

جگرگون = سرخ

طوطیوں کی چونچ یونہی سرخ نہیں ہوتی۔وہ ہماری شیرین بیانی کے رشک سے اپنا خون جگر پیتے ہیں اسی لیے چونچیں خون آلود ہیں یعنی سرخ ہیں۔

ما نبودیم بدین مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہش آن کرد کہ گردد فنِ ما

غالب ہم تو اس (بلند) منصب کے لئے آمادہ نہیں تھے،شاعری نے خود خواہش کی کہ ہمارا فن بن جائے۔

فن کی عظمت فنکار کی عظمت سے ہوتی ہے۔غالب نے فن شعر کو عظمت دی ہے اور اس کا یہ کہنا کہ ہم کو تو شاعر ہونا گوارا نہیں تھا۔فن نے خود اپنے آپ کو ہم سے منسوب کرنا چاہا تو نہ کوئی تعلّی نہیں بلکہ عین حقیقت ہے۔

❀❀❀
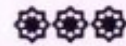
غزل نمبر(۱۱)

نقشی ز خود براہ گذر بستہ ایم ما
بر دوست راہ ذوق نظر بستہ ایم ما

نقش بستن = نقش بنانا

راہ بر کسی بستن = کسی کا راستہ روک لینا یا بند کر دینا۔ہم نے (ہر) رہگذر پر اپنا نقش چھوڑا ہے اور اپنے دوست کے لیے ذوق نظر کی راہ بند کر دی ہے۔

یعنی ہم جدھر سے بھی گزرتے ہیں وہاں اپنی یاد کا کوئی نہ کوئی نقش چھوڑا ہے۔اب ہمارا محبوب جس شے پہ بھی نظر ڈالے گا وہاں ایسے نقش ہوں گے جن سے اسے ایک تلخ احساس ہوگا کیونکہ اس میں ان کی بے وفائیوں کی داستان بھی ہوگی اور وہ یقیناً ذوق نظر سے محروم رہے گا۔

با بندۂ خود این ہمہ سختی نمی کنند
خود را بزور بر تو مگر بستہ ایم ما

اپنے بندے کے ساتھ اتنی سختی نہیں کی جاتی۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم نے اپنے آپ کو زبردستی تم سے وابستہ کیا ہوا ہے۔اور اسی لیے مورد عتاب ہیں۔

اس شعر کے کو بندہ و مولا یعنی انسان اور خدا کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔

غالبؔ کے یہ شعر سامنے رکھیے اور پھر دیکھیے کہ اس شعر کا اور ہی لطف ہوگا۔

زندگی اپنی جو اس رنگ میں گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

دل مشکن و دماغ و دل خود نگاهدار
کاین خود طلسم دود و شرر بستہ ایم ما

دود و شرر = دھواں اور چنگاریاں

مرزا غالب نے اپنے دل کو دود و شرر کا طلسم کہا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمارے دل کو دل نہ سمجھ۔ یہ دھوئیں اور آگ کا طلسم ہے اسے توڑے گا تو اس میں دھواں اٹھے گا اور تیرے دماغ کو پریشان کرے گا اور چنگاریاں ابھریں گی۔ تو تیرے دل کو جلائیں گی۔ اس لیے اپنے دماغ اور دل کو بچا لے اور ہمارے دل کو نہ توڑ۔

بر روی حاسدان در دوزخ کشوده رشک
از بهر خویش جنت در بستہ ایم ما

"جنت در بستہ = وہ جنت جس کے دروازے بند ہوں اور وہاں کسی کا گذر نہ ہو۔

ہم اپنی ذات میں ایک جنت ہیں، ایسی جنت کہ جس کے دروازے بند ہیں اور کوئی غیر وہاں نہیں آ سکتا۔ ہماری اس حالت کو دیکھ کر حاسد لوگ رشک سے جل رہے ہیں۔ ان کی یہ کیفیت ہے جیسے دوزخ کا دروازہ ان کی طرف کھلا ہوا ہو۔

دوزخ اور جنت، کشادہ اور بستہ، یہ الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہیں جس سے اس شعر

میں صنعت تضاد آ گئی ہے اور وہ لطف دے رہی ہے۔

فرمان درد تا چه روائی گرفته است
صد جا چو نَی به ناله کمر بستہ ایم ما

تیرا فرمان درد ہر جگہ پہنچا ہوا ہے اور ہر جگہ اس کا چرچا ہے۔ چنانچہ ہم جہاں بھی جاتے ہیں نَی کی طرح فریاد پر کمر باندھ لیتے ہیں۔

"صد جا" لفظی معنی سو جگہ مقصود کثرت جا ہے۔

سوز ترا روان همه در خویشتن گرفت
از داغ تهمتی به جگر بستہ ایم ما

عشق کا اثر صرف اتنا نہیں ہوتا کہ جگر پر کوئی داغ یا دل پر کوئی زخم لگ جائے۔ عشق انسان کے رگ و ریشے اور روح میں سرایت کر جاتا ہے۔ چنانچہ مرزا غالب کہتے ہیں:

تیرے سوز عشق کو ہماری روح نے یکسر سمو لیا ہے۔ ہم نے جگر پر داغ عشق کے ہونے کی تہمت لگائی ہے۔

گوئی وفا ندارد اثر، هم بما گرای
زین سادگی که دل به اثر بستہ ایم ما

تیرا یہ خیال ہے کہ وفا کا کوئی اثر نہیں ہوتا، چلو یونہی سہی مگر ہماری سادگی دیکھ کہ ہم اثر پر دل جمائے ہوئے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ وفا کا اثر ہوتا ہے۔ ہماری اس سادگی ہی کی خاطر ہماری طرف مائل ہو جا۔

شعر میں نکتہ یہ ہے کہ محبوب مائل ہوگا تو یہ سمجھ لیجئے کہ وفا کا اثر ہو کے رہا۔

تا در وداعِ خویش چہ خون در جگر کنیم
از کوئی دوست رختِ سفر بستہ ایم ما

خون در جگر کردن = انتہائی قلق کی حالت۔

رخت سفر بستن = سفر کی تیاری کرنا۔ رخصت ہونا۔

کوچہ یار سے رخصت ہونا کم غم انگیز نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے آپ سے رخصت ہو رہا ہو۔ یہ انتہائی درد و رنج و قلق کی بات ہے۔ ایک طرح سے عالم نزع ہے۔

ھر جاست نالہ ھمت ما حق گذارِ اُوست
حرزی بہ بالِ مرغ سحر بستہ ایم ما

حرز = تعویز، جو بالعموم نظر بد سے بچنے کے لیے باندھا جاتا ہے۔

مرزا غالب کہتے ہیں، جہاں کہیں بھی کوئی فریاد کرنے والا ہے۔ ہماری ہمت اس کی حق گزار ہے۔ یعنی ہماری فریاد کرنے کی ہمت، اس کی ہمت فریاد کی داد دیتی ہے۔ مرغ سحر، صبح کو اٹھ کر فریاد کرتا ہے چنانچہ ہم نے اس کے پروں میں تعویز باندھ دیا ہے کہ اسے نظر بد نہ لگے اور وہ یونہی فریاد کرتا رہے۔

یہی حق گزاری کی دلیل ہے۔

ازخوانِ نطقِ غالبِ شرین سخن بود
کاین مایہ زلّہ ھائی شکر بستہ ایم ما

این مایہ = اتنے

زلہ = وہ کھانے کی چیزیں، خصوصاً مٹھائی وغیرہ، جو لوگ رسماً دعوتوں سے اٹھا لیتے ہیں اور گھر لے جاتے ہیں۔ اسی سے، "زلہ براور" کا لفظ بنا ہے یعنی زلہ سمیٹنے والا۔

زلہ کے ساتھ بستن کا مصدر آتا ہے۔ تو اس کا مفہوم زلہ سمیٹنے والا ہوتا ہے مرزا غالب کہتے ہیں کہ ہم نے جو شیرینیوں کے اتنے ڈھیر سمیٹ لیے ہیں یہ غالب شیریں سخن کی شیریں بیانی کے دسترخوان سے لیے ہیں۔

غالب کے کلام میں شیرینی کی فراوانی کو دکھانا مقصود ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۱۲)

در گردِ غُربت آئنہ دارِ خودیم ما
یعنی ز بی کسانِ دیارِ خودیم ما

پرانے زمانے میں متمول گھرانے کی عورتیں جب اپنی آرائش کرتی تھیں تو ایک ملازم عورت بال سنوارتی اور غازہ وغیرہ ملتی: وہ مشاطہ کہلاتی۔ ایک اور عورت سامنے آئینہ لے کر بیٹھتی وہ آئینہ دار کہلاتی۔ پھر مجازاً آئینہ دار کے معنی عکس ہو گئے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ شاعر کا کلام اس کی زندگی کا "آئینہ دار" ہوتا ہے، یعنی اس میں اس کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔

گرد غربت = دشت غربت میں جو گرد غبار اٹھتا ہے مجازاً مسافری میں بے کسی کی حالت اور اُس کی کوفتیں۔

مرزا غالب اپنی بے کسی کی حالت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ مسافری یا گرد غربت میں

بھی ہمیں اپنی ہی حالت کا عکس نظر آتا ہے، ہم اپنے وطن کے بیکسوں میں سے ہیں۔ وطن میں بھی بے کس تھے اور غربت میں آکر بھی ہمیں اپنی بے کسی کی صورت دکھائی دی۔

مرزا غالب کا یہ اردو شعر بھی اسی حالت کی آئینہ داری کرتا ہے۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

دیگر ز سازِ بیخودیِ ما صدا مجوی
آوازی از گسستنِ تارِ خودیم ما

اب ہمارے سازِ بیخودی سے کسی قسم کی صدا ابھرنے کی توقع نہ کر۔ ہم اپنے ساز (ہستی) ہی کے تار ٹوٹنے کی آواز ہیں۔

ہم بے خودی کے عالم میں ہیں اور اپنے آپ کو بھول چکے ہیں اب۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ایک آواز ہے جو آتی ہے اور وہ ساز کے ٹوٹنے یعنی بیخودی کے طاری ہونے کی آواز تھی۔ اب تو بے خودی کا سناٹا ہے۔

ہم ہیں اپنی شکست کی آواز

از بسکہ خاطرِ ہوسِ گل عزیز بود
خوں گشتہ ایم و باغ و بہار خودیم ما

ہماری طبیعت کو پھولوں کی شدید خواہش تھی۔ اسی خواہش کی خاطر ہم خود خون ہو گئے اور اپنے ہی باغ و بہار بن گئے۔

یعنی پھول میسر نہ آئے اور آرزوئے گل خون ہو گئی اور اب حسرتوں کے پھول سجائے بیٹھے ہیں۔

ما جملہ وقفِ خویش و دلِ ما ز ما پُرست
گوئی ہجوم، حسرتِ کارِ خودیم ما

ہم سرتاپا اپنے لیے وقف ہو چکے ہیں۔ ہمارا دل ہم سے ہی پُر ہے۔ زندگی میں کام کرنے کی بڑی آرزوئیں تھیں۔ کوئی آرزو پوری نہ ہوئی۔ البتہ کاموں کے کرنے کی حسرتیں رہ گئیں۔ اور اب ان حسرتوں کا ہجوم ہے اور ہم ان حسرتوں میں کھوئے بیٹھے ہیں۔

از جوشِ قطرہ ہمچو سرشک آب گشتہ ایم
اما ہمہ بہ جیب کنار خودایم ما

جوشِ قطرہ = دریا کے تموج سے قطرہ ابھرتا ہے اور ایک انفرادی وجود حاصل کرتا ہے۔ اور پھر دریا سے جا ملتا ہے۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔

جیب و کنار سے مراد یہاں گریباں اور دامن ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں تو گریباں اور دامن میں گرتے ہیں۔

مرزا غالب کہتے ہیں کہ ہم بھی جوشِ قطرہ لے کر ابھرے اور ایک آنسو کی طرح ابھرے اور پانی بن گئے لیکن اپنے ہی گریباں اور دامن میں گر پڑے۔

مراد یہ ہے کہ قطرہ جوش میں آتا ہے اور سمندر تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اور مقصدِ حیات کو پالیتا ہے۔ لیکن ہمارا وجود ایک آنسوں کی طرح، ابھرنا تو در کنار، ندامت کے باعث پانی پانی ہو گیا ہے۔ اور اپنے ہی گریباں و دامن سے لپٹ کے رہ گیا ہے۔

مشت غبارِ ماست پراگندہ سوٗ بسوٗ

یا رب بدھر درچہ شمار خو دیم ما

ہمارا وجود ایک مشت غبار ہے جو ہر طرف بکھرا ہوا ہے آخر اے خدا ہمارا وجود کس شمار میں ہے یعنی ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے۔

با چون توئی معاملہ بر خویش منت است

از شکوۂ تو شکر گزارِ خودیم ما

تیرے جیسے کے ساتھ وابستہ ہونا گویا اپنے آپ پر احسان کرنا ہے۔ یہ جو محبت میں ہم تجھ سے گلے شکوے کرتے ہیں۔ درحقیقت ہم اپنا شکر ادا کر رہے ہیں۔ تو مہربان ہو یا نا مہربان، تجھ سے منسوب ہونا ہی بہت بڑی بات ہے۔ دراصل اس شعر کا خطاب خالق ازلی سے ہے اور یہ رنگ غزل کے تقریباً باقی تمام شعروں میں پایا جاتا ہے۔

روی سیاہ خویش ز خود ھم نھفتہ ایم

شمعِ خموشِ کلبۂ تارِ خودیم ما

شمع خموش = بجھی ہوئی شمع

کلبۂ تار = اندھیرا گھر

شعر کا سادہ اردو ترجمہ یہ ہے:

ہم نے اپنا سیاہ چہرہ اپنے آپ سے بھی چھپا رکھا ہے۔ ہم اپنے اندھیرے گھر کی بجھی ہوئی شمع ہیں۔

تاریک گھر میں ایک بجھی ہوئی شمع کو دیکھ کر یوں احساس ہوتا ہے کہ گویا شمع اپنا چہرہ

چھپائے بیٹھی ہے اور اس طرح چھپ کر بیٹھنے کی وجہ یہ ندامت ہے کہ وہ گھر کو روشن نہ کر سکی۔ مرزا غالب نے اس شعر میں ایک ایسے انسان کی تصویر کھینچی ہے جو اپنے مقصد حیات کی تکمیل میں نا کام رہا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے شمع خاموش کا استعارہ، محاکاتی رنگ میں بڑی فنی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے جو ان کی ندرت بیان کی دلیل ہے۔

درکار ماست نالہ و ما در ھوای اُو

پروانۂ چراغِ مزارِ خودیم ما

ہمیں نالہ و فریاد کی ضرورت ہے اور حالت یہ ہے کہ ہم اس کی محبت کی دھن میں اپنے چراغ مزار کا پروانہ بن گئے ہیں۔

ایک چراغ محفل میں جلتا ہے اور محفل کی رونق کا باعث ہوتا ہے اور ایک دیا مزار پہ جلتا ہے اور ایک حسرت ناک منظر پیش کرتا ہے۔ اسی طرح ایک پروانہ چراغ محفل پہ گر کر جان دیتا ہے اور ایک چراغ مزار پر جلتا ہے ذرا اس دوسرے پروانے کو دیکھیے کہ اس کے جلنے کی حالت کتنی حسرت ناک ہے کہ اس کا دیکھنے والا بھی کوئی نہیں خاموشی ہی سے جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

مرزا غالب نے اپنے آپ کو ایسے ہی پروانے سے تشبیہ دے کر اپنی حالت کو بیان کیا ہے کہ محبت میں جل گئے۔ لیکن چراغ مزار کے پروانے کی طرح جل گئے۔

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا

آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

خاکِ وجودِ ماست بہ خونِ جگر خمیر

رنگینیِ قماشِ غبارِ خودیم ما

قماش = لباس، اور گھر کے ساز و سامان کو بھی کہتے ہیں۔

قماش غبار=لباس خاکی

ہمارا وجود خاکی ہے اور اس میں ہمارے خونِ جگر کی آمیزش ہے، (اور خونِ جگر سے) ہم نے اپنے لباسِ خاکی کو رنگینی عطا کی ہے۔ یعنی ہم نے اپنے خونِ جگر سے اپنی زندگی کو سنوارا ہے۔

هر کس خبر ز حوصلهٔ خویش می دهد
بدمستیِ حریف و خمارِ خودیم ما

بدمستی=نشہ

خمار=نشے کے اترنے یا نشے کے پورا نہ ہونے کی حالت مستی اور خمار دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

حریف، ہم پیشہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہم پیشہ لوگ ایک دوسرے کے دوست بھی ہوتے ہیں اور مقابل بھی۔ اس لیے حریف کا لفظ دونوں مفہوم دیتا ہے۔ اس شعر میں حریف مقابل، یا رقیب کے لیے آیا ہے۔

ہر شخص سے اس کے ظرف کا پتا چل جاتا ہے۔ ہم اپنے رقیب کے لیے بدمستی کا سامان ہیں اور اپنے لیے خمار کا۔ یعنی رقیب کم ظرف ہے۔ محبوب کی ادنیٰ توجہ اسے مدہوش کر دیتی ہے۔ ہم ہیں کہ اس کی ہزاروں نوازشوں سے بھی جی نہیں بھرتا۔ ہمیشہ خمار کی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔
غالب ہی کا شعر ہے۔

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

بیدل کہتے ہیں

همه عمر با تو قدح زدیم و نه رفت رنج خمار ما
چه قیامتی که نمی رسی ز کنار ما بکنار ما

تارِ نگاه پیروِ ما سلکِ گوهر است
رفتارِ پایِ آبله دارِ خودیم ما

شاعر نے آبلوں کو گوہر سے تشبیہ دی ہے۔

ہمارے پیرو یعنی ہمارے پیچھے آنے والوں کی نظریں، موتیوں، کی لڑیاں بن گئی ہیں۔

ہم اپنے آبلہ دار پاؤں کی رفتار ہیں۔

عاشق راہ وفا میں تیز تیز چلا جا رہا ہے۔ اور اس تیز رفتاری سے اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ لیکن اس کی رفتار میں فرق نہیں آیا۔ اس کے پیچھے آنے والوں کی نظریں اس کے پاؤں کے آبلوں پر مسلسل پڑ رہی ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ آبلے جو موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ ان لوگوں کی نظروں میں پروئے جا رہے ہیں اور ان کی نگاہیں گویا موتیوں کی لڑیاں بن گئی ہیں۔ یعنی عاشق کی تیز رفتاری، پیچھے آنے والوں کو مسحور کر رہی ہے۔ اور وہ اسی دھن میں اس کی پیروی پر مجبور بھی ہیں اور خوش بھی ہیں، کشاں کشاں چلتے جا رہے ہیں۔

غالب چو شخص و عکس در آئینهٔ خیال
با خویشتن یکی و دو چار خودیم ما

اے غالب! یہ دنیا عالمِ خیال ہے۔ اس میں جو کچھ ہمارے روبرو ہے وہ ہم سے الگ نہیں جس طرح آئینہ دیکھنے والا اور اس کا عکس، ہر چند کہ ایک دوسرے کے مقابل نظر آتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت ایک ہی ہوتے ہیں الگ الگ نہیں ہوتے۔

❀❀❀

غزل نمبر(۱۳)

بہ شغل انتظار مهوشان در خلوت شب‌ها

سر تار نظر شد رشتۂ تسبیح کوکب‌ها

لغت:۔ ’’مہوشاں‘‘ = چاند جیسے، مراد معشوق

’’کوکب ہا‘‘۔ ستارے۔

ترجمہ: راتوں کی تنہائیوں میں معشوقوں کے انتظار میں مشغول ہونے سے ہمارا تارِ نظر ستاروں کی تسبیح کا دھاگا بن گیا ہے۔

حل: عشاق کا انتظار کی راتوں کو تارے گن گن کر گزارنا معروف ہے۔ یہاں اسی خیال کو ایک بلیغ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ عاشق کی نظر کا مسلسل ایک ستارے سے اٹھ کر دوسرے ستارے پر پڑنا، ایسا ہے کہ ستارے تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی لڑی میں منسلک ہو رہے ہیں۔ (اس اعتبار سے) مہوشاں کا لفظ یہاں نہایت موزوں ہے۔

بروی برگ گل تا قطرۂ شبنم نہ پنداری

بهار از حسرت فرصت بدندان میگزد لبها

لغت:۔ تا بمعنی زنہار

ترجمہ وحل: پھول کی پتیوں پر جو پانی کے قطرے نظر آ رہے ہیں۔ ہرگز انھیں قطرات

شبنم نہ سمجھنا یہ تو بہار اپنی کم فرصتی سے رنجیدہ ہو کر (کبیدہ خاطر ہو کر) حسرتناک انداز میں، دانتوں سے اپنے لب کاٹ رہی ہے۔

بدنداں لب گزیدن انتہائے رنج وحسرت کی علامت ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ وہ قطرات شبنم، اصل میں بہار کے دانت ہیں جن سے وہ لب کو کاٹ رہی ہے۔ کیونکہ اسے اپنی ناپائداری کا احساس ہے۔ گویا دنیا کا عیش کسی آئندہ غم کا پیش خیمہ ہوتا ہے اس کا فانی ہونا اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس شعر میں صنعت حسن تعلیل ہے۔ (شاعر جب کسی اصل واقعہ کی توجیہ کرتا ہے تو اس کی کوئی حسین سی علت بیان کرتا ہے تو وہ حسن تعلیل ہے۔

بہ خلوت خانۂ کامِ نہنگ لازدم خود آ

ستوہ آور دل از ہنگامۂ غوغای مطلب ہا

لغت:۔ ’’کام نہنگ‘‘ = مگرمچھ کا حلق ’’ستوہ آمدن‘‘ = عاجز آنا۔ تنگ آنا

’’مطلب ہا‘‘ = مجازاً خود غرضیاں ’’لا‘‘ = نہیں۔ فنا

ترجمہ وحل: اہل جہاں کی خود غرضیوں کے شور وغوغا سے دل تنگ آ گیا ہے پس میں نے اپنے آپ کو لا کے کام نہنگ میں ڈال دیا ہے۔ یعنی اپنی آرزوؤں کو خیرباد کہہ دیا ہے اور یہی مقام سکون وعافیت ہے۔ انگلستان کے مشہور ادیب کارلائل کا خیال ہے کہ اپنی خواہشات کو صفر بنادو تو دنیا تمہارے اختیار میں ہوگی۔

کند گر فکرِ تعمیرِ خرابی ہای ما گردون

نیابد خشت مثلِ استخوان بیرون ز قالب ہا

لغت: ’’قالب‘‘ اجسام، تعمیر ہا۔

ترجمہ وحل: اگر آسمان ہماری بربادیوں کی تعمیر کی کوشش کرے تو جس طرح تن سے

ہڈیاں باہر نہیں نکل سکتیں اسی طرح ہماری تعمیروں (اجسام) سے ایک ہڈی بھی باہر نہیں نکل سکتی۔
تعمیر خرابی ہا سے ایک تو مراد ہے بربادیوں کی تلافی کرنا اور دوسرے بربادیوں کی تکمیل کرنا۔
بہر حال شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہماری بربادیاں انتہا کو پہنچ چکی ہیں۔ اس شعر کے ساتھ مرزا غالب کے اس شعر کو بھی ملحوظ رکھیے:

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

خوشا بی رنگی دل، دستگاہِ شوق را نازم
نمی بالد بخویش ایں قطرہ از طوفانِ مشرب ھا

لغت: ''دستگاہ'' سرمایہ۔ ''بے رنگی'' ہر طرح کے خارجی اور مصنوعی رنگ سے عاری ہونا۔ ''شوق'' عشق و محبت ''نمی بالد'' نہ پھولتا۔

ترجمہ و حل: شاعر دل کے لیے قطرہ کا استعارہ لایا ہے۔ تلاش حق یا جستجوئے حقیقت جاری ہے۔ اس تلاش و جستجو کے مختصر مسلک اور مشرب یعنی طریقے ہیں اور اتنے زیادہ ہیں گویا ایک طوفان بپا ہے۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ میرے دل کی بے نیازی دیکھو اس نے اپنے پہ کوئی رنگ چڑھنے نہیں دیا۔ وہ دستگاہ شوق یعنی حق تعالیٰ یا حقیقت کی محبت ہی میں سرسار ہے اور اس عشق و محبت کی دولت پہ نازاں ہے۔ اسی نے اس قطرے، یعنی دل کو بے رنگ رکھا اور اس میں کسی طرح کا مصنوعی غرور و نخوت کا رنگ نہیں آنے دیا۔

ندارد حسن در ہر حال از مشاطگی غفلت
بود تہ بندیِ خط، سبزۂ خط در تہ لب ھا

لغت: ''تہ بندی'' رنگریز لوگ جب کپڑے پر کوئی اور رنگ چڑھاتے ہیں جس سے اصلی رنگ خوب نکھر کے آتا ہے اور پختہ ہوتا ہے تو پہلا رنگ ''تہ بندی'' کہلاتا ہے۔
تہ بندیِ خط کی ترکیب میں خط گویا ''خط و خال'' ہے جو مشاطگی یا آرائش کے وقت سنوارے جاتے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ حسن کسی حالت میں بھی آرائش سے غافل نہیں ہوتا۔ چنانچہ سبزہ خط کے ظاہر ہونے پر بھی آرائش کا پہلو موجود ہے۔ لبوں کے نیچے سبزۂ خط ظاہر ہو چکا ہے لیکن یہ سبزۂ خط، تہ بندی کا کام دے رہا ہے۔ اس سے حسن کے خط و خال خوب نکھرے ہیں۔ گویا حسن ہر حالت میں اپنا جوبن دکھاتا ہے۔

خوشا رندی و جوش زندہ رود و مشرب عذبش
بہ لب خشکی چہ میری در سرابستانِ مذہب ھا

لغت: ۔ زندہ رود اصفہان کے پاس کے ایک دریا کا نام ہے، پھر عام ندی اور دریا کے لیے بھی مستعمل ہے۔
''مشرب عذب'' = رنگین انداز
ش کا مرجع رندی ہے۔

ترجمہ و حل: میخواری اور دریائے موجزن اور رندی کے رنگین طور طریقے کتنے اچھے ہیں۔ تو مذہب کی ان راہوں میں جو سرابوں کی طرح ہیں کیوں پیاسا جان دے رہا ہے۔

تو خوی پنداری و دانی کہ جان بردم نمید انی
کہ آتش در نھادم آب شد از گرمی تب ھا

لغت: خوی کے لفظ میں واو نہیں بولا جاتا۔ یہ لفظ (طے) کے وزن پر ہے۔ پسینہ۔

حل: تو اسے پسینہ خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں آتشِ عشق سے پسینے میں شرابور ہوں، نہیں تو نہیں جانتا یہ پسینہ نہیں) ہے یہ تو (عشق کی) آگ ہے جو میرے جسم کے تب یعنی انتہائی گرمی سے پانی بن گئی ہے

مبادا همچو قار سبحہ از هم بکسلد غالب
نفس یا این ضعیفی بر نتابد شور یا رب ها

لغت: ''نفس'' سانس۔ یہاں وہ سانس مراد ہے جو یارب کہنے کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ''سبحہ'' تسبیح ہے۔

حل: ہمارا سانس اس قدر کمزور ہے کہ شور یارب کو بھی برداشت نہیں کر سکتا، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تسبیح کے دھاگے کی طرح ٹوٹ جائے۔ یہ شعر مرزا غالب کی ندرت بیان کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔ ان کا یہ اردو شعر دیکھیے:

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یہی بات انھوں نے اپنے فارسی شعر میں کہی ہے مگر کس رکھ رکھاؤ سے کہی ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر(۱۴)

پس از عمری کہ فرسودم بمشقِ پارسائی ھا
گدا گفت و بمن تن درنداد از خودنمائی ھا

لغت: تن در بہ کسی یا بہ چیزے دادن۔

کسی شخص یا چیز کی طرف راغب ہونا، اسے قبول کرنا۔ حسن میں خودنمائی کا پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس زہد و پارسائی میں تواضع اور انکسار ہوتا ہے۔

اس بات کو پیشِ نظر رکھ کر شعر کی طرف آیئے۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ جب میں اک عمر پارسائی کی مشق کرتے کرتے فرسودہ حال ہو چکا تو میرے محبوب نے مجھے گدا کہہ کر ٹال دیا۔ اور اپنے حسن کی خودنمائیوں کے باعث مجھے خاطر میں نہ لایا۔ شاعر شعر میں پارسائی ہا یعنی جمع کا صیغہ لایا ہے اور اس کے ساتھ مشق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ گویا یہ پارسائی کے کئی ایک تیور اختیار کیے۔ پھر بھی محبوب کا منظورِ نظر نہ ہو سکا۔

اسی خیال کو اردو کے اس شعر میں دیکھیے:

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

فغاں زاں بوالھوس برکش، پیشہ کش کز من
ربایدحرف و آموزد بدشمن آشنائی ھا

لغت: بوالہوس رقیب کے لیے اور محبت پیشہ، عاشق کے لیے استعمال ہوا ہے۔ معشوق، رقیب کی، جو بوالہوس ہے، حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اور اسے ابھارتا ہے۔ اور عاشق، جو خلوص دل

سے محبت کرنے والا ہے اسے دباتا ہے اور اس کی جان کے درپے ہے۔ چنانچہ وہ عاشق پیار کی باتوں کا انداز چرا لیتا ہے۔ اور دشمن یعنی رقیب کو سکھاتا ہے۔

بتِ مشکل پسند از ابتذال شیوہ می رنجد

بگوئیدش کہ از عمر است آخر بی وفائی ھا

لغت:۔ ''مشکل پسند'' وہ شخص جو ہمیشہ مشکل کام کو پسند کرے۔

''ابتذال شیوہ'' فرسودہ طریق کار۔

میرا محبوب مشکل پسند ہے اور ہر اس بات سے جسے دوسرے کرتے ہوں اور وہ مبتذل اور عام ہو گیا ہو، ناپسند کرتا ہے اور برہم ہوتا ہے۔ اسے یہ تو کہو تو جو عمر بھر سے بے وفائیاں کر رہا ہے۔ یہ بھی تو فرسودہ ہوگئی ہیں۔ اس میں بھی تو کوئی جدت نہیں۔ ان بے وفائیوں کو کیوں نہیں چھوڑ دیتا؟

دوسرے مصرعے میں ''عمر'' کو اگر زندگی کے مفہوم میں لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زندگی بھی تو بے وفائی کرتی ہے محبوب نے بے وفا ہو کر کون سی جدت دکھائی ہے۔

نشد روزی کہ سازم طرہ اجزائی گریبان را

بدستم چاکھا چون شانہ ماند از نا رسائی ھا

وہ دن نصیب نہ ہوا کہ میں اپنے پھٹے ہوئے گریبان کے اجزا کو جمع کر کے انھیں ایک طرح کی صورت دے دیتا۔ گریباں کے یہ چاک میری نارسائیوں کے باعث کنگھی کی طرح میرے ہاتھ ہی پڑے رہ گئے۔

یعنی محبت میں میرا جوشِ جنوں کسی کام نہ آسکا۔

نیرزم التفات دزد و رہزن، نیازم بین

متاعم را بہ غارت دادہ اند از ناروائی ھا

میری بے نیازی دیکھ کہ میں چور اور رہزن کی توجہ کے قابل بھی نہیں ہوں کہ وہ میرا سروسامان کسی کام کا سمجھ کے لوٹتے، انھوں نے تو میری متاع کو ایک بیکار اور فضول چیز جان کر لٹا دیا۔

بروز رستخیز از جنبشِ خاکم بر آشوبی

تو ویزداں چہ سازد کس، بدین صبر آزمائی ھا

لغت: رستخیز کا لفظ رستہ اور خیز کا مرکب ہے۔ رستہ قدیم فارسی میں مردہ ہے رستخیز سے مراد مردوں کا جی اٹھنا یعنی قیامت ہے۔ عمر بھر تو میں نے صبر وضبط سے کام لیا، قیامت کے روز (جب ہر مردہ جسم میں زندگی تازہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔) میری خاک میں بھی حرکت آئی۔ مگر تجھے یہ بھی گوارا نہ ہوا اور تو برہم ہوا کہ اس کی خاک میں یہ جنبش کیوں آئی۔ تجھے اللہ کی قسم! اب تو ہی بتا کہ اتنی صبر آزمائیوں کی کوئی کیسے تاب لاسکتا ہے۔

کدوی چو نہ می یابم چنان بر خویشتن بالم

کہ پندارم سرآمد روزگار بی نوائی ھا

لغت: ''کدو'' کدو سے تراشا ہوا ایک پیالہ نما برتن جو عموماً درویش لوگ استعمال کرتے ہیں اور اسی میں کھاتے پیتے ہیں۔ ''سرآمدن'' ختم ہونا۔

جب کبھی مجھے کوئی شراب سے بھرا ہوا کدو میسر آتا ہے تو میں خوشی سے یوں پھول جاتا ہوں کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری مفلسیوں کا زمانہ ختم ہوگیا ہے۔

چہ خوش باشد دو شاهد را بہ بحث ناز پیچیدن
نگہ در نکتہ زائی ها، نفس در سرمہ سائی ها

وہ بھی کیا دلکش منظر ہوتا ہے جب کوئی دو معشوق باہم بیٹھ کر ناز و انداز کے تیوروں کے بارے میں بحث کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے الجھتے ہیں۔ اس عالم میں ان کی نگاہیں کیا کیا نکتہ آفرینیاں کرتی ہیں اور ان کے سانس (یعنی گفتگو) میں سرمگی انداز دلفریبی پایا جاتا ہے۔ یعنی ان کی نظروں اور باتوں میں عجیب رعنائی آجاتی ہے۔ یہ شعر حسن کا ایک دلکش محاکاتی منظر پیش کرتا ہے۔

سخن کوتہ، مرا هم دل بہ تقویٰ مائل است اما
ز ننگ زاهد افتادم بہ کافر ماجرائی ها

مرزا غالب کا مشہور اردو شعر ہے

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

تقریباً اسی قسم کے احساس کو اس نے شعر میں بیان کیا ہے کہ مختصر بات کہتا ہوں کہ دوسروں کی طرح میرا دل بھی زہد و تقویٰ کی طرف مائل ہے۔ لیکن زاہد کے اطوار ناہنجار دیکھ کر میں نے کافرانہ طرزِ عمل اختیار کر لیا ہے (کہ یہ ایسے غلط زاہدانہ کردار سے بہتر ہے)۔

زنجم گر بہ صورت از گدایان بودہ ام غالب
بدار الملک معنی می کنم فرماں روائی ها

غالب! اگر میری ظاہری زندگی فقیروں کی سی ہے تو مجھے اس کا کوئی دکھ نہیں۔ میں باطنی

طور پر ایک ایسا شہنشاہ ہوں جو روحانی دار السلطنت کا تاجدار ہے۔

صورت اور معنی میں تضاد ہے۔ اور اسی طرح گدا اور فرمانروا کے الفاظ میں ہے۔ چنانچہ اس شعر میں صنعت تضاد پائی جاتی ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۱۵)

جان برنتابد ای دل هنگامۂ ستم را
از سینہ ریز بیروں، مانند تیغ، دم را

لغت: ''دم تیغ'' تلوار کی تیزی اور اس کی آبداری کو کہتے ہیں۔ اس کے لئے فارسی میں لب تیغ، دہن تیغ اور روے تیغ کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ گویا دم تیغ تلوار کی تیز دھار ہے جو ایک طرح سینہ تیغ سے باہر ہی ہوتی ہے۔ مرزا غالب کا مشہور شعر ہے۔

جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

اس اردو شعر کا دوسرا مصرعہ پہلے مصرع کی وضاحت کے لیے بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی شاعر نے جذبہ بے اختیار شوق کو ظاہر کیا ہے۔ کم و بیش یہی طرز فکر فارسی کے شعر میں موجود ہے۔ جذبات شوق کی شدت کے باعث عاشق کے دل میں ایسے ایسے ہنگامے بپا رہتے ہیں کہ جان تنگ آجاتی ہے۔ اسی حالت کو بیان کونے کے لیے مرزا غالب کہتے ہیں: اے دل تیرے ہنگاموں کے ستم کی ہماری جان نازک تاب نہیں لا سکتی۔ تیغ کی طرح تو اپنی دھار کو سینے

سے باہر نکالے تا کہ تو جو چرکے لگا رہا ہے ان سے ہمیں نجات مل جائے۔

از وحشتِ برونم، بنگر غم درونم
آمیزش غریبی باشد بہ ہوش رم را

لغت: شاعر نے رم کے لفظ کو رم ہوش یعنی ہوش کے اڑنے کا مفہوم دیا ہے۔ اور ہوش اور رم ہوش میں ایک پوشیدہ آمیزش کی نشاندہی کی ہے۔

جب تک غم دل میں چھپا رہتا ہے اس کا پتا نہیں چلتا لیکن جب ظاہری حالت پریشان ہو تو غم پنہاں کا راز کھل جاتا ہے۔ گویا ہوش میں اور اڑنے میں ایک عجیب ربط ہوتا ہے۔

گویند می نویسد، قاتل برات خیری
یارب شکستہ باشد بر نام ما قلم را

لغت: یارب۔ ان الفاظ کے ''اے خدا'' کے علاوہ اور مفہوم بھی ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک ''اے کاش'' یا اللہ کرے'' بھی ہے۔ یہاں انھی معنوں میں آیا ہے۔ برات خیر۔ نیکی کا پروانہ، بری نامہ۔ جاں بخشی کا حکم۔ سنا ہے کہ قاتل ان لوگوں میں سے جنہیں وہ قتل کرنا چاہتا ہے۔ بعض کی جاں بخشی کا حکم لکھ رہا ہے۔ اللہ کرے کہ جب ہمارا نام آئے تو اس کا قلم ٹوٹ جائے۔

بی وجہ در رہت نیست از پا فتادنِ من
بردیدہ می ستانم، درہر قدم، قدم را

میں تیری راہ میں چلتے چلتے یونہی نہیں گر پڑتا۔ دراصل میں ہر قدم پر اپنے پاؤں اپنی

آنکھوں پر رکھ لیتا ہوں کہ یہ تیری راہ میں چل رہے ہیں انھیں آنکھوں پہ بٹھانا چاہیے۔
گویا محبوب کی راہ میں چلنا بھی ایک بڑی سعادت ہے۔

سوگندِ کشتنم خورد، از غصہ جان سپردم
کردم ز بی نیازی خون در جگر قسم را

لغت: ''خون در جگر کسے کردن'' کسی کی حالت کو تلخ کر دینا۔ ''غصہ'' انتہائے غم۔

محبوب نے مجھے مار ڈالنے کی قسم کھائی۔ میں نے غم کے ہاتھوں جاں دے دی۔ یہ گویا میری بے نیازی تھی کہ میں نے اس کو مارنے کا موقع ہی نہ دیا اور اس کی قسم دھری کی دھری رہ گئی۔

در نامہ تا بخشی بر من نوید قتلی
در دل چو جوہر تیغ جا دادہ ام رقم را

جب سے تو نے خط میں مجھے قتل کرنے کی خوشخبری دی میں نے اس تحریر کو دل میں اس طرح رکھ لیا جس طرح تیغ میں جوہر تیغ ہوتا ہے۔

بیداد گر ندارد سرمایۂ تواضع
تیغت برسم یغما از ما ربودہ خم را

لغت یغما۔ لوٹ کا مال۔ مال غنیمت۔ ستمگر ظالم انسان میں تواضع کہاں ہوتی ہے۔

تیری تلوار میں جو خم ہے وہ تیری اس کی خوئے تواضع کے باعث نہیں۔ یہ تو ہماری نیاز مندی کا خم ہے جو تیری تلوار نے بطور مال غنیمت ہم سے چھین لیا۔

کاشانہ گشت ویران، ویرانہ دل کشا تر
دیوار و در نسازد زندانیان غم را

لغت: زندانیاں" زندانی کی جمع۔ زندانی کی "ی" فاعلی ہے یعنی زندان میں رہنے والا۔

ہمارا گھر ویران ہوگیا، ویرانہ ہی اچھی جگہ ہے غم کے اسیروں کو (گھر کے) دیوار و در راس نہیں آتے۔

مانند خار زادی کآتش زنند در وی
سوزد ز بیم خویت اجزای نالہ ھم را

لغت: "اجزاے نالہ ہم" یعنی فریاد کے تمام اجزا ایک کے بعد دیگرے۔

"زنند" فارسی میں صیغہ جمع غائب بالعموم محاورۃً آتا ہے اور فعل مجہول کا مفہوم دیتا ہے۔ یہاں وہی مفہوم ہے کآتش زنند یعنی جسے آگ لگائی گئی ہو۔

خارزار کو جلدی آگ لگ جاتی ہے۔ اور وہ یکسر جل جاتا ہے۔ اس خارزار کی طرح جسے آگ لگادی گئی ہو، تیری آتشیں خو کے خوف سے میری فریادیں یکسر جل جاتی ہیں یعنی میں تیری طبع تیز کے خوف سے فریاد ہی نہیں کرپاتا۔

در مشرب حریفان منع است خودنمائی
بنگر کہ چون سکندر آئینہ نیست جم را

لغت: مشرب حریفاں" باہم مل کر پینے والوں کا مسلک "جم"۔ جم سے دو شخصیتیں مراد ہوتی ہیں: جب خاتم جم آئے تو جم سے مقصود حضرت سلیمانؑ ہوتے ہیں اور جب جام جم آئے تو

جم سے جمشید مراد لیتے ہیں۔

آئینے کی ایجاد کو سکندر اعظم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ جمشید اپنی بزم نا ے و نوش کے لیے مشہور ہے۔

میخواروں کے مذہب میں خودنمائی ممنوع ہوتی ہے۔ دیکھ لو، جمشید کے پاس سکندر کی طرح کوئی آئینہ نہیں تھا۔

جمشید کے پاس جام جم تھا جس میں، کہا جاتا ہے۔ آئندہ آنے والے واقعات منعکس ہوتے تھے۔ سکندر کی طرح آئینہ نہیں تھا کہ وہ اس میں اپنا عکس دیکھتا اور پھر خودنمائی کرتا۔

زاهد مناز چندین، زنارم ار گسستی
از جبهه ام نه دزدد کس سجدهٔ صنم را

اے زاہد اگر تو نے میرا زنار (نشان کفر سمجھ کر) توڑ دیا تو یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔
بظاہر تو نے میرا کفر مٹادیا۔ لیکن میری پیشانی سے تو سجدۂ بت کا نشان نہیں مٹا سکتا۔
یعنی میرا کفر زنار تک محدود نہیں۔ یہ ایک طبعی شے ہے اور میں نے اسے ریاضتوں سے حاصل کیا ہے۔

اشکی نماند باقی از فرطِ گریہ غالب
سیلی رسید و گوئی از دیدہ شست نم را

اے غالب، میں اس جوش سے رویا ہوں کہ اب ایک آنسو بھی باقی نہیں رہا۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی سیلاب آیا تھا اور وہ میری آنکھوں کی ساری نمی کو بہا کر لے گیا ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۱۶)

من آن نیم کہ دگر می توان فریفت مرا
فریبمش کہ مگر می توان فریفت مرا

میں وہ نہیں کہ مجھے اب کوئی فریب دے سکے۔ لیکن میں اپنے محبوب کو محض اس لیے یہ غلط احساس دلاتا ہوں کہ میں فریب کھا سکتا ہوں کہ اس خیال سے شاید وہ مجھے فریب دینے پر آمادہ ہو جائے۔

مقصود یہ ہے کہ میں اب حسن کے کسی فریب میں نہیں آ سکتا۔ لیکن فریب کھانے میں جو لذت ہے اس لذت کو ابھی نہیں بھولا اور اسے ظاہر نہیں کرتا۔ چاہتا ہوں میرا محبوب مجھے دھوکا دے اور مجھے مزہ آئے۔

بحرف ذوقِ نگہ می توان ربود مرا
بہ وہمِ تاب کمر می توان فریفت مرا

محبوب کی کمر کے متعلق شعرا کا خیال ہے کہ وہ بہت پتلی ہوتی ہے بلکہ بعض مبالغہ آمیزی سے کام لے کر کہتے ہیں کہ وہ ہوتی ہی نہیں، محض دیکھنے والے کا وہم ہوتا ہے کہ کمر ہے۔

ایک ذوق نگاہ کی بات سے میرا دل موہ لیا جا سکتا ہے اور کمر کے وہم میں ڈال کر مجھے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔

ز ذکرِ مُل بگمان می توان فگند مرا
ز شاخِ گل بہ ثمر می توان فریفت مرا

شراب کے ذکر سے مجھے سرور میں لایا جا سکتا ہے اور مجھے یہ گمان دلایا جا سکتا ہے کہ میں نشے میں ہوں، اور میں کسی شاخِ گل کو دیکھ کر اس دھوکے میں آ سکتا ہوں کہ اس پر پھول نہیں پھل لگے ہوئے ہیں۔ حسن شاخِ گل کی طرح ہوتا ہے جس پر ناز و ادا کے پھول تو کھلتے ہیں لیکن وفا کے پھل نہیں لگتے۔ لیکن مرزا غالب ایک ایسے عاشق ہیں جو یہاں بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔

ز دردِ دل کہ بافسانہ درمیان آید
بہ نیم جنبش سر می توان فریفت مرا

افسانۂ محبت کہتے کہتے، ذرا سی کہیں دردِ دل کی بات آ جائے (جیسا کہ عموماً آ جایا کرتی ہے) تو اس بات پر کسی افسانہ سننے والے کا ہولے سے سر ہلا دینا بھی مجھے فریب دینے کو کافی ہے۔ یعنی سننے والے کی ذرا سی جنبش سر سے یہ سمجھ لوں گا کہ اس میں دردِ دل کا ہلکا سا احساس ضرور ہے۔

ز سوزِ دل کہ بہ واگویہ بر زبان گزرد
بیک دو حرف حذر می توان فریفت مرا

لغت: ''واگویہ'' ''گفتگو''۔ بعض کے نزدیک واگویہ وہ گفتگو ہوتی ہے جو کسی بات کا چرچا کرنے کے لیے دہرائی جائے۔

اس شعر میں دونوں معنوں کے پہلو موجود ہیں۔ ذرا سے سوزِ دل کے اظہار سے جو گفتگو کے دوران میں زبان پر آ ہی جاتا ہے مجھے ڈراوے کے ایک دو حرفوں سے دھوکا دیا جا سکتا

ہے۔(یعنی چپ کرایا جاسکتا ہے۔) کہ میں سوزِ دل کی بات نہ کروں۔

من و فریفتگی! ھرگز آن محال اندیش

چرا فریفت اگر می توان فریفت مرا

میں اور فریب کھاؤں ناممکن بات ہے۔اور اگر واقعی مجھے دھوکا دیا جاسکتا ہے تو میرے محبوب نے، جو ہمیشہ محال کام ہی کرنے کی کوشش کرتا ہے، مجھے کیوں فریب دیا۔مقصودِ شعر یہ ہے کہ محبوب فریب دینے سے گریز کرے یا عاشق فریب کھانے کی کوشش کرے، عشق میں فریفتگی آہی جاتی ہے۔

تم بھی ضبط کرو، میں بھی

عشق ہے کس کے بس کی بات

خدنگ جز بگرایش کشاد نہ پذیرد

از و بزخمِ جگر می توان فریفت مرا

تیرِ محبوب کے میلانِ طبع کے بغیر زہ سے نکل کے جا ہی نہیں سکتا۔پھر بھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے اس کے تیر سے جگر پر زخم کھا لیا ہے۔

ز باز نامدنِ نامہ بر خوشم کہ ھنوز

بہ آرزوی خبر می توان فریفت مرا

نامہ بر واپس نہیں آیا اور میں اس کے نہ آنے پر اس لیے خوش ہوں کہ محبوب کی طرف سے کسی (اچھی) خبر کے آنے کی آرزو سے اپنے دل کو (کچھ وقت اور) فریب میں مبتلا کیا جاسکتا ہے۔

شب فراق ندارد سحر، ولی یک چند

بہ گفتگوی سحر می توان فریفت مرا

شب جدائی کی کوئی سحر نہیں ہوتی تاہم کچھ وقت کے لیے سحر کا ذکر کر کے مجھے یہ فریب تو دیا جاسکتا ہے کہ سحر ہو گی۔

نشانِ دوست ندانم جز این کہ پردہ دراست

ز در بہ روزنِ در می تواں فریفت مرا

نشان دوست کے بارے میں، میں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا کہ وہ پردہ در ہوتا ہے۔

گرسنہ چشم اثر نیستم کہ در رہ دید

بہ کیمیائی نظر می توان فریفت مرا

لغت: ''گرسنہ چشم'' وہ شخص جس کی نگاہیں بھوکی ہوں۔مرزا غالب نے ''گرسنہ چشم اثر'' کے بڑے بلیغ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ان سے مرزا اس نے وہ شخص لیا ہے جو محبت بھری نظروں کے اثر کو دیکھنے کو ترس رہا ہو۔مرزا صاحب کہتے ہیں کہ میں آنکھوں کے اثر کو دیکھنے کا بھوکا نہیں لیکن مجھے اتنا تو فریب دیا جاسکتا ہے کہ محبت بھری نظریں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔ان کا اثر ضرور ہوتا ہے۔

سرشت من بود این، ورنہ آن نیم غالب

کہ از وفا بہ اثر می توان فریفت مرا

اے غالب میں کیا کروں میری سرشت ہی ایسی ہے ورنہ میں وہ نہیں کہ یہ سن کر دھوکے میں آجاؤں کہ وفا کا اثر ہوتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ وفا کا اثر ہو نہ ہو، ہم خوگر وفا ہیں، وفا ہی کرتے رہے ہیں۔

❁❁❁

غزل نمبر(۱۷)

ز من گرت نہ بود انتظار، بیا
بہانہ جوی مباش و ستیزہ کار بیا

میں تیرا انتظار کر رہا ہوں اور اگر تجھے اس بات کا اعتبار نہیں آتا تو آ کر دیکھ لے۔ یونہی بہانے تلاش نہ کر، لڑنے جھگڑنے کے انداز ہی میں آجا۔

بیک دو شیوہ ستم دل نمی شود خرسند
بہ مرگِ من کہ بہ سامانِ روزگار بیا

دو ایک طرز ستم سے میرا جی نہیں بھرتا۔ تجھے میری موت کی قسم، آ اور جور وستم کے ساز و سامان کی ایک دنیا لے کر آ۔

بہ مرگ من میں ''ب'' قسمیہ ہے یہاں موت کی قسم کھانے میں ایک نکتہ ہے، یعنی اگر محبوب کے جور وستم کے ہاتھوں موت بھی واقع ہو تو مضائقہ نہیں۔

بہانہ جوست در الزام مدعی شوقت
یکی برغمِ دل ناامیدوار بیا

غالب کا ایک مشہور اردو شعر ہے

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

یعنی تیرے آنے میں جو تاخیر ہوئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ رقیب مانع تھا۔ فارسی کے شعر میں اسی خیال کو ایک اور انداز میں پیش کیا ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارا شوق بھرا دل ہمیشہ رقیب پر الزام لگانے کے بہانے سوچتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ تیرے نہ آنے کا باعث رقیب ہے۔ ایک بار ہمارے دل کے اس پختہ احساس کے خلاف (خلاف توقع) آجا۔

ھلاک شیوۂ تمکین مخواہ مستان را
عنان گسستہ تر از بادِ نو بہار بیا

لغت: ''مستاں'' سے مراد عاشق ہیں جو اپنے جذبات محبت میں مست ہیں۔ ''تمکین''، تمکنت، حسن کا غرور و ناز ''عناں گسستہ'' وہ جانور جس کی لگام ٹوٹ گئی ہو اور وہ بغیر کسی روک تھام کے آزاد بھاگتا چلا جائے۔ تو اپنے عاشقان سرمست کو اپنے ناز حسن سے کیوں ستا رہا ہے۔ آ اور یہ غرور نخوت چھوڑ کر بے تکلف چلا آ۔ باد بہاری سے زیادہ بے تکلف ہو کر آ کہ وہ جدھر چاہے آزادانہ چلی آتی ہے۔

ز ما گسستی و با دیگران گرو بستی
بیا کہ عھدِ وفا نیست استوار، بیا

لغت: ''گرو بستن'' عہد باندھنا۔

مولانا حالی اس شعر کی شرح یوں لکھتے ہیں:۔

''یعنی اگر تو نے ہم سے توڑ کر غیروں کے ساتھ پیمان باندھا ہے تو اس کا خیال نہ کر اور بے تکلف ہمارے پاس آ جا کیونکہ عہد وفا ٹوٹنے ہی کے لیے باندھا جاتا ہے اور وہ کبھی استوار نہیں ہوتا جیسا کہ ہمارے ساتھ بندھ کر ٹوٹ گیا۔

عہد وفا کوئی پائدار شے نہیں جس طرح تو نے ہم سے عہد وفا باندھ کر توڑ دیا۔ اسی طرح تو نے جو دوسروں کے ساتھ عہد و پیان کیا ہے اسے بھی توڑا جا سکتا ہے۔ جھجک کس بات کی ہے۔

وداع و وصل جداگانہ لذّتی دارد

ھزار بار برو، صد ھزار بار بیا

جدا ہونے اور ملنے میں دو الگ الگ لذتیں ہیں۔ ہزار بار جا اور لاکھ بار آ۔

اگرچہ شاعر نے فراق و وصال، دونوں کی لذتوں کا نام لیا ہے، تاہم وصل کی لذت کے کیا کہنے۔ اسی لیے مرزا غالب نے محبوب کے جانے کے لیے ہزار بار اور آنے کے لیے لاکھ بار کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

توطفل سادہ دل ھمنشیں بد آموز است

جنازہ گر نتوان دید، بر مزار بیا

تو ایک نادان بچے کی طرح ہے۔ اور رقیب جو تیرا ہم نشیں ہے تجھے غلط سبق سکھا کر گمراہ کر رہا ہے۔ اگر تو میرے جنازے کو دیکھنے کے لیے نہیں آ سکا تو نہ سہی، کم از کم مزار پر تو آ جا۔

شاعر نے دو مصرعے میں ''جنازہ گر نتوان دید'' کے الفظ استعمال کیے ہیں۔ جنازے میں شریک ہونا تو بڑی بات ہے جنازے کو گزرتے دیکھنا یا اسے دیکھ لینا ہی کافی ہے کیونکہ رقیب مانع ہے یہ ساری بات محبوب کی سادگی اور رقیب کی بد آموزی کو ظاہر کرتی ہے۔

فریب خوردۂ نازم، چھا نمی خواھم

یکی بہ پرسشِ جانِ اُمیدوار بیا

چھا، چہ کی جمع ہے، مبالغے یا کثرت کے لیے آیا ہے۔

میں کیا کچھ نہیں چاہتا تھا لیکن تیرے ناز و انداز کے فریب میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔ ایک بار تو میری جان امیدوار کا حال پوچھنے کے لیے آ اور دیکھ کہ کیا کیا خواہشیں وہاں ابھی تک دبی ہوئی ہیں۔

حسن کے ناز و انداز کی کارفرمائیوں کا یہ عالم ہے کہ ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دس اور ابھر آتی ہیں۔ دل کیا ہے امید کا ایک انبار ہے۔ امیدوں کے اسی ہجوم کے لیے مرزا غالب نے ''جان امیدوار'' لکھا ہے گویا عاشق کی زندگی ہی امیدوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔

ز خوی تست نھادِ شکیب نازک تر

بیا کہ دست و دلم می رود ز کار بیا

تیری طبیعت نازک ہے اور ہمارا صبر اس سے زیادہ نازک ہے۔ آ کہ صبر کرتے کرتے ہمارا ہاتھ اور دل دونوں کام سے رہ گئے ہیں۔

رواج صومعه هستی است، زینهار مرو
متاع میکده مستی است، هوشیار بیا

خانقاہ میں خودی اور غرور و پندار کا رواج ہے وہاں ہرگز نہ جا میکدے کا سارا سرمایہ کیف و مستی ہے یہاں آ اور ہوشیار ہو کر آ۔ مولانا حالی "ہوشیار بیا" کے بارے میں فرماتے ہیں۔ "یعنی میکدے میں ظرف عالی لے کر آنا چاہیے۔ مستی حاصل کرنے کے لیے ہوشیار ہو کر آنے میں جو لطف ہے وہ محتاج بیان نہیں"۔

حصار عافیتی گر هوس کنی غالب
چو ما به حلقه رندانِ خاکسار بیا

اے غالب اگر تجھے عافیت کی جگہ کی خواہش ہے تو رندان خاکسار کی صحبت میں آ کر بیٹھ۔ مرزا غالب نے حلقۂ رنداں کو حصار عافیت کہا ہے یعنی عافیت کا قلعہ جہاں دنیا کے تفکرات کو کوئی دخل نہیں۔
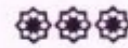
غزل نمبر (۱۸)

چون به قاصد بسپرم پیغام را
رشک نگذارد که گویم نام را

جب میں کوئی پیغام (اپنے محبوب کے نام) قاصد کے سپرد کرتا ہوں تو رشک مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں اس کا نام لوں۔

گشته در تاریکی روزم نهان
کو چراغی تا بجویم شام را

میرا دن تاریکیوں میں چھپ گیا ہے۔ چراغ کہاں ہے کہ میں شام کو تلاش کروں "یعنی میرا دن اس قدر تاریک تھا کہ شام کی تاریکی اور اس کی تاریکی دونوں مل گئیں اور یہ نہ معلوم ہوا کہ شام کب ہوئی اور دن کب چھپا۔" (حالی)

آن مَیم باید که چون ریزم بجام
زورِ مَی در گردش آرد جام را

مجھے وہ شراب چاہیے کہ میں جب اسے پیالے میں ڈالوں تو اس کی تیزی اور تندی سے پیالہ خود بخود گردش میں آ جائے۔ بظاہر شراب کی تندی اور تیزی دکھانی مقصود ہے لیکن اس میں ایک لطیف اشارہ یہ بھی پنہاں ہے کہ ایسی شراب ہو کہ ساقی کی ضرورت محسوس نہ ہو جام ساقی گری بھی کرے۔

بی گناهم، پیر دیر از من مرنج
من به مستی بسته ام احرام را

لغت:۔ "دیر" گنبد نما عبادت خانہ۔

یہ عبادت خانہ آتش پرستوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس رعایت سے پیر دیر "پیر مغاں" ہوگا۔ معبدِ آتش پرستاں کا پادری۔ دیر، حرم کی ضد بھی ہے دیر و حرم، عبادت خانہ کافراں اور کعبہ آتش پرستوں کے یہاں شراب پینا جائز تھا۔ اس لیے پیر مغاں کا لفظ، پیر میکدہ کے لیے مستعمل ہے۔ شعر کے دوسرے مصرعے میں مستی کا لفظ اسی لیے آیا ہے، کہتا ہے: اے

پیرِ دیر، مجھ سے رنجیدہ نہ ہو، میں جو یہاں احرام باندھ کر آ گیا ہوں یہ مستی اور نشے کا اثر ہے۔

از دل تست آنچہ بر من می رود
می شناسم سختیِ ایام را

معشوق کے جور و ستم اور زمانے کے جور و ستم میں یک گونہ مماثلت ہے۔ معشوق سنگدل ہے اور اس کا دل پتھر کی طرح سخت ہے اسی لیے شاعر نے زمانے کے دکھ درد کو سختیِ ایام کہا ہے۔

کہتا ہے، میں زمانے کی سختیوں کو پہچانتا ہوں، ان میں وہی انداز ہے جو تیرے جور و ستم میں ہے۔ اور پھر تیرا دل چاہتا بھی یہی ہے کہ میں ان سختیوں میں مبتلا رہوں۔ یہ سب کچھ تیری دلی آرزو کے مطابق ہو رہا ہے۔

شعر کے ان قریبی اور بعیدی معنوں کے اعتبار سے، شعر میں دقیق صنعتِ ایہام پیدا ہو گئی ہے۔

تا نیفتد ھر کہ تن پرور بوَد
خوش بوَد گردانہ نبوَد دام را

اگر جال بچھا ہو اور اس میں دانے نہ بکھیرے گئے ہوں تو بڑی اچھی بات ہو گی کیوں کہ اس طرح جال میں کوئی تن پرور نہیں پھنس سکے گا، وہی اسیر ہوں گے جو اسیری کے خواہاں ہوں گے۔

عاشق اسیرِ محبت ہوتا ہے۔ اسیرِ ہوس نہیں ہوتا۔
کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

التفات بے غرض، سررشتۂ تسخیر ماست
صید ما خواہی، بروں از دام باید دانہ ریخت

ہمیں تسخیر کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ تو ہماری طرف بغیر کسی غرض سے مائل ہو۔ ہمیں اسیر کرنا چاہتا ہے تو دانہ جال سے باہر ڈال۔

مرزا غالب کے شعر کے بارے میں مولانا حالی کہتے ہیں:
"یہ وہی مضمون ہے جو مرزا نے اردو میں اس طرح باندھا ہے:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

بسکہ ایمانم بہ غیب است استوار
از دھان دوست خواھم کام را

شعراء کمرِ معشوق کی طرح دہنِ معشوق کو اس کی تنگی کے باعث، کالعدم کہہ دیتے ہیں گویا وہ اتنا تنگ ہوتا ہے کہ نظر نہیں آتا غیب ہوتا ہے۔ غیب اللہ تعالیٰ کی ذات بھی ہے۔ اس سے لوگ اپنی آرزوؤں کے پورا ہونے کی امید رکھتے ہیں۔

انھی مناجات کے پیشِ نظر مرزا غالب کہتے ہیں:

چونکہ میرا غیب پر پختہ ایمان ہے اس لیے میں دہنِ معشوق کو غیب سمجھتے ہوئے اس سے اپنی آرزو برآری کی خواہش کرتا ہوں۔

ما کجا، اُو کو، چہ سودا در سر است
ذرہ ھای آفتاب آشام را

لغت: ''آفتاب آشام'' دھوپ یا آفتاب کو پی جانے والا مرزا غالب کا مصرعہ ہے:

پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

یوں تو ذرے فضا میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن نظر نہیں آتے البتہ دھوپ میں آجائیں تو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ گویا آفتاب ہی سے ان کی ہستی قائم ہے۔

اس پس منظر میں مرزا غالب نے متصوفانہ انداز میں انسان اور خالق کائنات کے باہمی ربط کو ظاہر کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم کہاں اور وہ کہاں ان آفتاب کے فیض سے وجود پانے والے ذروں کے سر میں کیا سودا سما گیا ہے کہ اس کے عشق کا دعویٰ کرتے ہیں۔

زحمتِ عام است دائم خاص را

عشرتِ خاص است ہردم عام را

خواص، ہمیشہ عام مصیبتوں میں مبتلا رہتے ہیں اور عام کو عیش و عشرت کے خاص سامان میسر آتے ہیں۔

دلستان در خشم و غالب بوسہ جو

شوق نشناسد ھمی ھنگام را

محبوب غصے میں ہے اور غالب کو دیکھو وہ بوسہ طلب کر رہا ہے۔ ہاں شوق موقع محل نہیں دیکھتا۔

❀❀❀

غزل نمبر (۱۹)

در ھجر، طرب بیش کند تاب وتبم را

مھتاب کفِ مار سیاہ است شبم را

فراق میں خوشی کا ساز و سامان میری بیقراری اور تڑپ کو اور بھی زیادہ کر دیتا ہے۔

پس چاندنی (جو خوشی اور طرب کا منظر ہے) میری رات کے حق میں ایک سیاہ ناگ کے پھن کا حکم رکھتی ہے۔

آوخ کہ چمن بستم و گردوں عوض گل

در دامنِ من ریختہ پائی طلبم را

افسوس! میں چمن کی تلاش میں تھا اور آسمان نے پھولوں کے عوض، میرے دامن میں پائے طلب ڈال دیے، یعنی قسمت میں پھول نہیں تھے، پھولوں کی تلاش ہی لکھی تھی۔

ساز و قدح نغمہ و صھبا، ھمہ آتش

یابی ز سمندر، رہ بزم طربَم را

لغت: ''سمندر'' ایک کیڑا ہے جو آگ میں رہتا ہے۔ گویا اس کی طبیعت آتشیں ہے۔

میرا ساز، پیالہ نغمہ اور شراب سب کے سب سر تا پا آگ ہیں۔ اگر آپ لوگ میری بزم طرب کا سراغ لگانا چاہیں تو وہ آپ کو سمندر کی وساطت سے ملے گا۔

یعنی نغمہ و بادہ بظاہر سامان طرب ہیں۔ لیکن یہ تو میری آتش غم کو اور بھی بھڑکاتے ہیں۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مئے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

یہ آتش غم ہی ہمارا سرمایۂ حیات ہے جس طرح سمندر آگ میں رہ کر زندگی حاصل کرتا ہے اسی طرح ہم بھی غم کے شعلوں میں پھلتے پھولتے ہیں۔

در دل ز تمنای قدم بوس تو شوریست
شوقت چه نمک داده مذاق ادبم را

لغت: ''شور'' یہ لفظ مختلف معنی دیتا ہے۔ غلغلہ و آواز بلند عشق و جنوں، نمک و نمکین۔
اسما کے اخیر بطور لاحقہ آئے تو فاعلی معنی پیدا کرتا ہے جیسے صلح شور، یعنی صلاح استعمال کرنے والا۔

شاعر نے شعر میں شور کا لفظ، ہجوم جذبات شوق کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اور چونکہ شعر کے دوسرے مصرعے میں نمک کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے شور کا ایک معنوی پہلو لذت بھی ہے۔

''مذاق ادب'' سے مقصود ذوق احترام، یا لذت احترام ہے کہتا ہے کہ میرے دل میں حسن کا یہ احترام ہے اور اسی احترام کے باعث مجھے تیرے پاؤں کو چومنے کی تمنا ہے اور اس تمنا نے میرے دل میں جذبات کا ایک ایسا جوش و خروش پیدا کر دیا ہے کہ ذوق احترام میں نمکینی کی لذت بھر دی ہے۔

مقصود یہ ہے کہ دل احترام حسن میں ڈوبا ہوا ہے اور اس سے لذت اندوز ہو رہا ہے۔

از لذتِ بیداد تو فارغ نتوان زیست
دریاب عیار گله بی سببم را

لغت: ''عیار'' سونے چاندی کی پرکھ یا پرکھنے کے آلے کو کہتے ہیں اور اسی اعتبار سے اس کا ایک مفہوم، خالص یا کھرا بھی ہے۔ ''گلہ بے سبب'' گلہ بے جا، یہ ایسا گلہ جس کا کوئی سبب نہ ہو، جب معشوق ستم ڈھاتا ہے تو شکایت ہوتی۔ جب وہ ستم نہیں کرتا تو لب پر شکایت کا آنا، گلہ بے جا ہوگا۔

غالب کی نظر میں یہ گلہ بے سبب یا گلہ بے جا نہیں۔ چنانچہ وہ اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ تو میرے گلہ بے سبب کو اچھی طرح بھانپنے کی کوشش کر اور دیکھ کہ یہ گلہ بے جا نہیں مجھے تیرے ستم اٹھانے میں لذت ملتی ہے کہ اس کے بغیر ایک لمحہ کے لیے بھی جیا نہیں جا سکتا۔

یہ گلہ، گلہ نہیں تقاضائے جفا ہے۔

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوہ بیداد نہیں

ترسم که دهد ناله جگر را بدریدن
قطع نظر از جیب بدوزیم لبم را

لغت: ''جیب'' گیریبان۔

ڈرتا ہوں کہ فریاد کروں کا تو جگر پھٹ جائے گا۔ اس لیے چاک گریباں کو سینے کی بجائے میں نے لبوں کو سی لیا ہے۔ یعنی ضبط سے کام لیتا ہوں کیونکہ ضبط کرنے ہی میں میرا فائدہ ہے۔

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا، وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفس جانگداز کا

از ناله به نبضم بنه ای دوست سرانگشت
مانند نی اندر ستخوان جوی تمم را

لغت: پہلے مصرعے میں از کا حرف اضافی ہے یعنی اضافت کا مفہوم دیتا ہے چنانچہ اس مفہوم کے تحت پہلے مصرعے کی نثر یہ ہوگی:

اے دوست، سرانگشت نالہ بہ نبض من بنہ

"تب" حرارت عشق سوز محبت

یعنی میری فریاد وفغاں سے میری نبض کو ٹٹول

جس طرح نَے یعنی بانسری کی فریاد سے اس کے سینہ کی حرارت کا سراغ ملتا ہے، اسی طرح سے میرے نالہ وفریاد سے میری ہڈیوں میں چھپے ہوئے تپ عشق کا اندازہ کرلے۔

ساقی بہ نمی کز قدح بادہ چکانی

بر خلد بخنداں لب کوثر طلبم را

لغت:۔ "لب کوثر طلب" وہ لب جو شراب کو کوثر کے لیے ترستے ہیں۔ اے ساقی، اس ایک آدھ قطرہ شراب سے جو تو نہایت بے پروا انداز میں زمین پر گرا دیتا ہے، میرے لبوں کو یوں شگفتہ کردے کہ جیسے وہ جنت کی نعمتوں پر تحقیر سے ہنس رہے ہیں۔

در من ھوس بادہ طبیعی است کہ غالب

پیمانہ بہ جمشید رساند نسبم را

میری شراب نوشی کی شدید خواہش میری طینت میں شامل ہے۔ یہ پیمانۂ مے ہی تو ہے جس سے میرا سلسلۂ نسب جمشید سے جاملتا ہے۔

❀❀❀
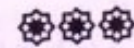
غزل نمبر(۲۰)

بر نمی آید ز چشم از جوش حیرانی مرا

شد نگہ زنار تسبیح سلیمانی مرا

دامن افشاندم بجیب و ماندہ در بندتنم

وحشتی کو تا برون آرد ز عریانی مرا

میں نے اپنا دامن جھٹک کر اپنے گریباں پر ڈال لیا اور چاک گریباں کو ڈھانپ لیا۔ لیکن ابھی جسم کی عریانی کو ڈھانپنے کی فکر میں ہوں۔ وحشت جنوں کہاں ہے جو آ کر میری عریانی سے مجھے باہر لے آئے۔

انسان میں جب تک بلند اخلاقی اور روحانی صفات پیدا نہ ہوں اس کی زندگی، ایک عریاں جسم کی طرح ہوتی ہے۔ ایک ذی ہوش انسان اپنی اس عریانی کے احساس سے باہر نہیں آسکتا، ہاں دیوانگی ہی اس احساس کو ختم کر دیتی ہے۔ مرزا غالب اپنے شعر میں اسی وحشت جنون کو تلاش کر رہے ہیں۔

اُن کا یہ اردو شعر اسی خیال کا آئینہ دار ہے:

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی

میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

وہ کہ پیش از من بہ پابوس کسی خواھد رسید

سجدۂ شوقی کہ می بالد بہ پیشانی مرا

کیا اچھا ہو کہ میرا سجدۂ شوق جو میری پیشانی میں پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اور دمبدم بڑھتا جا رہا ہے، مجھ سے پہلے کسی کی پابوسی کا شرف حاصل کر لے۔ اس شعر میں شاعر نے اپنے والہانہ جذبہ پابوس کا اظہار کیا ہے۔ لطیف نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ محبوب کے پاؤں تک بھی اس کی اپنی رسائی نہیں ہوتی تاہم اس کا شوق بے تاب تصور ہی میں محبوب کے پاؤں چوم رہا ہے۔

هم چنین بیگانه زی با من، دل و جان کسی

بدگمان گردم اگر دانم که میدانی!

تو کسی اور کا دل و جان ہے، میرے ساتھ یونہی بیگانہ وار ہی رہنا بہتر ہے کیونکہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ تو مجھے جانتا ہے اور آشنا ہے تو میں بدگمان ہو جاؤں، یعنی سمجھوں گا کہ تو درپردہ مجھ پر مہرباں ہے ظاہر میں تغافل برت رہا ہے۔ حالانکہ یہ بات سراسر غلط ہے۔

با همه خرسندی از وی شکوه ها دارم همی

تا نداند صید پرسش هائی پنهانی مرا

لغت: ''پرسش ہائے پنہانی'' پوشیدہ التفات اور توجہ میں اپنے محبوب سے خوش ہوں لیکن اس کے باوجود مجھے اس سے گلے شکوے بھی ہیں تاکہ کہیں وہ یہ نہ خیال کرلے کہ میں اس کی درپردہ نوازشوں کا شکار ہو چکا ہوں۔

برنیایم با روانی هائی طبع خویشتن

موج آب گوهر من کرده طوفانی مرا

لغت: طوفانی ''طوفان میں گھرا ہوا شخص۔ اس لفظ کے آخر میں ''ی'' فاعلی ہے۔

سادہ ترجمہ۔ میں اپنی طبیعت کی روانیوں سے نپٹ نہیں سکتا۔ میں اپنے موتی کی چمک کی لہروں کے طوفان میں گھر گیا ہوں۔

فارسی کا ایک مصرعہ ہے: اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی، جو ضرب المثل ہو گیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ انسان کی ذہانیت اس کے لیے وبال ہو جاتی ہے۔ مرزا غالب نے اسی خیال کو اپنے اسلوب بیان میں سمویا ہے۔

لفظ گوہر کا ایک مفہوم اصل کا بھی ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے شاعر نے اسے اپنی طبع کے لیے استعمال کیا ہے۔ طبیعت کی چمک کو آب کہا ہے اور یہ چمک اتنی زیادہ ہے کہ اس سے روشنی کی لہریں ابھر رہی ہیں۔ گویا لہروں کا ایک طوفان بپا ہے۔ موج آب گوہر کی رعایت سے اس نے اپنی روشنی طبع کو، روانی طبع سے، تعبیر کیا ہے، گویا شاعر اپنی شاعرانہ طبیعت کی روانیوں میں غرق ہے۔

اُس کے ذہن سے دقیق افکار ابھر رہے ہیں۔ اور وہ خود ہی اس افکار میں کھویا ہوا ہے۔

تا به راحت مُردم ویکره بخاکم نامدی

دوزخی گردیده اندوه پشیمانی مرا

جب سے میں نے تیری راہ محبت میں جان دی تو ایک بار بھی میری خاک پر نہ آیا۔ اس پشیمانی کا غم میرے لیے دوزخ بن گیا ہے۔

خویش را چون موج گوهر گرچه گرد آورده ام

دل پر است از ذوق انداز پر افشانی مرا

لغت: ''پرافشانی'' پر پھڑپھڑانے کی حالت، اضطراب اور پریشانی کی حالت،

اگرچہ میں نے موتی کی چمک کی طرح اپنے آپ کو سمیٹ کے رکھا ہے پھر بھی دل اضطراب سے لبریز ہے۔

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جان دھم
گر بہ موج افتد گمان چین پیشانی مرا

مولانا حالی نے اس شعر کی کتنی سادہ شرح کر دی لکھتے ہیں: ''میں کیسا ہی پیاسا ہوں لیکن اگر دریا کی موج پر مجھ کو یہ شبہ گزرے کہ دریا نے مجھے دیکھ کر اپنی پیشانی پر بل ڈالا ہے تو میں غیرت سے ساحل دریا پر جان دے دونگا مگر حلق تر نہ کروں گا''۔

یہ شعر جذباتی محاکات کی ایک عمدہ مثال ہے اور غالب کے دل و دماغ کا آئینہ دار ہے۔

با سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالب نیست آہنگ غزلخوانی مرا

سراج الدین احمد کے سامنے سوائے تسلیم کے اور کوئی چارہ نہیں ورنہ غالب، میرا غزل خوانی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

❀❀❀

غزل نمبر (۲۱)

از وھم قطرگیست کہ در خود گمیم ما
اما چو وا رسیم، ھمان قلزمیم ما

لغت: ''قطرگی'' میں ''ی'' مصدری ہے یعنی قطرہ ہونا مرزا کا ایک اردو شعر ہے۔

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

یعنی قطرہ، لہر اور حباب کی کوئی حیثیت نہیں، یہ سب سمندر ہی سے ابھرے ہیں اور ان کا وجود، کثرت موہوم ہے۔

چنانچہ فارسی شعر کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ہم اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ہم قطرہ ہیں اور قطرے کا بھی کوئی وجود ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خودی میں ڈوب گئے ہیں ورنہ غور کیا جائے تو ہم وہی سمندر ہیں۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

در خاک از ھوای گل و شمع فارغیم
از توسنِ تو طالب نقش سمیم ما

ہم خاک ہیں اور گل وشمع سے (جو زندگی کی بزم آرائیوں کی زینت ہوتے ہیں۔ بے نیاز ہیں ہم تو بحیثیت خاک کے صرف اس بات کے طالب ہیں کہ تیرے گھوڑے کی سموں کے نشان ہی ہم پر پڑ جائیں۔

تمکین ما ز چرخ سبکسر بباد رفت
خوش دستگاہ انجمن انجمیم ما

ہماری عظمت اس بے وقار آسمان کے ہاتھوں برباد ہوگئی ورنہ ہم تو ستاروں کی انجمن کا سرمایہ تھے۔

مردم بکینہ، تشنۂ خونِ ہم اند و بس
خون می خوریم چون ہم ازین مردمیم ما

لوگ کینہ ورزی سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور بس۔ اور ہم یہ دیکھ کر اپنا خون پی رہے ہیں کہ ہم بھی انہی لوگوں میں سے ہیں، یعنی ان لوگوں کے کردار نے ہمیں بھی ذلیل کردیا ہے۔

ازحد گزشت شملہ و دستار و ریش شیخ
حیران این درازیِ یال و دمیم ما

لغت: ''یال'' گھوڑے کی گردن کے بال۔

شیخ کی دستار، شملہ اور داڑھی حد سے بڑھ گئی ہے ہم اس کی گردن کے بال اور دم کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں۔ یہ شعر تمسخر آمیز ہے۔

دستت ز ما بشوی مسیحا کہ زیر خاک
آب از تفِ نہیب صدائی قُمیم ما

اے مسیحا! تو اپنا ہاتھ ہم سے اٹھالے (اور یہ قم قم کہنا چھوڑ دے) کیونکہ ہم قبر میں پڑے تیرے قم کی آواز کی ہیبت کی گرمی سے پانی پانی ہورہے ہیں۔

یعنی مسیحا ہمیں بڑی گرمجوشی سے قم کہہ کر بیدار اور زندہ کرنا چاہتا ہے اور ہم اس آوازِ قم کی بے اثری سے شرمندہ ہیں اور پانی پانی ہورہے ہیں۔

پنہان بہ عالم ایم، زبس عینِ عالمیم
چون قطرہ در روانیِ دریا گُمیم ما

ہم اس کائنات میں گم ہیں کیونکہ ہم خود کائنات ہیں۔ جس طرح قطرہ سمندر میں گم ہوتا ہے کہ وہ خود سمندر ہے۔

مارا مدد ز فیضِ ظہوری است در سخن
چون جامِ بادہ، راتبہ خوارِ خُمیم ما

ہم شاعری میں ظہوری سے فیض یاب ہیں۔ ہم جام شراب کی طرح خم کے وظیفہ خوار ہیں۔ ظہوری اُن چند فارسی شعراء میں سے تھا جن سے غالب کو بطور شاعر عقیدت تھی۔ چنانچہ اس کا ذکر وہ اکثر جگہ اپنے کلام میں کرتا ہے۔

غالب ز ہند نیست نوائی کہ می کشم
گوئی ز اصفہان و ہرات و قُمیم ما

غالب یہ نوائے شعر، ہند کی نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اصفہان و ہرات اور قم کی سرزمین کے رہنے والے ہیں۔

یہ تینوں شہر، ایران کے مشہور شہروں میں سے ہیں اور مختلف ادوار میں ایرانی سلطنتوں کے پایہ تخت اور ادبی مرکز رہے ہیں۔

❁❁❁

غزل نمبر (۲۲)

بہ بیم افگندہ مَی را چارۂ رنجِ خُمارِ ما
قدح بر خویش می لرزد، ز دستِ رعشہ دارِ ما

ہم نے اپنے خمار کی تکلیف کو دور کرنے کے لیے جو چارہ کیا ہے (اور وہ شراب نوشی ہے) اس سے شراب خطرے میں پڑ گئی ہے۔ (خمار کے باعث) ہمارے لرزتے ہوئے ہاتھ سے جامِ مے خود بخود لرز رہا ہے۔

خوشا جانی کہ اندوهی فرو گیرد سراپایش
ز نومیدی توان پرسید لطفِ انتظارِ ما

سادہ ترجمہ:۔
کتنی خوش نصیب ہے وہ روح جس میں غم سرتاپا سما گیا ہو۔ ناامیدی سے پوچھا جاسکتا ہے کہ ہمارے انتظار میں کتنا لطف ہے۔

مرزا غالب کا تصورِ غم بہت صحت مندانہ ہے۔ انتہائے غم کی کیفیت انسان کو فراغت بخشی ہے اور سکون عطا کرتی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ جب روح انتہائی غم میں ڈوب جائے اور مایوسی کا عالم طاری ہو تو انسان کسی کے آنے اور نہ آنے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس وقت انتظار بذاتِ خود ایک پُرلطف تجربہ بن جاتا ہے جو ناامیدی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

نشستن بر سرِ راہِ تحیر عالمی دارد
کہ ہر کس می رود از خویش میگردد دو چارِ ما

لغت:۔ "راہ تحیر" مقام حیرت ہے جہاں انسان یکسر کھو جاتا ہے اور اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

"از خویش رفتن" اپنے آپ سے بیگانہ ہو جانا۔ بے خود ہو جانا۔ ہم راہ حیرت میں بیٹھے ہیں اور اس عالم میں ہونا بھی عجیب کیفیت رکھتا ہے۔ جو شخص بھی اپنے آپ سے بیگانہ ہو کر یہاں سے گزرتا ہے اس کی ہم سے ضرور ملاقات ہو جاتی ہے۔

تمام دردمند لوگ باطنی طور پر ایک دوسرے کے آشنا ہوتے ہیں۔

چون بوی گل جنون تازیم از مستی، چہ می پرسی
گسستن دارد از صد جا عنانِ اختیارِ ما

لغت:۔ "جنوں تاز" وحشت جنوں میں آزادانہ گھومنے والا۔ "گسستن دارد" ٹوٹنے کی حالت میں ہے (اب ٹوٹی کہ ٹوٹی) لگام جب پرانی اور فرسودہ یا کمزور ہو اور جگہ جگہ سے ٹوٹنے والی ہو تو اس سے گھوڑے روک تھام نہیں ہوسکتی۔ ایسی لگام نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ گھوڑا جس طرف چاہے بے دھڑک جاسکتا ہے۔ اس استعارے کے ذریعے مرزا غالب اپنی مستی عشق کا ذکر

کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم مستی عشق میں بوئے گل کی طرح آزادانہ جس طرف چاہیں چلے جاتے ہیں۔ ہماری عنان اختیار تو سوجگہ سے ٹوٹنے والی ہے، یعنی ایک بے اختیاری کا عالم طاری ہے۔ عشق کی سرمستی جدھر چاہتی ہے ہمیں کشاں کشاں لیے جا رہی ہے۔

فروز دھر قدر رنگ گل افزاید تب و تابش

کباب آتشِ خویش است پنداری بھار ما

جس قدر پھول کا رنگ نکھرتا جاتا ہے، اسی قدر اس کی تب و تاب بڑھتی جاتی ہے، یعنی اس کا اپنا رنگ اس کے اندرونی سوز کا سامان ہوتا ہے۔ ہماری بہار گویا اپنی آگ ہی میں جل رہی ہے۔

یعنی ہمارا سوزِ دل کسی خارجی شے کا شرمندۂ احساس نہیں۔

حریفان شورشِ عشقِ ترا بی پردہ دیدندی

بدامان گر نہ گشتی موسمِ گل پردہ دارِ ما

لغت:۔''حریفاں'' یار لوگ۔ اگر موسم گل اپنے دامن سے ہماری پردہ پوشی نہ کرتا تو یار لوگ تیرے عشق کی پیدا کردہ وحشت کو بے پردہ دیکھ لیتے۔ یعنی پھولوں کا موسم تھا اس لیے لوگوں نے ہماری وحشت کو بہار کی طرف منسوب کیا ورنہ لوگ سمجھ جاتے کہ ہماری دیوانگی تیری محبت کی وجہ سے ہے۔ مرزا غالب نے یہی بات ایک اردو شعر میں کس سادگی اور خوبصورتی سے بیان کی ہے:

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل

کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے

هنوز از مستیِ چشمِ تو می بالد تماشای

بموجِ بادہ ماند پرتوِ شمعِ مزارِ ما

یہ ابھی تک تیری آنکھوں کی مستی سے سرشار ہے (پھولی نہیں سماتی) دیکھ کہ ہماری شمع مزار کی لو موج شراب معلوم ہوتی ہے۔ یعنی تیری مست آنکھوں سے شمع مزار کی سی افسردہ شے جگمگا اٹھی ہے۔

گویا مزار پر محبوب کی آمد نے رونق کا سا پیدا کر دیا ہے۔

بدین تمکین حریف دستبرد نالہ نتوان شد

بود سنگ فلاخن مر صدا را کوھسار ما

لغت: ''فلاخن'' پتھر پھینکنے کا ایک آلہ جسے اردو میں گوپھن یا گوپھیا کہتے ہیں۔ انجیل عتیق کے حصہ زبور میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد گوپھیا چلانے کے بڑے دھنی تھے۔ سنگ فلاخن وہ پتھر ہے جو فلاخن میں رکھ کر پھینکا جاتا ہے۔

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہم انتہائی متانت اور تمکنت کے باوجود فریاد کو ضبط نہیں کر سکتے، چنانچہ اس بات کو یوں بیان کیا کہ اس متانت کے ساتھ ہم نالہ و فریاد کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس نالہ و شیون کے آگے تو ہماری پہاڑ جیسی تمکین و متانت ایسی ہے جسے فلاخن (یعنی گوپھیا) اٹھا کے دور پھینک دیتا ہے۔

خوشا آوارگی گر در نورد شوق بربندد

بتار دامنی شیرازۂ مشت غبار ما

محبوب کی آوارگی بھی کتنی اچھی ہے اگر وہ اپنے سفر شوق کو طے کرتے وقت، اپنے دامن

کے تار سے ہمارے مٹھی بھر غبار کی شیرازہ بندی بھی کرتا جائے۔ یعنی محبوب جب آوارۂ خرام بن کر نکلے تو ہماری خاک پر اپنے دامن کو جھٹکتا ہوا جائے اور جو مٹھی بھر غبار ہماری تربت سے اٹھے، اسے اپنے دامن کی لپیٹ میں لے کر آگے بڑھے، ہمارے لیے یہی بہت بڑی سعادت ہوگی۔

بدین یک آسمان دردانہ می بینی، نمی بینی

کہ ماہ نو شد از سودن کفِ گوھر شمارِ ما

اس آسمان میں موتی دانوں (ستاروں) پر تیری نظر پڑی ہے اور تو یہ نہیں دیکھتا کہ ہمارا موتی گننے والا ہاتھ کس طرح گھس گھس کر نئے چاند کی طرح لاغر اور خمیدہ ہو گیا ہے۔

یعنی محبوب کی نظر تاروں بھرے آسمان میں الجھی ہوئی ہے اور وہ عاشقوں کی اختر شماری سے بے خبر ہے۔

نھالِ شمع را بالیدن از کاھیدن است اینجا

گداز جوھر ھستی است غالب آبیار ما

لغت: ''نہال شمع'' اس سے مراد ابھرا ہوا شعلۂ شمع ہے۔

''آبیار'' آبیاری کرنے والا۔

نہال شمع کا پھلنا پھولنا اس کے کم ہونے سے ہوتا ہے۔ اے غالب زندگی! زندگی کے جوہر گداز ہو کر ہماری آبیاری کرتے ہیں۔ جس طرح شمع گھلتی ہے تو اس کے گھلنے سے اس کی زندگی فروغ پاتی ہے اسی طرح انسانی زندگی کے گھٹنے ہی سے زندگی کی نشو ونما ہوتی ہے۔ میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی۔

❀❀❀
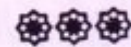
غزل نمبر(۲۳)

بپایانِ محبت یاد می آرم زمانی را

کہ دل عھد وفا نا بستہ دادم دلستانی را

مرزا غالب اس شعر میں اپنی نادانی محبت پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں: اب جبکہ معاملات محبت انتہا کو پہنچ چکے ہیں اور محبوب کی بے وفائیاں اور اس کے جور و ستم کی کوئی حد نہیں رہی، مجھے ابتدائے محبت کا زمانہ یاد آرہا ہے کہ میں نے اس وقت محبوب سے کوئی پیمان وفا باندھے بغیر دل کیوں دے دیا تھا۔

عاشق کی نادانی یہ نہیں کہ اس نے دل دینے سے پہلے محبوب سے وفا کی کوئی شرط کیوں نہیں باندھی، کیونکہ دل دینا اختیاری بات نہیں۔ بلکہ ایسا سوچنا ہی نادانی اور حماقت ہے کہ اگر پیمان وفا باندھا بھی ہوتا تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا۔

فسونی کو کہ بر حال غریبی دل بدر آرد

بداندیشی باندوہ عزیزان شادمانی را

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں ''بداندیشے بہ اندوہ عزیزاں شادماں'' سے مراد ایسا بداندیش شخص ہے جو عزیزوں کے غم پر خوش ہوتا ہو۔ یہ ساری عبارت محبوب کی صفت ہے۔ اس شعر کے آخر میں ''را'' کا لفظ جو بطور ردیف آیا ہے۔ اضافی یعنی اضافت کا مفہوم دیتا ہے۔ یعنی دل بداندیش۔

کوئی ایسا فسوں ہے کہ جسے عزیزوں کے غم پر خوش ہونے والے بداندیش انسان کے دل پر پھونکا جائے تاکہ وہ کسی غریب کے حال کو دیکھ کر درد سے بھر آئے۔

اجازت داد پیشش یک دو حرف از درد دل گفتم
پس از دیری کہ بر خود عرضہ دادم داستانی را

ایک طویل مدت تک میں اپنی داستان اپنے آپ ہی سے کہتا رہا اور اس کے بعد اس نے مجھے صرف اتنی اجازت دی کہ اپنے دردِ دل کی دو ایک باتیں اس سے کہوں۔

جہان ہیچ است باوی لاجرم زینہا چہ اندیشد
گرفتم کز فغانم دل زہم پاشد جہانی را

لغت: ''دل زہم پاشد'' یعنی دل ٹوٹ جائے اور اس کے ٹکڑے ایک دوسرے سے الگ ہو کر بکھر جائیں۔

'جہانے'' میں ''ے'' کثرت کا مفہوم دے رہا ہے۔ مراد ہے ایک دنیا، دنیا بھر پہلے مصرعے میں ''جہاں'' کا لفظ جہاں والوں کے لیے آیا ہے۔ اسی لیے شاعر نے ان کے لیے ضمیر جمع استعمال کیا ہے۔ اور ''زینہا'' کہا ہے یعنی ان سے یا ''دنیا والوں سے'' شاعر کہتا ہے کہ میں نے مان لیا کہ میری فریاد سے ایک دنیا کا دل درہم برہم ہو جائے گا لیکن میرے محبوب کی نظر میں جہاں یا جہاں والوں کی حیثیت ہیچ ہے۔ وہ انھیں کچھ نہیں سمجھتا، اس لیے وہ اُن سے کیا گھبرائے گا۔

میری فریاد سے دنیا والوں کے دل لرز جائیں تو لرز جائیں ان کے دل پر تو کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ندارم تاب ضبط راز و می ترسم ز رُسوائی
مگر جویم ز بہر ہمزبانی، بی زبانی را

مجھ میں راز کو ضبط کرنے کی تاب نہین اور ڈرتا ہوں کہ بات کروں گا تو رسوا ہو جاؤں گا۔ البتہ ایک صورت ہے کہ کوئی ایسا شخص مل جائے جسے اپنا ہمزبان بنالوں اور بے زبان ہو کر باتیں سنتا چلا جائے اور کسی سے نہ کہہ سکے۔

کشاد شستش از ستی ندارد دلنشین تیری
مگر بر من گمارد آسمان زورین کمانی را

لغت: ''کشاد شست'' نشانے کے لیے کمان میں تیر کو رکھ کر اسے کھینچنا۔ ''زوریں کمان'' ایسا تیر انداز جس کی کمان میں زور ہو۔

محبوب ایک ست سا (بے پرواسا) تیر انداز ہے وہ ایسا نشانہ نہیں لگاتا کہ سیدھا دل پر جا کر لگے۔ ہاں آسمان ہی کوئی سخت کماں انسان تلاش کر کے مجھ پر تیر اندازی کو نے کے لیے مقرر کر سکتا ہے۔

بیا در گلشنِ بختم کہ در ہر گوشہ بنمائیم
ز جوشِ لالہ و گل در حنا پای خزانی را

لغت: ''پا در حنا بودن'' پاؤں میں مہندی لگا کے بیٹھنا۔ خزاں بہار کی ضد ہے بہار رنگین پھولوں سے لدی ہوتی ہے اور خزاں ان رنگینیوں سے عاری ہوتی ہے۔ شاعر کے گلشن بخت میں بہار نہیں۔ خزاں ہے۔

بہار کے آنے تک خزاں گویا لالہ و گل کے نمودار ہونے کے جوش کو سینے میں لیے پڑی رہتی ہے، ایسے ہی جیسے کوئی حسینہ پاؤں میں مہندی لگائے پڑی ہو کہ کچھ وقت کے بعد حنا کا رنگ نکھرے گا۔

اس پس منظر میں مرزا غالب فرماتے ہیں کہ میرے گلشن بخت میں ،خزاں لالہ وگل کو اس طرح لیے ہوئے بیٹھی ہے جس طرح کوئی حسینہ پاؤں میں حنا باندھے پڑی ہو ،یعنی میرے گلشن کی زینت بہار میں ہے خزاں ہے اور میں اسی کو سامان رنگینی بنائے ہوئے ہوں اور اس امید میں ہوں کہ کبھی تو بہار آئے گی۔

کمال دردِ دل اصل است در ترکیب انسانی
بخون آغشتہ اند، اندر بُن ہر موی جانی را

انسان کی زندگی کی ترکیب اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں انتہائی دردِ دل بنیادی شے ہے۔ چنانچہ انسان کے ہر بن مو میں ایک ایسی جان پوشیدہ ہے جو خون سے لت پت ہے۔ انسانیت کا کمال یہ ہے کہ اس میں انتہائی احساس درد ہو اور اس احساس درد کا یہ عالم ہو کہ جیسے ہر بن مو میں ایک (نئی) جان ہے جو خون میں پڑی تڑپ رہی ہے۔

خورم خوف از تو بی حد، لیکن از زاری چہ کم گردد
اگر شد زہرہ آب و بُرد اجزای فغانی را

میں تجھ سے بے حد خوف زدہ ہوں۔ لیکن میری اس حالت زار سے کیا کمی واقع ہو سکتی ہے کہ خوف سے پتا پانی ہو جاتا ہے اور اس میں میری فریاد کے تمام اجزا بہہ جاتے ہیں۔ یعنی اس خوف کے عالم میں فریاد بھی لب پر نہیں آسکتی۔

بہ شہر از دوست بعد از روزگار یافتم غالب
ز عنوان خطی کز راہ دور آمد نشانی را

اے غالب! ایک طویل عرصے کے بعد مجھے شہر میں دوست کا نشان، ایک ایسے خط کے عنوان سے مل گیا جو بہت دور سے آیا تھا۔

❀❀❀

غزل نمبر (۲۴)

از تست اگر ساختۂ پرداختۂ ما
کفری نبود مطلب بی ساختۂ ما

لغت: ''ساختہ پرداختہ'' دو مختلف لفظوں کا مرکب ہے اور ایک مفہوم دیتا ہے۔ ''ساختہ'' اور ''پرداختہ'' دونوں ضدیں ہیں، یعنی دونوں کے دو دو معنی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

''ساختہ'' کے ایک معنی بناوٹی ہیں اور دوسرے آراستہ اور آمادہ۔ اسی طرح پرداختہ کا ایک مفہوم فارغ شدہ اور دوسرا مشغول شدہ موخرالذکر مفہوم سے کنایۃً آراستہ اور پیراستہ کے معنی لیے جاتے ہیں۔ شعر میں شاعر نے ساختہ کو مجہول اور پرداختہ کو آراستہ کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، مراد' برا بھلا۔

کہتا ہے کہ اگر ہمارا برا بھلا جو کچھ ہے وہ تیری بدولت ہے۔ تو اگر ہم کسی غلط چیز کا تجھ سے مطالبہ کریں تو وہ کفر کی بات نہیں ہوگی۔

پروردۂ نازیم بہ رحمت کدۂ عجز

بر پای تو باشد سر افراختۂ ما

عاجزوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اربابِ عجز گویا رحمت کدۂ عجز میں رہتے ہیں اور اپنے عجز پر ناز کرتے ہیں۔ شاعر نے ایسے لوگوں کو رحمت کدۂ عجز کے ناز پروردہ کہا ہے۔

کہتا ہے کہ ہم رحمت کدۂ عجز کے ناز پروردہ ہیں اور اس سے ہمارا سر بلند ہے اور ہماری سربلندی کی وجہ یہی ہے کہ ہمارا سر تیرے پاؤں میں پڑا ہے۔

در عشق تو بر ماست دیت اہلِ نظر را

ابروی تو تیغی بخیال آختۂ ما

لغت:۔ ''دیت'' خوں بہا۔ ''تیغ آختہ'' کھنچی ہوئی تلوار۔

تیرا ابرو ہمارے تصور میں ایک کھنچی ہوئی تلوار کی طرح ہے جس سے سب اہلِ نظر کا خون ہو رہا ہے۔ اس تصور کے باعث ان سب کا خون ہمارے سر ہے اور اُن کا خوں بہا ہم پہ واجب ہو گیا ہے۔

حیرانیِ ما آئنۂ شہرتِ یار است

شد جادہ بہ کویش نفسِ باختۂ ما

لغت: ''نفس باختہ'' حیرانی کے باعث اکھڑا ہوا سانس۔ ہماری حیرانی شہرت یار کا باعث (آئینہ) بن گئی ہے۔ ہمارا اکھڑا ہوا سانس اس کے کوچے میں پگڈنڈی ہو گیا ہے۔

جس طرح پگڈنڈی ہر رہرو کو راستے کی نشاندہی کرتی ہے اسی طرح عاشق کی حیرانی

سے لوگ اس کے محبوب کی دل آویزیِ حسن کا سراغ لگا کر ادھر کو چل پڑتے ہیں جس سے اس کی شہرت ہو رہی ہے۔

غالب مَدمَ افسونِ اقامت کہ بلائی است

دیوانۂ از بند برون تاختۂ ما

جب کسی دیوانے کا جوش جنوں حد سے بڑھ جائے تو اسے زنجیریں پہنا کر قید کر لیتے ہیں تاکہ وہ ایک جگہ ٹھہرا رہے۔ لیکن جب وہی دیوانہ زنجیریں تڑا کر بھاگ نکلے تو اسے کسی بھی تدبیر سے قابو نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا غالب فرماتے ہیں: اے غالب! ہمارے دیوانے کو، جو اپنے آپ کو قید و بند سے آزاد کرا کے بھاگ نکلا ہے، کسی افسون و سحر سے مقید کر کے ایک جگہ مقیم نہیں کیا جا سکتا۔

❀❀❀

غزل نمبر (۲۵)

خوش وقت اسیری کہ بر آمد ہوس ما

شد روزِ نخستین سبدِ گل، قفسِ ما

لغت: ''سبد گل'' پھولوں کی ٹوکری۔ رواج تھا کہ جب کسی کو پھولوں کا تحفہ پیش کرنا ہوتا تو پھولوں کو ٹوکری میں سجا کر لے جاتے تھے۔ (سب سے خوش رنگ پھول کو ٹوکری کے اوپر رکھتے تھے جو ''گل سر سبد'' کہلاتا تھا۔)

مرزا غالب کے اس شعر کا پس منظر ہبوطِ آدم ہے، جب وہ فردوس سے نکل کر اس عالم رنگ و بو میں آ گیا اور اس کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ انسان کی ہوس اس کو یہاں لے آئی۔

حافظ کہتا ہے:

من ملک بودم وفردوسِ برین جایم بود
آدم آورد درین دیرِ خراب آبادم

مرزا کہتے ہیں:

ہماری اسیری کا وقت بھی کیا اچھا تھا جب ہوس بروے کار آئی اور پہلے ہی دن پھولوں کی ٹوکری ہمارا قفس بن کر رہ گئی۔ اس شعر کو پڑھ کر ذہن مرزا صاحب کے اس شعر کی طرف جاتا ہے:

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

مہتاب نمکسار بود بادۂ ما را
ای بی مزہ بی روی تو بزمِ ہوس ما

چاندنی ہماری شراب کے لیے طشت نمک کا کام دیتی ہے۔ تیرے حسین چہرے کے بغیر ہماری بزم نشاط بے مزہ رہتی ہے۔

گویا محبوب کا درخشاں چہرہ چاندنی رات ہے جو عاشق کی بزم مے نوشی کو چمکا دیتا ہے۔

حیرت زدۂ جلوۂ نیرنگ خیالیم
آئینہ مدارید بہ پیشِ نفسِ ما

آئینے کے سامنے سانس لیں تو وہ سانس سے مکدر ہو جاتا ہے۔ آئینے کو شعراء حیران یا حیرت زدہ بھی باندھتے ہیں اس لیے کہ وہ گویا ٹکٹکی باندھے ہمیں دیکھ رہا ہوتا ہے۔

کہتا ہے کہ ہم خیال کی نیرنگیوں کے جلووں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو کر رہ گئے ہیں یعنی ان جلووں میں کھو گئے۔

آوازۂ شرع از سر منصور بلند است
از شب روی ماست شکوہ عسس ما

لغت: ''شب روی'' چوری کے لیے راتوں کو پھرنا اسی لیے ''شب رو'' کے الفاظ چور کے لیے آتے ہیں۔

''آوازہ'' بمعنی شہرت۔

منصور نے ''انا الحق'' کہا اور شرع کی رو سے انھیں دار پہ کھینچا گیا۔ گویا منصور اور اس کے جرم سے شریعت کی شان بلند ہوئی تھی۔

''عسس'' کوتوال کو کہتے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ ہماری ''شب روی'' یعنی ارتکاب جرم عسس کی شان و شوکت کو قائم کرتا ہے۔ دیکھو منصور ہی کی بدولت شریعت کی شان بلند ہوئی تھی۔

وقت است کہ خون جگر از درد بجوشد
چندان کہ چکد از مژۂ داد رسِ ما

وہ وقت آن پہنچا ہے کہ ہمارا خونِ جگر درد سے اس قدر جوش میں آ جائے کہ ہمارے داد رس کی پلکوں سے ٹپکنے لگے۔

در دھر فرورفتۂ لذت نتوان بود

بر قند، نہ بر شھد نشیند مگس ما

لغت: ''مگس'' = مکھی ہے۔ ''فرورفتہ لذت'' = لذت میں غرق۔

مکھی ہر میٹھی چیز پر بیٹھی ہے۔ لیکن جو مکھی شہد پر بیٹھتی ہے وہ وہیں کی ہو رہتی ہے۔ یہ گویا لذت میں ڈوب جانا ہے زندگی سے لذت اندوز ہونا اور ہے اور لذتوں میں غرق ہو کر وہیں کا ہو رہنا اور بات ہے۔

کہتا ہے کہ ہم سے دنیا کی لذتوں میں غرق نہیں ہوا جاتا۔ ہماری مکھی قند، یعنی مصری کی ڈلی پر بیٹھتی ہے، شہد پر نہیں بیٹھتی۔

قند پر بیٹھنے والی مکھی مٹھاس چوستی ہے اور جب چاہتی ہے اڑ جاتی ہے۔ برعکس اس کے، شہد پر بیٹھنے والی مکھی شہد ہی میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔

غالب ہی کا ایک مطلع ہے:

اگر بدل نہ خلد ھر چہ از نظر گذرد

خوشا روانی عمری کہ در سفر گذرد

ای بی خبر از نیستی و ذوق فراغش

در پیرھنِ ما نبود دخار و خسِ ما

لغت: ''فراغ'' سکون قلب ''فراغش'' میں ضمیر ''ش'' کا مرجع نیستی ہے۔

''خار وخس'' جس کا لفظ جب خاشاک کے ساتھ آتا ہے تو اس سے کوڑا کرکٹ مراد لیتے ہیں اور خار کے ساتھ آئے تو کانٹے اور تنکے مراد ہوتے ہیں۔ ''خار خار'' فارسی میں تفکر اور اندیشہ کا مفہوم دیتا ہے۔ یہاں مرزا غالب نے خار وخس کو خار خار کا ہم معنی استعمال کیا ہے اور

یہ مفہوم فراغ کی ضد ہے۔

صوفیہ کے نزدیک نیستی، خودی کے احساس سے یکسر عاری ہو جانا ہے۔ اس سے روح کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ''ہستی'' انسان کے صب کو بے قرار رکھتی ہے جیسے پیراہن میں کوئی کانٹا ہو اور پیہم خلش کا باعث ہو۔ شاعر کہتا ہے کہ تو نیستی اور اس سے حاصل ہونے والے سکون قلب سے بے خبر ہے۔ ہمیں دیکھ کہ ہمارے پیرہن میں ایسا کوئی کانٹا نہیں۔

طول سفر شوق چہ پرسی کہ درین راہ

چون گرد فرو ریخت صدا، از جرس ما

لغت: ''چہ پرسی'' میں چہ، استفہام انکاری ہے، یعنی تو کیا پوچھتا ہے! مطلب ہے مت پوچھ۔

سفر شوق کہیں ختم نہیں ہوتا۔ ایک منزل کے بعد دوسری منزل سامنے آتی ہے۔ اور دوسری کے بعد تیسری ابھر آتی ہے اور اس طرح سے سفر کی درازی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے

مری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اس سفر شوق کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ راہ ومنزل یہاں تک کہ جرس کی آواز تک سنائی نہیں دیتی۔ شاعر نے اس ساری کیفیت کو یوں بیان کیا: سفر شوق کی درازی کے بارے میں مت پوچھ۔ اس سفر میں تو گھنٹی کی آواز، جرس سے یوں جھڑ گئی ہے، جس طرح گرد کسی شے سے جھڑ جاتی ہے۔

حوران بھشتی کہ ندارند گلابی

بر خویش فشانند گدازِ نفسِ ما

لغت: ''گدازِ نفس'' سانس کے حرارتِ قلب سے پگھل جانے کو گدازِ نفس کہا گیا ہے اور وہ سانس چونکہ شاعر کا سانس ہے اس لیے معطر بھی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ حورانِ بہشتی کے پاس گلاب نہیں اس لیے میرے سانس کے گداز کو بطور عطر کے استعمال کرتی ہیں۔شعر میں صرف تعلّی ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۲۶)

شکستِ رنگ تا رسوا نہ سازد بی قراران را
جگر خون است از بیم نگاهت رازداران را

لغت: ''بے قراراں'' = عاشقانِ بیقرار۔ ''شکست رنگ'' = چہرے کا رنگ اڑنا۔

حسن سے متاثر ہو کر عاشقانِ بے قرار کے چہروں کا رنگ اڑا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ اس راز سے واقف ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں وہ راز کو فاش نہ کر دیں اور عاشقوں کے رنگ شکستہ کی وجہ بیان نہ کر دیں معشوق گھور گھور کر انھیں دیکھ رہا ہے اور وہ بے چارے اس کی نگاہ خشم آلود سے دبے ہوئے ضبط کیے بیٹھے ہیں اور اس ضبط کا یہ عالم ہے کہ ان کا جگر خون ہو رہا ہے۔

ز پیکان های ناوک در دلِ گرمم نشان نَبوَد
بہ ریگستان چہ جوئی قطره های آبِ باران را

''پیکاں'' تیر کی انی کو کہتے ہیں۔ ''دل گرم'' وہ دل ہے جس میں سوز محبت ہو۔ شاعر

نے تیر کے چمکتے ہوئے پیکاں کو بارش کے قطرے اور اپنے دل گرم کو ریگستان کہا ہے اور یہ دونوں نادر استعارے ہیں۔

کہتا ہے کہ تیرے تیر کے پیکاں کا میرے دل گرم میں کوئی نشاں نہیں ملتا۔ میرے قلب کی حرارت سے تو ان کا وہی حشر ہوتا ہے جو تپتے ہوئے ریگستان میں بارش کے قطروں کا ہوتا ہے۔

بود پیوستہ پشتِ صبر کوه از گراں جانی
چہ افسوں خواندۂ درگوش دل امیدواراں را

لغت: ''پشت بر کوه بودن''۔ بہت بڑا سہارا لیے ہوئے ہونا۔ ''گراں جانی'' سخت جانی۔ لیکن گراں کے معنی صرف سخت اور ٹھوس ہی کے نہیں۔ بلکہ گراں، قیمتی اور بھاری کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مرزا غالب نے، محبت میں صبر کرنے اور امیدیں لگائے رکھنے والوں کو ''گراں جاں'' کہا ہے جو بے حد بلیغ بات ہے۔ یہ لوگ بھاری بھر کم ہیں انھیں محبت ہے ناز ہے ،صبر ان کی پشت پناہ ہے اور وہ امیدوں پہ جیے جا رہے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ تو نے امیدواروں کے گوش دل میں کیا افسوں پھونک دیا ہے کہ اپنی گراں جانی سے صبر کیے ہوئے ہیں اور یہ ایک ایسا سہارا ہے جیسے کوئی پہاڑ سے پیٹھ لگائے ہوئے بیٹھا ہو۔

مرزا غالب کے حسب ذیل شعروں میں بھی اسی جذبے کا اظہار پایا جاتا ہے:

پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا
افسون انتظار، تمنا کہیں جسے

دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد
در انتظارِ هما دام چیدنم بنگر

کفِ خاکیم از ما برنخیزد جز غبار آن جا

فزون از صرصری نبود قیامت خاکساران را

اس شعر کی ردیف ''را'' برائے کا مفہوم دیتی ہے۔ قیامت کے دن مردے جی اٹھیں گے اور ہر شے میں ایک جان تازہ آ جائے گی۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ ہم تو مٹھی بھر خاک ہیں، قیامت آ گئی تو کیا ہوگا۔ ہمارے لیے تو قیامت ایک صرصر یعنی تند ہوا کا جھونکا ہے۔ جو آئے گا اور ہماری مٹھی بھر خاک کو غبار کی صورت میں اڑا دے گا اس کے سوا اور کیا ہوگا۔

بہ ترکِ جاہ گو تا گردشِ ایام بر خیزد

کہ گلخن تاب دائم در نظر دارد بہاران را

لغت: ''گلخن''۔ آتشدان اور ''گلخن تاب'' حمام گرم کرنے والے (یعنی حمامی) کو کہتے ہیں۔ ترجمہ: گردشِ ایام سے کہہ دے کہ وہ ترک جاہ کرے کیونکہ حمام والا ہمیشہ بہار ہی کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔

در آبی خود بہ بازی گاہ اہلِ حسن تا بینی

بروی شعلہ، گرمِ مشقِ جولان، نَی سواران را

لغت: ''نے سوار'' بچے جو چھڑی کو گھوڑا بنا کر سواری کرتے ہیں، ایسے بچوں کو ''نے سوار'' کہتے ہیں، مراد معصوم، کم سن بچے ''جولان'' = اچھلتے کودتے تیز تیز چلنا۔ ''بازی گاہ'' کھیل کود کی جگہ۔

اہلِ حسن کے تیور بچپن ہی سے تیکھے ہوتے ہیں۔ ان کے معصومانہ مشاغل میں بھی بلا کی شوخیاں ہوتی ہیں جنھیں شاعر نے یوں بیان کیا ہے کہ وہ گویا شعلوں سے کھیلتے ہیں۔ کہتا ہے: ذرا

بے خودی کے عالم میں، اہلِ حسن کی بزم ادا و ناز میں آ اور دیکھ کہ وہاں معصوم حسن کیسے شعلوں پہ رقص کر رہا ہوتا ہے۔

''نے سوار'' کا لفظ شعر میں بہت موزوں آیا ہے۔ شعلوں سے کھیلنا ''نے سوار'' یعنی معصوم بچے ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ''بے خود'' کا لفظ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ حسن کی سرمستیوں کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان پر خود بھی بے خودی کی کیفیت طاری ہو۔

نگشت از سجدۂ حق جبہۂ زہاد نورانی

چنان کافروخت تاب بادہ روی بادہ خواراں را

لغت: ''زہاد'' زاہد کی جمع ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حق پرستوں کے چہرے ایمان کے نور سے چمک اٹھتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ زاہدوں کی پیشانیاں اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ ریز ہونے سے اتنی نورانی نہیں ہوتیں جس قدر میخواروں کے چہرے شراب سے تابناک ہو جاتے ہیں۔ اس شعر میں ظاہر پرست زاہدوں پر طنز کی گئی ہے۔

دریغ آگاہی کافسردگی گردد سر و برگش

زمستی بہرہ جز غفلت نہ باشد ہوشیاراں را

لغت: ''سر و برگ'' ساز و سامان، سرمایہ۔ شاعر ''آگاہی'' کا لفظ علمی بصیرت کے لیے لایا ہے اور ذی علم حضرات کو ''ہوشیاراں'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔

صحیح علم اور آگاہی سے صرف بصیرت ہی نہیں بلکہ قلب کی روشنی بھی حاصل ہوتی ہے۔ ایسی آگاہی کو عرفان کہتے ہیں۔ عرفان ایک ایسی مستی ہے جس سے قلب کے دریچے کھلتے ہیں۔ بر عکس اس کے اہلِ علم کی مستی محض بیہوشی ہے جس کا نتیجہ غفلت ہے۔

کہتا ہے: افسوس ہے اس آگاہی پر جو افسردگی کا باعث بن جائے۔ صاحب ہوش لوگوں کی مستی محض بیہوشی ہوتی ہے۔ ان کے علم کا نشہ انہیں اپنے آپ سے غافل بنا سکتا ہے۔ روحانی کیفیت عطا نہیں کر سکتا۔

ز غیرت میگدازد در خجالت گاہ تاثیرم

زبون دیدن بدستِ شیشہ بازان کوھساران را

لغت: ''شیشہ بازاں'' = بازیگر جو شیشہ سر پر رکھ کر ناچتے ہیں۔ کنایۃً دغا اور مکار کو بھی کہتے ہیں۔

شیشہ، پتھر یا چٹان اور پہاڑ کے مقابلے میں بڑی نازک چیز ہے۔ مرزا غالب نے شیشے کی رعایت سے شیشہ بازوں کا لفظ ایسے لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے جو کمزور ہونے کے باوجود اپنی فریب کاریوں سے بڑے بڑے تنومند ٹھوس اور باوقار انسانوں پر غالب آجاتے ہیں اور انھیں عاجز اور زبون حال کر دیتے ہیں۔ مرزا غالب ایسے لوگوں کی حالت زار کا تصور کرتے ہیں اور اس سے اتنا متاثر ہوتے ہیں کہ غیرت سے گداز ہو جاتے ہیں، یعنی پانی پانی ہو جاتے ہیں۔

برنجم غالب از ذوقِ سخن خوش بودی ار بودی

مرا لختی شکیب و پارۂ انصاف یاران را

مرزا غالب کو اپنے ذوقِ سخن کی بلندی پر ناز تھا اور ساتھ ہی وہ اپنے دوستوں اور حریفوں کی کم ذوقی اور ناقدری سے شاکی بھی تھے۔

کہتے ہیں۔ غالب مجھے اپنے ذوقِ سخن سے دکھ ہوتا ہے (کہ قدرت نے مجھے اس قدر

بلند ذوق عطا کیا ہے) کتنا اچھا ہوتا کہ میرے دوستوں میں انصاف کا کچھ مادہ ہوتا اور وہ میرے ہنر کی قدر کرتے، یا پھر مجھ میں ہی تھوڑا سا برداشت اور تحمل کا مادہ زیادہ ہوتا۔

❀❀❀

غزل نمبر (۲۷)

سپردم دوزخ و آن داغھای سینہ تابش را

سرابی بود در رہ تشنۂ برق عتابش را

لغت: ''سراب'' وہ چمکتی ہوئی ریت جو دور سے پانی معلوم ہوتی ہے اور پیاسے مسافر ادھر کو لپکتے ہیں۔

کہتا ہے کہ میں نے دوزخ اور دوزخ کی آگ کے جلا دینے والے شعلوں میں غوطہ لگا کر (طے کر کے) دیکھا جو اس محبوب کی برق عتاب کے شیدائیوں (پیاسوں) کے لیے محض سراب کی حیثیت رکھتے تھے۔

یعنی محبوب کے غصے کی گرمی کے مقابلے میں دوزخ کی آگ ہیچ ہے۔

ز پیدائی حجابِ جلوہ سامان کردنش نازم

کف صھباست گوئی پنبہ مینای شرابش را

لغت: ''پیدائی'' ظاہر ہونا اور ''حجاب'' پیدائی کی ضد یعنی پردہ۔ فلسفہ الٰہیات میں پیدائی اور حجاب، شہود و غیب ہے۔

''کف'' جھاگ کو کہتے ہیں ''کف صہبا'' وہ جھاگ ہے جو جوش مے کے باعث

صراحی مے کے منہ پر ابھر آتا ہے۔

صراحی کے منہ کو روئی سے بند کرتے تھے۔ شاعر کی نظر میں یہ روئی، جو شراب کو چھپانے کے لیے استعمال ہوئی ہے، شراب کا جھاگ معلوم ہوتی ہے یعنی شراب صراحی کے پردے میں چھپنے کے باوجود ظاہر ہوئی جارہی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

حسن نے ظاہر ہو کے بھی ایک حجاب کا انداز اختیار کیا ہے لیکن وہ ایسا حجاب ہے کہ جس سے جلوے ابھر رہے ہیں اور میں حسن کی اس ادا پر نازاں ہوں۔ گویا اس کے مینائے شراب کی روئی کفِ صہبا معلوم ہوتی ہے۔

مرزا غالب نے اپنے اس اردو شعر میں بھی اسی خیال کو ادا کیا ہے۔

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

ندانم تا چہ برقِ فتنہ خواہد ریخت بر ہوشم
تصوّر کردہ ام بکستنِ بندِ نقابش را

محبوب کے حسن کو برملا دیکھنا تو درکنار اس کے بے نقاب چہرے کے تصور سے بھی عاشق کے ہوش جاتے رہتے ہیں۔ اس کیفیت کو شاعر نے برق فتنہ کا نام دیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ میں نے اس کے چہرے کے بند نقاب کو کھولنے کا تصور کیا ہے۔ نہ جانے میرے ہوش پر کیسی برقِ فتنہ آ کر گرے گی۔

دمِ صبحِ بہار این مایہ مدھوشی نمی ارزد
صبا بر مغز دھر افشاند گوئی رخت خوابش را

لغت: "دمِ صبحِ بہار" دم وقت ہے، مراد ہے صبح بہار کی کیفیت۔

کہتا ہے کہ صبح بہار کا وقت تو کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس سے انسان پر مدہوشی طاری ہو جائے یوں **معلوم** ہوتا ہے کہ صبا نے اپنے بستر خواب کو دنیا کے دماغ پر جھاڑ دیا ہے۔ (جس سے دنیا والوں پر نیند کی سی مدہوشی طاری ہوگئی ہے)۔

سوادش داغِ حیرانی، غبارش عرض ویرانی
جہان را دیدم و گردیدم آباد و خرابش را

لغت: "سواد" کے کئی ایک معنی ہیں: سیاہی رنگ، حوالی شہر یا آبادی شہر اور علمی استعداد۔

یہاں مرزا غالب نے اسے آبادی جہاں کے لیے استعمال کیا ہے۔ آبادی کی ضد ویرانی ہے، جس کے لیے شاعر "غبار" کا لفظ لایا ہے۔

"سوادش" اور "غبارش" دونوں میں ش کے ضمیر کا مرجع "جہاں" ہے جو دوسرے مصرعے میں آیا ہے۔

"سواد" کے لفظ کی ذومعنویت کے اعتبار سے مرزا غالب نے سواد جہاں کو داغ حیرانی کہا ہے۔ ویران جگہ سے غبار اٹھتا ہے اس لیے اسے جہاں کی ویرانی کی علامت قرار دیا ہے۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اس جہاں کی آبادی داغ حیرانی ہے۔ اس کا غبار "عرض ویرانی" ہے، یعنی اس غبار سے ویرانی ہی ویرانی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے جہاں کو دیکھا ہے اور اس کے آباد اور ویران دونوں کو لوٹا دیا، یعنی یکسر بدل دیا۔

ز تابِ تشنگی جان را نویدِ آبرو بخشم
کمندِ جذبۂ دریا شناسم موجِ آبش را

لغت: ''تابِ تشنگی'' = پیاس کی تڑپ۔

میں پیاس کی تڑپ سے اپنی جان کو آبرو بخشتا ہوں۔ سمندر کے پانی کی لہریں میری نظروں میں وہ کمند ہیں جس کے ذریعے وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔

کسی شے کی انتہائی خواہش اور اس کے حصول کا بے پناہ جذبہ اور ولولہ انسانی سعی و عمل کا سرچشمہ ہے۔ اس انتہائی خواہش کے لیے شاعر نے تشنگی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اگر راہ روحیات کے دل میں یہ جذبہ موجزن ہو تو منزلِ مقصود خود اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے سمندر کی لہریں پیاسے کے لیے کمند بن جاتی ہیں اور وہ کشاں کشاں ادھر کو جاتا ہے۔

ز من کز بی خودی در وصل رنگ از بوی نشناسم
بهر یک شیوه نازش باز می خواهد جوابش را

لغت: ''ش'' کے ضمیر کا مرجع محبوب ہے۔ ''ہر یک شیوۂ نازش'' = اس کے (یعنی محبوب کے) ناز و ادا کا ہر انداز۔

وصل میں میرا یہ حال ہے کہ میں بے خودی اور محویّت کے عالم میں رنگ اور بو میں امتیاز نہیں کر سکتا اور اُدھر محبوب کے ناز و انداز کی یہ کیفیت ہے کہ وہ مجھ سے اپنے ہر تیور کا جواب طلب کرتا ہے، یعنی محبوب یہ چاہتا ہے کہ میں اُس کی ہر ادا کی داد دوں۔

سوارِ توسنِ ناز است و برخاکم گزر دارد
ببال ای آرزو چندان که دریابی رکابش را

لغت: ''بالیدن'' = پھلنا پھولنا، بڑھنا اور فروغ حاصل کرنا، بال، ''بالیدن'' سے فعل امر ہے۔

محبوب اسبِ ناز پہ سوار ہے اور میری خاک پر سے گزر رہا ہے۔ اے میری آرزو (آرزوے پابوسی) تو اتنی تیز ہو جا کہ بڑھ کر اس کی رکاب کو پالے (اور چوم لے)۔

شکایت نامه گفتم در نوردم روان گردد
همان در راهِ قاصد ریخت رشکم پیچ و تابش را

میں نے شکایت نامہ لکھا، اسے تہ کیا تا کہ روانہ کر دیا جائے۔ وہیں میرے رشک کے جذبے نے اپنا پیچ و تاب، قاصد کی راہ میں ڈال دیا۔

یعنی، محبوب کا خط قاصد کے سپرد کرتے ہوئے مجھے سخت رشک آیا، پھر اسی رشک کا پیچ و تاب حائل ہو گیا اور میں خط نہ بھیج سکا۔

مرزا غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

چون به قاصد بسپرم پیغام را
رشک نگزارد که گویم نام را

ندانم تا چسان از عهدهٔ دردش برون آیم
ز شادی جان بها گفتم متاعِ کم میابش را

لغت: ''از عہدۂ چیزے بروں آمدن'' کسی چیز سے عہدہ برآ ہونا۔

''متاعِ کم میاب'' جو چیز کم مقدار میں نہیں مل سکتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کے دردِ محبت سے کیسے عہدہ برآ ہو سکوں گا۔ میں نے یونہی خوشی کے عالم میں اپنی جان کو اس کے متاعِ درد کی قیمت کہہ دیا، حالانکہ وہ ایسی متاع ہے جو کم مقدار میں دستیاب ہی نہیں ہوتی۔

یعنی دردِ محبت جنسِ کثیر ہے کوئی شخص تھوڑا سا درد مول لینا چاہے تو میسر نہیں آ سکتا۔ میں

نے یونہی اپنی جان دے کر اُسے خریدنا چاہا۔ جان کی دردِ محبت کے سامنے کیا حیثیت ہے۔

ز خوباں جلوہ ، و ز ما بی خودان جان رونما خواهد
خریدار است ز انجم تا بہ شبنم آفتابش را

لغت: ''رونما''۔ وہ تحفہ ہے جو دلھن کے منہ دکھانے پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسے رونمائی بھی کہتے ہیں۔

یہ عام خیال ہے کہ کائنات کی ہر شے حسنِ ازلی کی گرویدہ ہے لیکن مرزا غالب نے اس خیال کو بے حد خوبصورت اور بلیغ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں:
اس کی ذات حسینوں سے جلوہ اور ہم عاشقوں (بے خودوں) سے جان بطور رونمائی طلب کرتی ہے۔ ستاروں سے لے کر شبنم تک ہر شے اس کی خریدار ہے۔
یوں انجم سے کر شبنم تک سے مقصود ہر وہ شے ہے جو آسمان اور زمین پر ہے لیکن شاعر انجم اور شبنم کے الفاظ کو بڑے فنکارانہ انداز میں لایا ہے۔ شبنم کے قطرے پر۔ تو خورشید کے سامنے آ کر فنا ہو جاتے ہیں اور ستارے تو اس کے سامنے آنے کی تاب ہی نہیں لا سکتے۔ یہ شعر جذباتی منظر کشی کی (جسے ہم انگریزی زبان میں Imagery کہتے ہیں)۔ ایک حسین مثال ہے۔

خیالش صیدِ دامِ پیچ و تابِ شوق بود اما
من از مستی غلط کردم بشوخی اضطرابش را

لغت: ''غلط کردن''۔ اشتباہ کردن یعنی کسی چیز کو غلطی سے کچھ اور سمجھ لینا۔ اس کا یعنی میرے محبوب کا خیال میرے جذبہ شوق کی بے تابیوں کے جال میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے محویت کے عالم میں اس اضطراب (یعنی بے تابیوں) کو اپنے شوق کی شوخی سمجھ لیا، یعنی میں دل کے

اضطراب کو جذبہ شوق کا نتیجہ سمجھا، حالانکہ یہ اضطراب اور یہ بے تابیاں محبوب کے خیال یا تصور کا نتیجہ تھیں۔

اس میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ یہ سارا اشتباہ یا غلط فہمی اس لیے ہوئی کہ خیالِ یار سے مجھ پر ایک محویت کا عالم طاری ہو گیا تھا۔

بہ نظم و نثر مولانا ظهوری زنده ام غالب
رگِ جان کرده ام شیرازه اوراقِ کتابش را

اے غالب! میں مولانا ظہوری کے اسلوب نظم و نثر کے اثر سے زندہ ہوں۔ میں نے اس کی کتاب کے اوراق کے شیرازے کو اپنی رگِ جاں بنالیا ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر (۲۸)

مدام محرمِ صهبا بود پیالهٔ ما
بگردِ مهر تنید است خطِ هالهٔ ما

لغت ''ہالہ:۔ وہ سفید سا دائرہ جو کبھی کبھی چاند یا سورج کے گرد نمودار ہوتا ہے۔ ہالہ ماہ کو علامت باراں اور ہالہ مہر کو علامت جنگ و جدال خیال کیا جاتا ہے۔
''محرم''= حرم میں بار پانے والا آشنا یا واقف کار۔
یہاں مرزا غالب نے پیالے کو ''محرم صہبا'' کہا ہے۔ گویا وہ پیالہ ایسا ہے کہ ہمیشہ

شراب سے آشنا ہے یعنی لبریز شراب، پیالہ شراب سے بھرا ہے، شراب سورج کی طرح چمک رہی ہے اور اس کے گرد پیالے کا کنارہ سورج کے ہالے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ مرزا غالب جام ے کے لیے ایک نہایت خوبصورت استعارہ لائے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہماری شراب ایک آفتاب درخشاں ہے اور لب جام ایک ہالہ ہے جو اس آفتاب کے گرد ابھرا ہوا ہے۔

زہی ز گرمیٔ خویت، نفس گران مایہ

گدازِ نالۂ ما، آبیار نالۂ ما

معشوق کی طبیعت کی گرمی اور تند خوئی سے عاشق کا سانس سینے میں پگھل کر رہ جاتا ہے لیکن اس سے فریادیں دبتی نہیں ہیں۔ ایک فریاد کے بعد دوسری فریاد لب پر آتی ہے۔ گویا ایک نالہ پگھلتا ہے تو اس کے گداز سے دوسرے نالے کی آبیاری ہوتی ہے۔ محبوب کی اس گرمی خو سے پے بہ پے فریاد کرنے کو شاعر نے نفس یعنی سانس کا گراں مایہ ہونا کہا ہے، یعنی سانس پھلتا پھولتا ہے اور بھاری بھرکم ہوتا جاتا ہے۔

چمن طراز جنونیم و دشت و کوہ از ماست

بہ مہر داغِ شقائق بود قبالۂ ما

لغت: ''شقائق'' لالے کے پھول (سرخ)۔ لالے کے پھول کے اندر ایک سیہ داغ ہوتا ہے جسے شاعر نے مُہر سے تشبیہ دی ہے۔ ''قبالہ'' = بیعنامہ یا ضمانت نامہ۔

شاعر نے داغ لالہ کو مہر قرار دیا ہے قبالے پر لگی ہوئی ہے ''چمن طراز'' چمن کی آرائش کرنے والا۔

شاعر کہتا ہے کہ ہم جنون کے چمن کی آرائش کرنے والے ہیں اور یہ پہاڑ اور میدان ہمارے ہیں۔ اس کے لیے لالے کے داغ کو دیکھو کہ وہ ایک مُہر ہے جو اس بات کی تصدیق

کرتی ہے کہ دشت و کوہ ہماری ملکیت ہیں۔ مراد یہ ہے کہ کوہ و دشت کی رونق ہمارے ہی دم سے ہے۔ کہ ہم جوشِ جنوں میں وہاں گھومتے رہتے ہیں۔ گویا قدرت نے انھیں ہمارے حق میں وقف کردیا ہے۔

بدل زجورِ تو دندان فشردہ ایم و خوشیم

ز استخوان اثری نیست در نوالۂ ما

لغت: ''بدل دنداں افشردن'' کوئی ناگوارا کام کرنا۔ ہم اپنے دل کو دانتوں سے چبائے چلے جاتے ہیں اور خوش ہیں۔ ہمارے ان نوالوں میں ہڈی کا کوئی نشان نہیں۔ یعنی محبت کی تلخیوں کو بڑی خوشی سے سہتے جا رہے ہیں۔

تو زود مستی و ما راز دارِ خوئی تو ایم

شراب در کش و پیمانہ کن حوالہ ما

لغت: ''زود مست''۔ جو تھوڑی سی پی کر جلدی ہی بدمست ہو جائے۔ یعنی تو جلد ہی بدمست ہو جاتا ہے اور ہم تیری اس خو سے واقف ہیں، اس لیے شراب پی اور پیمانہ ہمارے ہاتھ میں دے دے (تاکہ ہم تجھے شراب اندازے سے پلا سکیں)

درازیٔ شبِ ھجران ز حد گذشت بیا

فدای روی تو عمرِ ھزار سالۂ ما

شبِ فراق حد سے زیادہ طویل ہوگئی ہے۔ ہماری ہزار سالہ زندگی تیرے دیدار پر قربان، اب آجا۔

شاعر نے ''عمر ہزار سالہ'' کے الفاظ بڑی فنکارانہ مہارت سے استعمال کیے ہیں۔ ان سے ایک تو محبوب کے وصال کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس نعمت کے عوض ہزار سال کی عمر قربان کی جاسکتی ہے دوسرے شبِ فراق کی طوالت کا احساس ہوتا ہے کہ جدائی کی یہ رات کاٹے کاٹے سالہا سال گزر گئے۔

جنون بہ بادیہ پرواز گلستان بخشید

سوادِ دیدۂ آھوست داغِ لالۂ ما

لغت: ''سوادِ دیدہ'' آنکھ کی پتلی یا سیاہی اور ''داغ لالہ'' دونوں سیاہ ہوتے ہیں۔ اسی رعایت سے شاعر نے ایک کو دوسرے سے تشبیہ دی ہے۔

ہرن کی وحشت مشہور ہے یہ وحشت اس کی آنکھوں سے ٹپکتی ہے اور پھر ہرن جنگل میں مجنوں کی طرح گھومتا بھی ہے۔ اس پس منظر کو مدنظر رکھ کر دیکھیے۔ مرزا غالب فرماتے ہیں کہ ہماری وحشت جنون نے، بیابان کو گلستان کی پرواز بخش دی یعنی جنگل باغ کی طرح لہلہانے لگا ہے۔ چنانچہ جنگل میں گھومنے والے آہو کے سیاہی ہمارے اس لہلہاتے گلستاں کے لالہ کا داغ ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ہماری وحشت جنوں سے جنگل میں گلستاں کی سی بہار ہے اور یہاں ہرن کی آنکھ کی سیاہی بھی ہمیں داغِ لالہ نظر آتی ہے۔

ز سعی ھرزہ بہ بی حاصلی عَلَم گشتیم

چو باد بید پدید آمد از امالۂ ما

لغت: ''امالہ'' لغت میں ایک چیز کو دوسری چیز کی طرف لے جانے اور صرف ونحو کی اصطلاح میں ''الف'' کو ''ے'' سے بدلنے کو کہتے ہیں، جیسے ''رکاب'' سے ''رکیب'' اور ''باد''

سے ''بید''

''بید'' ایک درخت ہے، جس پر پھل نہیں لگتا۔

علم گشتن = مشہور ہونا، نمایا ہونا۔

ہم اپنی بے سود کوششوں کے باعث اپنی محرومیوں میں نمایاں ہو گئے ہیں۔ ہمارے عمل امالہ میں 'باد' نے 'بید' کی صورت اختیار کر لی۔ مرزا غالب نے اپنی سعی لا حاصل کے لیے باد سے بید کے امالہ ہونے کا استعارہ استعمال کیا ہے جو بہت نادر ہے باد یعنی ہوا کی حرکت بھی بے مقصد ہوتی ہے اور بید بھی بے ثمر ہوتا ہے۔

همین گداختن است آبروی ما غالب

گہر چہ ناز فروشد بہ پیش ژالۂ ما

اے غالب! محبت کا سوز و گداز ہی ہماری آبرو ہے ہمارے ژالے (اولے) کے مقابل گوہر کیا ناز کر سکتا ہے۔ موتی اور اولہ دونوں میں آب و تاب ہوتی ہے لیکن موتی پر گرمی کا کوئی اثر نہیں ہوتا، برعکس اس کے ژالہ ذراسی حرارت سے بھی پگھل جاتا ہے۔ سوز و گداز ہی سے تو زندگی کی آبرو ہے۔

غزل نمبر(۲۹)

نهفت شوخی بی پرده شور جنگش را
ز باده تندی ایں باده برد رنگش را

لغت: ''شور جنگ:: لگاوٹ ظاہرا انداز دشمنی۔

محبوب کی بے باک شوخیوں سے اس کا ظاہری لگاوٹ کا انداز دب کر رہ گیا۔ اس شراب کی تندی اور تیزی سے اس شراب کا رنگ مات ہوگیا۔

شراب میں اصل شے اُس کی تیزی اور تندی ہوتی ہے۔ رنگ ایک بناوٹی چیز ہے۔ اسی طری محبوب کی بے باک شوخیاں بتاتی ہیں کہ اس کا اظہار عداوت مصنوعی ہے۔

کدام آئینه با روی او مقابل شُد
که بیقراریِ جوهر نبرد زنگش را

''جوہر آئینہ'' آئینے کی چمک کو کہتے ہیں قدیم زمانے میں جب آئینہ فولاد کا ہوتا تھا تو برسات کی نمی سے اسے زنگ لگ جاتا تھا، چنانچہ اسے صیقل کر کے جلا دیتے تھے۔

شاعر کہتا ہے کہ کون سا آئینہ تیرے روبرو آیا کہ تیرے چہرے (کے حسن) سے اس کا جوہر تڑپ نہ اٹھا ہو۔ اور اس تڑپ سے اس کا زنگ نہ جاتا رہا ہو۔ صوفیہ قلب انسانی کو

آئینے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اس آئینے کی حسن ازلی سے جلا ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی دل ایسا نہیں کہ اس پر حسن ازلی کا عکس نہ پڑا ہو اور وہ چمک نہ اٹھا ہو۔

چو غنچه جوشِ صفای تنش ز بالیدن
دریده بر تنِ نازک قبای تنگش را

کلی جب جوش شباب پہ آتی ہے تو اس کی قبا چاک ہو جاتی ہے۔ ''صفا'' حسن کا ایک وصف ہے جسے ہم لطافت کہہ سکتے ہیں۔ شاعر محبوب کے جوش شباب کا نہیں بلکہ اس کی صفائے بدن کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کلی کی طرح میرے محبوب کا جوش صفائے بدن اس قدر ابھرا کہ باوجودیکہ وہ بہت نازک بدن تھا، اس کی قبائے تنگ چاک ہو کر رہ گئی۔

ز گرمی نفَسَش دل در اهتزاز آمد
شراره شهپر پرواز گشت سنگش را

لغت: ''اہتزاز'' اس کے لغوی معنے اونٹ کا مستی میں آکر رقص کرنا۔ عام مفہوم کیف و مستی ہے۔

''شہپر'' وہ بڑا پر ہے جس کے بل پر پرندہ اڑتا ہے۔

پہلے مصرعے میں ''نفسش'' کے لفظ میں ''ش'' کا ضمیر دل کا مضاف الیہ ہے اور ''او'' کا مفہوم دیتا ہے۔ پہلے مصرعے کی ترکیب لفظی یہ ہے۔ ''از گرمی نفس دل او در اہتزاز آمد''

شاعر نے گرمی نفس کو شرارہ اور محبوب دل سخت کو سنگ کہا ہے۔

پتھر ٹکرائیں تو ان میں سے چنگاریاں نکلتی ہیں جس سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ پتھر میں شرر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن پتھر ان چنگاریوں سے متاثر نہیں ہوتا شاعر کہتا ہے کہ میرے نفس

آتشین نے اس کے دل پر اثر کیا اور وہ جھومنے لگا۔ دیکھو اس کے پتھر کی ایک چنگاری نے دل کو پر لگا دیے اور وہ کیف و سرور میں پرواز کرنے لگا۔

نظارۂ خطِ پشتِ لبش ز خویشم بُرد
زبادہ نشہ فزون دادہ اند بنگش را

لغت:- ''بنگ'' وہی اردو کا لفظ بھنگ ہے۔

شاعر نے سبزۂ خط کے لیے بھنگ کا استعارہ استعمال کیا ہے۔

شراب اور بھنگ دونوں نشہ آور چیزیں ہیں۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے پشت لب پر سبزۂ خط کو دیکھ کر مجھ پر بے خودی طاری ہوگئی۔ اس کی بھنگ میں شراب سے بڑھ کر نشہ موجود ہے۔

چہ نغمہ ھا کہ بہ مرگم سرود پنداری
ز رشتۂ کفنم تار بود چنگش را

لغت: ''چنگ'' ایک ساز کا نام ہے جس میں تار ہوتے ہیں۔ ''پنداری'' تو خیال کرے، گویا معلوم ہوتا ہے۔

میرے مرنے پر اس (محبوب نے کیا کیا نغمے گائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساز (چنگ) میرے کفن کے دھاگے کے تھے۔

شعر میں ''چہ'' کا استفہام بڑا موزوں ہے۔ سیاق و سباق کے اعتبار سے بالخصوص کفن کے لفظ سے ''کیا کیا نغموں'' سے مراد المناک نغمے ہوں گے لیکن اس کے بعیدی معنے طربناک بھی ہو سکتے ہیں کہ محبوب کو عاشق کی موت پر کتنی خوشی ہوئی ہے۔

بہ حشر وعدۂ دیدار کردہ، بی تابم
شتابِ من بسر آرد مگر درنگش را

لغت: ''درنگ''۔ دیر۔ تاخیر شعر میں یہ لفظ شتاب کی ضد کا مفہوم دے رہا ہے۔

''مگر'' = شاید ہو سکتا ہے۔

کہتا ہے کہ محبوب نے قیامت کے روز اپنے دیدار دکھانے کا وعدہ کیا ہے اور میں شوق دیدار کے لیے سخت بے تاب ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میری بے تابی (جلدی) ہی اس کی تاخیر کو ختم کر دے۔ یعنی میں بے تابیوں کے ہاتھوں جان دے دوں اور پھر اس کے دیدار سے فیض یاب ہو جاؤں۔

اس شعر میں یہ بھی ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے کہ میری بے تابیاں ایسا حشر برپا کریں کہ وہ ایفائے عہد پر مجبور ہو جائے۔

جگر نشانہ نھم، بر خود اعتمادم نیست
مباد دل بہ تپش رد کند خدنگش را

مجھے اپنے پہ اعتماد نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا دل تڑپ اور سوز کے عالم میں اُس کے تیر کو رد کر دے، اس لیے میں نے اپنے جگر کو اس کے تیر کا ہدف بنانے کے لیے تیار رکھا ہے۔

اس شعر میں ''مباد'' کا لفظ بے حد بلیغ واقع ہوا ہے۔ یہ کلمۂ دعائیہ ہے۔ اس کا مفہوم یہی ہے کہ عاشق یہ نہیں چاہتا کہ محبوب کا تیر کسی طرح بھی چوک جائے یا خطا ہو جائے، کیونکہ اس کے جذبہ عشق کا تو یہ عالم ہے کہ:

خود اٹھالاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

مقصود شاعر یہی ہے کہ دل اور جگر دونوں تیر کھانے پر آمادہ ہیں۔ اس شعر سے ذہن

مرزا غالب کے حسب ذیل شعر کی طرف جاتا ہے۔

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے ہوئے ہیں
وہ دن گئے کہ دل سے اپنا جگر جدا تھا

کشیدہ ایم بدیوانگی ز شوخی دوست
بگونہ گونہ ادا ناز رنگ رنگش را

ہم نے محبت کی دیوانگی کے عالم میں شوخی محبوب کی طرح طرح کی اداؤں پر سو سو انداز میں ناز اٹھائے ہیں۔

اس شعر میں دو ترکیبیں آئی ہیں۔ ''گونہ گونہ ادا'' اور ''ناز رنگ رنگ'' دونوں میں تکرار الفاظ بڑی تہہ دار چیز ہوتی ہے اور اُس سے معنویت کے کئی ایک پہلو ابھرتے ہیں۔ مرزا غالب نے اس شعر میں تکرار سے نہ صرف شعری بلاغت بلکہ موسیقیت بھی پیدا کی ہے۔

علاوہ بریں اس شعر میں شوخی بیان بھی آگئی ہے اور اس شوخی بیان میں شوخی دوست کی رعنائیاں جھلکتی ہیں۔

ز ظرفِ غالبِ آشفتہ گرنہای آگاہ
بیاز ما بہ می تند هوش و هنگش را

لغت: ''ہوش و ہنگ'' ہنگ وقار و ہوشیاری کا مفہوم دیتا ہے اور ہوش کا مترادف ہے۔

کہتا ہے اگر تو، غالب کے حوصلے اور ظرف سے واقف نہیں ہے تو اس کے ہوش کو تند و تیز شراب پلا کر آزما، یعنی دیکھ کہ وہ کتنی شراب پی سکتا ہے۔ اور پی کر ہوش کو نہیں کھو دیتا۔ شاعر نے پہلے مصرعے میں اپنے لیے ''غالب آشفتہ'' کہا ہے اور آشفتگی ہوش و خرد کی ضد ہے۔ چنانچہ وہ

کہنا چاہتا ہے کہ میری آشفتگی پر نہ جا۔ میرا اصل رنگ دیکھنا ہو تو شراب تند پلا اور پھر دیکھ کہ میرے ہوش وخرد کے جوہر کیسے کھلتے ہیں۔

مرزا غالب کا یہ مصرع دیکھیے۔

بے مَی نکند در کفِ من خامہ روائی

کہ مَی کے بغیر میرے ہاتھ میں قلم نہیں چلتا۔

❀❀❀

غزل نمبر (۳۰)

رازِ خویت از بد آموزِ تو می جوئیم ما
از تو می گوئیم گر با غیر می گوئیم ما

لغت: ''بدآموز'' جو دوسروں کو غلط سبق سکھائے۔ گمراہ کرنے والا شخص۔

ہم تیری طبیعت کے راز کو تیرے بدآموز (یعنی رقیب) سے معلوم کر لیتے ہیں چنانچہ ہم اگر غیر (یعنی رقیب) سے کوئی بات کرتے ہیں تو تیرے بارے میں کرتے ہیں۔ (تاکہ اس کی رائے تیرے متعلق معلوم ہو سکے)۔

حشر مشتاقان همان بر صورتِ مژگان بود
مر ز خاکِ خویشتن چون سبزه می روئیم ما

شاعر نے عاشقوں کے لیے مشتاقوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یعنی دیدارِ محبوب کے مشتاق ہیں۔ دیدارِ محبوب کے لیے مژگاں کا اٹھنا لازمی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ مشتاقوں کا حشر بھی مژگاں کی طرح ہوتا ہے۔ ہم لوگ سبزے کی طرح ہی خاک سے اُگ آتے ہیں۔

رازِ عاشق از شکستِ رنگ رسوا می شود

با وجودِ سخت جانی ها تنک روئیم ما

لغت: ''شکست رنگ'' رنگ کا اڑنا۔

''تنک رو'' ایسا شخص جس کا چہرہ جلدی سے بے قابو ہو کر بدل جائے۔ شاعر ''تنک رو'' کا لفظ سخت جان کے مقابل میں لایا ہے۔ عاشق یوں تو سخت جان ہوتا ہے لیکن چہرے کا رنگ فوراً اڑ جاتا ہے اور اس کی محبت کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ عاشق کا راز رنگ کے اڑنے سے فاش ہو جاتا ہے۔ ہم لوگ (عاشق) باوجود سخت جان ہونے کے نرم رو واقع ہوئے ہیں۔

زین بھار آیین نگاھان بو کہ پزیردیکی

عمرھا شد رخ بخونِ دیدہ میشوئیم ما

لغت: ''بہار آییں نگاہاں'': ''آیین'' آرائش کو کہتے ہیں کہ ''بہار آیین'' سے مراد بہار کو آراستہ کرنے والے۔ بہار آییں نگاہاں وہ حسین لوگ جو اپنی نظروں سے بہار کو زینت بخشتے ہیں۔

ہم مدتوں سے اپنے چہرے کو آنکھوں کے خون سے دھوتے چلے آ رہے ہیں۔ خدا کرے یہ ان حسین نگاہوں والوں میں سے جن کی نظریں بہاروں کی آرائش ہیں کوئی ہمیں بھی قبول کرلے۔ ہمارا چہرہ بھی تو سرخی خون سے رشک بہاراں ہو رہا ہے۔

تا چھا مجموعہ لطف بھاران بودہ ای

تا بہ زانو سودہ پای ما و می پوئیم ما

سبحان اللہ! کتنا خوبصورت شعر ہے۔ مرزا غالب نے محبوب کو مجموعۂ لطف بہاراں کہا ہے، یعنی بہاروں کی لذتوں کا سرچشمہ کہ جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتیں اور یہ مفہوم 'تا چہا' کے الفاظ نے پیدا کیا ہے۔ ''تا چہا'' کا مطلب صرف 'کتنا' یا 'کیسا' ہی نہیں بلکہ ''لا انتہا'' ہے چنانچہ کہتا ہے کہ تو لطف بہاراں کا وہ ختم نہ ہونے والا سرچشمہ ہے کہ جسے دیکھتے دیکھتے ہمارے پاؤں زانو تک گھس گئے ہیں۔ اور ابھی تک ہم چلے جا رہے ہیں۔

زحمتِ احباب نتوان داد غالبؔ بیش ازین

ھرچہ می گوئیم بھرِ خویش می گوئیم ما

اے غالب! اس سے زیادہ ہم احباب کو کیا زحمت دیں، اب تو ہم جو کچھ کہتے ہیں اپنے لیے کہتے ہیں۔

یعنی دوستوں سے کب تک دادِ سخن کی توقع کریں گے۔ اب خود ہی شعر کہتے ہیں اور خود ہی اس کی داد بھی دیتے ہیں۔

غزل نمبر (۳۱)

ای روی تو بہ جلوہ در آوردہ رنگ را
نقشِ تو تازہ کردہ بساطِ فرنگ را

لغت: ''فرنگ'' ۔ فرانس، اٹلی کے لیے بالخصوص اور یورپ کے لیے بالعموم استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ حسن و رعنائی کی علامت کے طور پر بھی آتا ہے۔ یہاں بساطِ فرنگ سے مقصود بساطِ حسن ہی ہے۔

تیرے (حسین) چہرے سے رنگِ حسن چمک اٹھا اور رعنائیوں کے نقش تازہ ہو گئے۔

از نالہ خیزیِ دلِ سخت تو در تبم
در عطسۂ شرر مفگنِ مغزِ سنگ را

لغت: ''تب'' = پیچ و تاب۔

''عطسہ'' = چھینک۔ مسلسل چھینکوں کا آنا ایک عارضہ بھی ہے جسے عربی میں ''عطاس'' کہتے ہیں پتھر سے جو چنگاریاں نکلتی ہیں۔ شاعر نے انھیں عطسۂ شرر کہا ہے گویا وہ آتشیں چھینکیں ہیں جو مغزِ سنگ سے نکل رہی ہے۔

شاعر نے محبوب کے دل سخت کو سنگ یعنی پتھر کہا ہے۔ اس پتھر سے دل پر غمِ محبت کا اثر ہوا ہے۔ اور وہ فریاد کر رہا ہے جسے دیکھ کر عاشق کا دل بھی بیقرار ہو رہا ہے اور پیچ و تاب میں ہے چنانچہ شاعر کہتا ہے:

میں تیرے دلِ سخت کی آہ و فریاد سے پیچ و تاب میں ہوں۔ (خدا کے لیے) اس مغزِ سنگ یعنی اپنے پتھر سے دل کو شرر باریوں پر مجبور نہ کر۔

از عمرِ نوح عرض بَرد انتظار و تو
در عرضِ شوق تاب نیاری درنگ را

تیرا انتظار تو نوح کی عمر کو بھی کم کر دیتا ہے اور تیری حالت ہے کہ تو اظہارِ شوق کے معاملے میں ذرا سی بھی تاخیر گوارا نہیں کرتا۔

یعنی تیرے انتظار کا عرصہ اتنا طویل ہے کہ اُس کے مقابل عمرِ نوح کم معلوم ہوتی ہے، اور جب انتظار ختم ہو جائے اور اظہارِ شوق کا وقت آتا ہے تو تجھ میں اتنی بھی تاب نہیں کہ اُسے ذرا آرام سے سن لے۔

داغم کہ در ہوای سر دامنِ کیست
در خون من ز ناز فرو بردہ چنگ را

لغت: ۔''چنگ'' پنجہ، ہاتھ۔

میں رشک سے جل کر داغ ہو گیا ہوں کہ وہ شخص جس کا پنجہ بڑے ناز سے میرے خون میں پڑا ہے، کسی اور کے دامن کو ہاتھ میں لینے کی فکر میں ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۳۲)

سوزد ز بسکه تابِ جمالش نقاب را
دانم که درمیان نه پسندد حجاب را

چونکہ اس کے حسن و جمال کی چمک سے اس کا نقاب جل اٹھتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ یہ بات گوارا ہی نہیں کرتا کہ اس کے اور دیکھنے والوں کے درمیان کوئی حجاب حائل ہو۔

پیراهن از کتان و دمادم ز سادگی
نفریں کند پرده دری ماهتاب را

لغت: ''کتان'' کتان اور کتّان دونوں طرح درست ہے۔ ایک نازک اور باریک سا کپڑا ہوتا ہے جو السی کے پودے کے چھلکے سے بنتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ کتان ایک پودے کا نام ہے جس کے ریشے لے کر یہ کپڑا بناتے ہیں شعراء کا عقیدہ ہے کہ کتان کا کپڑا چاندنی کی تاب نہ لا کر پھٹ جاتا ہے۔ شعر میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے، یعنی یہ ''صنعت تلمیح'' ہے۔

کہتا ہے کہ محبوب کا لباس کتان کا ہے اور وہ سادگی دیکھو کہ وہ لگا تار چاندنی کو کوستا ہے کہ اُس نے میری پردہ دری کر دی ہے (حالانکہ نازک اور باریک لباس سے اس کا رنگِ بدن خود بخود نمایاں ہو رہا ہے۔ اس شعر میں لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ لباس کتان کا پھٹنا (جو محض ایک عقیدہ ہے) چاندنی کے باعث نہیں بلکہ جوشِ شباب کی وجہ سے ہے۔

تا خود شبی به همدمی ما بسر برد
در چشمِ بختِ غیر رها کرد خواب را

اس خیال سے کہ وہ (محبوب) ایک رات ہماری صحبت میں گذارے اس نے رقیب کی چشم نصیب میں نیند ڈال دی ہے یعنی رقیب کے نصیبے کو سلا دیا ہے۔ گویا عاشق کے ساتھ معشوق کا شب بسر کرنا رقیب کی بدبختی کی دلیل ہے۔

نارفته، دم ز وعدهٔ باز آمدن زند
تا در وصال یاد دهد اضطراب را

عاشق اپنے محبوب کے وصال سے فیض یاب ہے اور اسے یک گونہ آسودگی حاصل ہے۔ لیکن محبوب کی شوخی ادا دیکھیے کہ وہ عاشق کی اس آسودہ حالت کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے اور ایک اضطراب کی کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے جو وصال سے پہلے انتظار میں تھی۔ چنانچہ محبوب اٹھ کر جاتا تو نہیں، لیکن ظاہراً یہ کہتا ہے کہ اچھا میں چلا، میں وعدہ کرتا ہوں کہ لوٹ کر آ جاؤں گا۔ اس سے مقصود جانا آنا نہیں، بلکہ وصال کے عالم میں اضطراب کی کیفیت پیدا کرنا جسے دیکھ کر محبوب کو خوشی ہوتی ہے۔

در دل خزد به لابه و از جاں بدر کشد
دیرینه شکوهٔ ستمِ بی‌حساب را

مرزا غالب نے اس شعر میں حسن کی اثر انگیزی کے ایک لطیف پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حسن کا انداز محبوبانہ کس طرح عاشق کے دل سے وہ شکوہ شکایتیں (جو وہ ہمیشہ بظاہر کرتا رہتا ہے۔) دھو ڈالتا ہے۔

کہتا ہے وہ (محبوب) بڑے انداز محبوبی سے دل میں سما جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ تمام پرانے گلے شکوے جو اس ستم ہائے لاتعداد سے ہماری روح میں دبے ہوتے ہیں، دور کر دیتا

ہے۔اس شعر سے مولانا حالی کا یہ شعر یاد آتا ہے:

آتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

جرأت نگر کہ ھرزہ بہ پیش آمدِ سوال
گیرم بہ بوسہ زآن لبِ نازک جواب را

ذرا میری جرأت دیکھو کہ یونہی بے فائدہ سوال کرنے سے پہلے ہی میں اس لب نازک کا بوسہ لے لیتا ہوں اور جواب حاصل کر لیتا ہوں۔ درحقیقت وہ سوال بوسے ہی کا تھا، سو اس کا عملی جواب بھی مل گیا۔

نازم فروغِ بادہ زعکسِ جمالِ دوست
گوئی فشرودہ اند بجام آفتاب را

لغت: جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا، فارسی میں بالعموم جمع غائب کا صیغہ جب بلا فاعل آئے تو وہ ماضی مجہول کا مفہوم دیتا ہے۔ ''فشردہ اند'' کا مفہوم یہاں آنکھوں نے نچوڑ کر ڈالا نہیں بلکہ نچوڑ کر ڈال دیا گیا ہے۔

کہتا ہے، جمالِ دوست کے عکس سے شراب چمک اٹھی ہے اور میں اس پر ناز کرتا ہوں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پیالے میں دھوپ کا رس نچوڑ کر ڈال دیا گیا ہے۔

سوزد ز گرمی اش می و او ھمچنان بہ لھو
ریزد ز آبگینہ بہ ساغر شراب را

وہ بڑے لاابالیانہ پن سے شراب کو صراحی سے ساغر میں انڈیلتا چلا جا رہا ہے اسے یہ احساس ہی نہیں کہ شراب اس کی تابِ جلوہ کی حرارت سے جل رہی ہے۔

آبش دھم بباده و اُو ھر دم از تمیز
نوشد می و ز جام فرو ریزد آب را

میں اسے شراب میں پانی ملا کر دیتا ہوں اور وہ ہر بار بڑی ہی مہارت سے پانی اور شراب میں امتیاز کر لیتا ہے، چنانچہ شراب پی جاتا ہے اور پانی گرا دیتا ہے۔

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ، خوی اوست
آمیختن بباده صافی گلاب را

غالب کی عادت ہے کہ وہ ہمیشہ شرابِ ناب میں گلاب ملا کر پیتا ہے۔ اللہ کرے اس کا دل آسودہ ہو۔

آسودگی ایک تو اس لیے حاصل ہوگی کہ یہ عادت اچھی ہے۔ دوسرے اس لیے کہ شراب و گلاب کی آمیزش بھی آدمی کو آسودگی بخشتی ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر(۳۲)

نویدِ التفاتِ شوق دادم از بلا جان را
کمندِ جذبۂ طوفان شمردم موجِ طوفان را

لغت: ''بلا'' = آلام و مصائب ''نوید'' خوش خبری ''التفاتِ شوق'' = شوق کی توجہ یعنی شوق کی تیزی یا اُبھار۔

محبت میں مصائب کا سامنا ہو تو مرزا غالب کا شوق بجائے دب جانے کے اور بھی تیز ہو جاتا ہے، گویا مصائب سے اس کی جان یا روح کو بے انتہا خوشی ہوتی ہے اور مصائب کے طوفان کی آمد ایک خوش خبری ہے۔

چنانچہ دوسرے مصرعے میں اسی جذبے کے لیے اس نے طوفان ہی کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ کہتا ہے کہ مصائب کے طوفان کی ہر لہر میری نظر میں ایک کمند ہے جس کے ذریعے طوفان کو اپنی طرف کھینچا جا سکتا ہے۔

مرزا غالب کا یہ اردو شعر بھی دیکھیے:

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

یعنی طوفان کی آمد پر دل کیسے کیسے خوشی کے نعرے لگانے لگا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمارا گھر، گھر نہیں بلکہ طوفان کے پانی سے ابھرنے والی آوازوں کا ساز ہے۔

پرستارم جگر در باخت، یارب در دل اندازش
ز بی تابی بہ زخمِ سرنگون کردن، نمکدان را

لغت:۔ ''پرستار'' = تیماردار

میرا تیماردار (میری حالت سے گھبرا کر) اپنا جگر گنوا بیٹھا ہے۔ اے خدا! اُس کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ وہ گھبراہٹ اور بیتابی میں نمکدان کو میرے زخموں کی طرف جھکا دے، یعنی میرا تیماردار میری حالت زار کی تاب نہیں لا سکتا اور گھبرایا ہوا ہے۔ کاش وہ اس گھبراہٹ میں بے ساختہ میرے زخموں پر نمک پاشی کر دے تا کہ میرے زخم زیادہ خراب ہو جائیں اور مجھے زیادہ لذت نصیب ہو۔

چنان گرم است بزم از جلوۂ ساقی کہ پنداری
گدازِ جوھر نظارہ در جام است مستان را

لغت: ''مستاں را'' میں را اضافی ہے یعنی اضافت کے لیے آیا ہے چنانچہ ''گدازِ جوہر نظارہ در جام است مستاں را'' سے مراد ہے: گدازِ جوہر نظارہ در جامِ مستان است۔

ساقی کے جلووں سے محفل اپنی گرم ہوگئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مستوں کے جام میں شراب نہیں بلکہ جلوۂ ساقی کے نظارے کے جوہر گداز ہو کر پڑے ہیں مراد یہ ہے کہ رندے خوار شراب سے بڑھ کر جلوۂ ساقی سے سرشار ہو رہے ہیں۔

ندارم شکوہ از غم با ھجوم شوق خرسندم
ز جا داشت جوشِ دل ھمانا داغ ھجران را

مجھے غم سے کوئی شکایت نہیں۔ میں تو شوق کی فراوانیوں سے شادماں ہوں کہ اس جوش شوق نے میرے دل سے داغ فراق کو یکلخت دھو ڈالا ہے۔

قضا از نامۂ آهنگِ دریدن ریخت در گوشم

ز پشتِ ناخنم نسترده نقش روئی عنوان را

شعر کا سادہ ترجمہ یہ ہے۔

قضا نے (ابھی) میرے پشت ناخن سے خط کے پتے کے نقش بھی نہیں کھرچے تھے کہ اس نے میرے کان میں خط کے پھاڑ ڈالنے کی آواز ڈال دی، یعنی میں نے ابھی خط کو کھولا ہی نہیں تھا کہ اسے پھاڑ دینے کا خیال آگیا۔

مرزا غالب کے معشوق نے خط پر پتا کچھ اس طرح لکھا تھا کہ اسے کھرچ کے مٹا ہی دینا مناسب تھا۔ لیکن مٹانے سے پہلے مکتوب الیہ یعنی مرزا کے دل میں یہ خیال آیا کہ جب عنوان یعنی پتے کی بدعنوان کا یہ عالم ہے تو خط کا نفس مضمون معلوم۔ بہتر ہے اسے پھاڑ ہی دیا جائے گویا جس گستاخانہ (ظالمانہ) انداز سے محبوب نے پتا لکھا تھا اس سے معلوم ہو گیا ہے کہ خط میں کیا لکھا ہوگا۔

به تن چسپید بازم از نم خونابه پیراهن

خراشِ سینه سطرِ بخیه شد چاک گریبان را

عاشق نے وحشت میں گریباں کو چاک کیا، لیکن اس پر بھی اس کی وحشت کم نہ ہوئی۔ عاشق سینے کو ناخنوں سے کھرچنے لگا خون بہا اور اس کی نمی سے پیراہن جسم سے چمٹ گیا جس سے گریباں کا چاک بھی ایک طرح غائب ہوگیا۔ گویا سینے کی خراش نے بخیے کا کام کیا وہ خراش بخیے کی لکیر بن گئی۔

مقصود یہ ہے کہ گریباں چاک کرنے سے بھی کچھ نہ بنا وحشت بدستور قائم رہی اور جس گریباں کو چاک کیا تھا اسے دوبارہ چاک کرنے کی صورت پیدا ہوگئی۔

به جرمِ تابِ ضبطِ ناله با من داوری دارد

ز شوخی می شمارد زیرِ لب، دزدیدن افغان را

لغت: ''افغاں'' = فغاں۔ افغاں، فغاں کی اصلی صورت ہے الف ساقط ہو کر فغاں رہ گیا۔

''فغاں را زیرِ لب دزدیدن'' یعنی فریاد کو لبوں ہی میں دبالینا، ضبط کرنا۔ میں ضبط فریاد کرتا ہوں اور وہ میرے تاب ضبط کو ایک ایک جرم سمجھ کر میری خطا کا مواخذہ کرتا ہے وہ فریاد کو زیر لب چھپالینے کو (یعنی ضبط کرنے کو) گستاخی خیال کرتا ہے۔

هنوز آئینۂ ما می پذیرد عکسِ صورت ها

چو ناصح خنده زد، اندر دل افشردیم دندان را

لغت: ''دنداں دردل افشردن'' = انتہائی قلق میں ڈوب جانا۔

کیا کریں ہمارا آئینہ (آئینۂ دل) ابھی تک مختلف صورتوں کے عکس کو قبول کر لیتا ہے۔

چنانچہ جب ہمارا ناصح ہماری حالت پر ہنستا ہے تو ہمیں انتہائی قلق ہوتا ہے۔

تکلف بر طرف، لب تشنۂ بوس و کنارستم

ز راهم باز چین دام نوازشهای پنهان را

صاف بات تو یہ ہے کہ ہم بوس و کنار کے پیاسے ہیں ہمارے راستے سے ان چھپی چھپی نوازشوں اور مہربانیوں کے دام اٹھا دو۔

محبت برملا ہی کی جائے تو عاشق کے دل کو تسکین ہوتی ہے۔

به مستی گر به جنت بگذری زنهار نفریبی

سرابی در ره هستی تشنه دیدار جانان را

اگر تو مستی کے عالم میں (جو جنت کی فضا سے پیدا ہوتی ہے) جنت سے گزرے تو
خبردار اس کا فریب نہ کھالینا جنت تو دیدارِ جاناں کے پیاسوں کے لیے ایک سراب ہے یعنی جنت:

نشانِ راہ ہے منزل نہیں ہے

چمن سامان بتی دارم کہ دارد وقت گل چیدن
خرامی کز ادای خویش پر گل کردہ دامان را

لغت: ''چمن ساماں'' جس کا سرمایہ حسن چمن ہے۔ وہ محبوب جو سرتاپا خود چمن ہے۔
یعنی میرا ایک ایسا سرتاپا چمن معشوق ہے کہ جو پھول چنتے وقت اس انداز سے چلتا ہے
کہ اس کے خرام کی ہر ادا اُس کے دامن کو پھولوں سے بھر دیتی ہے، یعنی اس کی ہر ادا پھولوں سے
بھری ادا ہے۔

بہ اندازِ صبوحی چون بہ گلشن ترکتاز آری
پریدن ھای رنگِ گل شفق گردد گلستان را

لغت: ''صبوحی'' صبح کی شراب
جب تو صبح کی شراب پی کر گلشن میں تیز خرامی کرتا ہے تو پھولوں کے رنگ اڑ اڑ کر باغ
پر شفق بن کر چھا جاتے ہیں۔

کباب نو بھار اندر تنورِ لالہ می سوزد
چہ فیض از میزبان لالہ ابالی پیشہ، مھمان را

مرزا غالب نے لالے کی سرخی کو تنور کہا ہے اور اسے ایک میزبان لاابالی قرار دیا ہے کہ

جسے کسی مہمان کی پروا نہیں ہے۔ وہ اپنی آگ کے شعلے فروزاں کیے ہوئے ہیں کوئی جلتا ہے
تو جلے۔

اور بہار کو چمن کا مہمان بنایا ہے۔ بہار آتی ہے تو چمن جگمگا اٹھتا ہے لیکن بقول شاعر اس
کا یہ جگمگا اٹھنا گویا آگ میں جلنا ہے۔
یعنی بہار میں شگفتگی کہاں؟ وہ تو گویا شعلوں میں جل رہی ہے۔

چہ دودِ دل، چہ موجِ رنگ درھر پردہ از ھستی
خیالم شانہ باشد طرۂ خوابِ پریشان را

لغت: ''دود دل'' دل کا دھواں یعنی غم کی فریادیں۔
''موج رنگ'' رنگ کی لہریں یعنی خوشیوں کا ہجوم یا طوفان۔
زندگی خوشیوں سے لبریز ہو یا فریادوں سے انسانی ذہن کی خیال آرائیوں کا نتیجہ
ہے۔ یہ ایک خواب پریشاں ہے جسے انسان کا خیال آراستہ کرتا رہتا ہے اور اپنے دل کی تسلی کی
خاطر اس کی مختلف تعبیریں کرتا ہے اس کیفیت کو شاعر نے یوں بیان کیا ہے کہ دود دل ہو یا موج
رنگ، زندگی کا ہر پہلو (یعنی غم اور شادی) ایک خواب پریشاں ہے جس کی زلفوں کو آراستہ کرنے
کے لیے میرا خیال ایک شانے کا کام دیتا ہے۔

بہ شب ھا پاس ناموست زخویشم بدگمان دارد
زشور نالہ میریزم نمک در دیدہ دربان را

راتوں کو تیری عزت و ناموس کا پاس (پاسبانی) کرتے ہوئے میں اپنے آپ سے
بدگماں ہو جاتا ہوں۔ میں اپنی فریادوں کی تیزی کا نمک دربان کی آنکھوں میں ڈال دیتا ہوں کہ
اسے یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کون فریاد کر رہا ہے۔

زمستی محو پا کوبی بود هر گردباد این جا

رواج خانقاهست از کف خاکم بیابان را

لغت: ''گردباد'' بگولا ''گردباد'' میں گاف مکسور ہے۔ عام طور پر لوگ اس کا غلط تلفظ کرتے ہیں اور گاف کو مفتوح پڑتے ہیں اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ بگولے میں گرد غبار ہوتا ہے لوگ ''گردباد'' سے مراد وہ ہوا لیتے ہیں جو گرد آلود ہو اسی طرح ''گرداب'' یعنی بھنور کو بھی گرداب بالفتح پڑھتے ہیں حالانکہ دونوں جگہ گرد کا مفہوم گول کا ہے۔

خانقاہوں میں درویش (قلندر) حال اور وجد کی حالت میں رقص کرتے ہیں۔ اس شعر کے مفہوم کی طرف آنے سے پہلے تصور کیجئے کہ مرزا غالب بیاباں نوردی کرتے کرتے وہیں خاک ہو چکے ہیں لیکن ان کی اس کف خاک میں وہی بے تابیاں ہیں جو ان کی زندگی میں تھیں۔ پہلے وہ بیاباں نورد تھے مگر اب ان کی خاک غبار بن کر گھوم رہی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ بیاباں میں جو بگولا بھی رقص کر رہا ہے انہی کی کف خاک سے ابھرا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

یہاں (یعنی بیاباں میں) ہر بگولا مستی کے عالم میں رقصاں ہے۔ میری کف خاک سے بیاباں میں خانقاہ کا سماں (رسم ورواج) نظر آتا ہے۔

خلیدن های منقارِ هما در استخوان غالب

پس از عمری بیادم داد کاوش های مژگان را

تصور کیجیے کہ عاشق مر چکا ہے اور اسے مرے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے قبر ویران پڑی ہے اور اس کی ہڈیاں ادھر سے ادھر بکھری ہوئی ہیں۔ ہما (ہڈیاں کھاتا ہے) آتا ہے اور ان ہڈیوں پر چونچ مارتا ہے اس کی چونچ کی چبھن سے عاشق کو (جس کا جذبہ عشق ابھی زندہ اور تازہ ہے) وہ وقت یاد آتا ہے کہ جب کسی کی لمبی لمبی اور تیز مژگان اس کے تنگ و ریشہ میں چبھتی تھیں۔

مرزا غالب نے عشق کے جذبۂ غیر فانی کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے اور ایک نہایت ہی حسین محاکاتی فضا پیدا کی ہے۔ جس سے ان کے احساسات کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۳۴)

بہ خلوت مژدۂ نزدیکیِ یار است پہلو را

فریب امتحانِ پاکبازی دادہ ام او را

خلوت میں میرے پہلو کو محبوب کے نزدیک ہونے کی خوش خبری ملتی ہے۔ میں نے اسے اپنی پاکبازی کے آزمانے کا فریب دیا ہے۔ یعنی میرا محبوب پاکبازی کے فریب میں آکر میرے قریب تر ہو گیا ہے۔

ز محوِ پردۂ محمل مگو، فرهاد را میرم

کہ می خاید بذوقِ فتنہ شادروانِ مشکو را

لغت: ''مشکو'' = محل، قصر شاہی یا حرم شاہی۔ ''می خاید'' = چباتا ہے۔ شادروان = پردہ یا سائبان۔

قیس عامری (مجنون) کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ لیلیٰ کے محمل کی تلاش میں محو رہتا اور اسی تلاش میں صحرا نوردی کرتا رہتا تھا۔ فرہاد، شیریں کے محل کی دیواریں چباتا تھا کہ کہیں شیریں نظر آجائے۔

کہتا ہے پردۂ محمل میں محو ہونے والے (مجنوں) کی بات نہ کر۔ میں تو فرہاد سے بھی آگے ہوں جو عشق کی دیوانگی کے عالم میں محمل سرائے شیریں کی دیواروں کو چباتا تھا۔

جھان از بادہ و شاھد بدان ماند کہ پنداری

بہ دنیا از پسِ آدم، فرستادند مینو را

لغت: "مینو" جنت۔ یہ دنیا شراب اور حسینوں کے باعث یوں دکھائی دیتی ہے کہ جیسے آدم کے بعد جنت کو یہاں بھیج دیا گیا ہے۔

زمن رنجیدہ، با اغیار در ناز است ومی خواھد

بہ جنبش ھای ابرو از گرہ پردازد ابرو را

لغت: "از گرہ ابرو پردازد" ابرو سے شکن دور کردے۔

غصے میں ابرو پہ بل پڑ جاتے ہیں اور جب کسی کو محبت اور ناز سے دیکھا جائے تو وہ بل (جیسے جھڑ جاتے ہیں) دور ہو جاتے ہیں۔

معشوق، عاشق سے برہم ہے اور رقیب سے ناز و انداز سے پیش آتا ہے۔ اتفاق سے عاشق اور رقیب ایک جگہ موجود ہیں۔ وہ چاہتا ہے بیک وقت دونوں سے الگ الگ اپنے رویے کا اظہار کرے شاعر کہتا ہے کہ وہ مجھ سے برہم ہے اور غیروں پر مہربان ہے چنانچہ وہ چاہتا ہے کہ (پہلے ابروں پر گرہ ڈالے اور عاشق کو گھور کے دیکھے) اور پھر ابروؤں کی جنبش سے ابروؤں سے شکن دور کردے۔

مرزا غالب نے حسن کی اس دہری ادا کو بڑے لطیف اور خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

بہ زورِ تُند خوئی، خستگان را رامِ خود کردن

بہ آتش بردن است از موی تابِ پیچشِ مو را

خستہ دلوں کو طبیعت کی تندی کے ساتھ اپنا رام کر لینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بال کے پیچ و تاب (بل) اُسے جلا کر نکالنا چاہے۔

نباشد دیدہ تا حق بین، مدہ دستوریِ اشکش

چو گوھر سنج، کو پیش از گھر سنجد ترازو را

لغت: "گوہر سنج" موتیوں کو پرکھنے والا۔ "ترازو سنجیدن" کوئی چیز تولنے سے پہلے یہ دیکھنا کہ ترازو سیدھا ہے کہ نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ جب تک آنکھیں حق بین نہ ہوں انھیں آنسو بہانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ موتیوں کو تولنے والا پہلے اچھی طرح ترازو کی سیدھ دیکھ لیتا ہے۔

چو بنشیند بہ محفل، بگذرانم در دلِ تنگش

کہ رنجد غیر از و چوبی سبب درھم کشد رو را

جب وہ محفل میں بیٹھتا ہے تو میں اسے اپنے دل تنگ (یعنی دل افسردہ) میں سے گزارتا ہوں تا کہ جب وہ اس سے (بظاہر) بے سبب ناک بھوں چڑھائے تو رقیب اس کی یہ صورت دیکھ کر رنجیدہ خاطر ہو جائے۔

اگر داند کہ در نسبت مرا با کیست ھم چشمی

کشد در دیدہ ھر گردی کہ از رہ خیزد آھو را

لغت: "ہم چشمی" = شریک یا حریف ہونا۔

اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ عاشق کی نسبت سے میرا ہم چشم کون ہے تو وہ راستے سے جو گرد و غبار اٹھے وہ ہرن کی آنکھوں میں ڈال دے۔ آہو یعنی ہرن ایک وحشت زدہ جانور ہے اور جنگل میں آوارہ گھومتا ہے۔ یہ چیز اس کی آنکھوں سے ظاہر ہوتی ہے اس اعتبار سے مرزا غالب کا اسے اپنا ہم چشم کہنا بڑا موزوں ہے۔

بهاران گو برو مشاطهٔ کوه و بیابان شو
گل از لختِ دلِ عشاق زیبد آن سرِ کو را

بہار سے کہہ دو کہ وہ کوہ و بیاباں کی مشاطگی کرے (یعنی انھیں جا کر شگفتگی عطا کرے) اس کے (یعنی محبوب کے) کوچے کے لیئے تو عاشقوں کے لخت دل کے پھول موزوں ہیں۔ گویا معشوق کے کوچے کی بہار عاشقوں کے خون شدہ دلوں کے رنگین پھولوں ہی سے ہوتی ہے۔

نشان دور است غالب در سخن این شیوه بس نبود
بدین زورین کمال می آزمایم دست و بازو را

شاعری کا مقام (ہدف) بہت دور ہے۔ یہ اسلوب اس کے لیے کافی نہیں ہے میں تو صرف ایک سخت کماں لے کر اپنے دست و بازو کو آزما رہا ہوں۔

غزل نمبر (۳۵)

بادهٔ مشکبوی ما، بید و کنار کشت ما
کوثر و سلسبیل ما، طوبی ما، بهشتِ ما

ہماری شراب مشکبو ہی ہمارے لیے کوثر اور سلسبیل ہے اور بید و کنارِ کشت ہی ہمارے لیے طوبیٰ اور باغ بہشت ہیں۔

بسکہ غم تو بوده است تعبیه در سرشتِ ما
نسخهٔ فتنه می برد، چرخ ز سرنوشتِ ما

چونکہ تیرا غم ہماری طینت میں سمایا ہوا ہے اس لیے آسمان جفا پرور ہماری قسمت سے نسخہ فتنہ (نقل کر کے) لے جاتا ہے۔

یعنی عاشق کا غم آسمان کا عطا کیا ہوا نہیں ہے، محبوب کا دیا ہوا ہے۔ یہ تو ہمارے رگ و ریشے میں سمایا ہوا ہے۔

آسمان کی طرف اسے منسوب کرنا غلط ہے بلکہ آسمان تو خود اس غم سے دوستوں کو غم دینے کے طریقے سیکھتا ہے۔

حسرتِ وصل از چه رو، چون بخیال سرخوشیم
ابر اگر بایستد بر لب جوست کشتِ ما

جب ہم خیال دوست ہی میں سرمست و سرشار ہیں۔ تو پھر وصل، کی حسرت کیسی۔ اگر ابر تھم جاتا ہے (اور نہیں برستا) تو نہ برسے، ہماری کھیتی ندی کے کنارے پر ہے۔ (وہاں سے

سیراب ہولیں گے)۔

نور خرد در آگهی خواهشِ تن پدید کرد

صرفِ زقومِ دوزخ است نامیه دربهشتِ ما

عقل وخرد نے ہم میں خود آگاہی پیدا کی اور اس خود آگاہی یعنی شعور خودی نے ہم میں نفسانی خواہشات کو جنم دیا۔ ہمارے بہشت کی قوت نامیہ زقوم دوزخ پیدا کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ حضرت آدم کے شعور خودی نے ان میں خواہش حیوانی پیدا کی اور وہ جنت سے نکالے گئے اور خاک ارضی میں بھیج دیے گئے گویا وہ فضائے خلد میں ان کی نشو ونما ان کے لیے سامان دوزخ بن گئی۔

این همه از عتابِ تو ایمنیِ عدو چراست

ای به بدی و ناخوشی خوی تو سرنوشت ما

ہماری زندگی میں جو بدحالی اور ناخوشی تیری تندی خو سے ملتی ہے، اسے تو ہم اپنا مقدر سمجھ لیتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا رقیب تمہارے خشم وعتاب سے اتنا محفوظ کیوں ہے۔

بی خطر از خودی برآ، لب به انا الصنم کشا

شیوهٔ گیرودار نیست در کنشِ کنشتِ ما

لغت: "انا الصنم = میں صنم ہوں" "کنش" دستور العمل، طریق، رسم۔ کنشت، پارسیوں کا معبد (یہاں صرف معبد مراد ہے)۔

خودی کو بلا خوف و خطر ترک کر دے اور انا الصنم کا نعرہ لگا۔ ہماری عبادت گاہ کے

دستور کے مطابق یہاں کسی طرح کی باز پرس یا گرفت نہیں۔ (جو چاہے آزادہ روش اختیار کرلے)۔

باده اگر بود حرام، بزله خلاف شرع نیست

دل نهی به خوبِ ما، طعنه مزن به زشتِ ما

مولانا حالی اس شعر کی شرح یوں لکھتے ہیں: "زہاد کی طرف خطاب ہے جو شراب خواری اور رندانہ بذلہ سنجی دونوں کو برا سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر شراب حرام ہے تو بذلہ سنجی تو خلاف شرع نہیں۔ اگر تو شراب کو جو ہماری نفیس چیز ہے، پسند نہیں کرتا تو بذلہ سنجی، جو ہماری ادنی درجے کی چیز ہے، اس پر طعن مت کر"۔ مرزا غالب نے شراب کے لیے "خوب" اور بذلہ سنجی کے لیے "زشت" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو لطف سے خالی نہیں۔ یہ مرزا غالب کا خاص انداز فکر ہے۔

گفت بحکمِ حسرتی غالبِ خسته این غزل

شاد به هیچ می شود طبعِ وفا سرشتِ ما

بقول مولانا حالی کے یہ غزل مرزا صاحب نے مرزا مصطفیٰ خاں شیفتہ، حسرتی کے مکان پر ایک مشاعرے میں پڑھی تھی۔ مقطع میں انھوں نے مصرع کو تضمین کیا تھا۔ چنانچہ مولانا حالی اس غزل کی شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اب اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم سے جو اس طرح پر غزل لکھنے کی فرمائش کی گئی، ہماری طبع وفا سرشت، دوست کے اتنے ہی التفات سے شاد ہو جاتی ہے۔

غزل (نمبر۳۶)

دل تابِ ضبطِ نالہ ندارد خدای را
از ما مجوی گریہ بی ھای ھای را

لغت: ''خدای را'' کے الفاظ میں ''را'' قسمیہ ہے۔

''خدائی را'' کامفہوم ''خدا کے لئے'' ہے۔ دوسرے مصرعے میں ''مجوی'' میں یاے مشبع ہے یعنی اس کی آواز کو لمبا کیا گیا ہے جو فارسی کے اساتذہ کے نزدیک جائز اور فصیح ہے۔

ہمارے دل کو ضبطِ فریاد کی تاب نہیں ہے۔ خدا کے لیے ہم سے ایسے رونے کی، جس میں ہائے ہائے کی آواز نہ ہو توقع نہ رکھ۔

آید بچشم روشنی ذرہ آفتاب
بر ہر زمین کہ طرح کنی نقشِ پای را

جہاں بھی تیرا نقش قدم پڑتا ہے وہاں کے ہر ذرے کی چمک دھوپ کی طرح جگمگاتی ہے۔

مشتاقِ عرض جلوہ خویش است حسنِ دوست
از قرب، مژدہ دہ نگہِ نار سائی را

اس شعر کا پس منظر اہل تصوف کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا حسین ہے اور حسن کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنا جلوہ دکھائے۔ اسی جذبے کے ماتحت یہ کائنات معرض وجود میں آئی تھی۔ حسن ازلی نے اپنا

جلوہ دکھلایا اور پھر چھپ گیا لیکن کائنات کا ہر ذرہ ابھی تک اس کی تلاش میں سرگرداں ہے شاعر کا عقیدہ ہے کہ حسن اپنا جلوہ دکھانے کے لیے بیتاب ہے اس لیے وہ ہماری نگاہوں کے قریب ہے چنانچہ کہتا ہے کہ حسن دوست اپنے جلوے کی نمائش (عرض جلوہ) کا مشتاق ہے اس لیے تو اپنی نگاہوں کو جنھیں تو نارسا کہتا ہے اس کے قرب کی خوشخبری سنادے۔

حسن ازلی باوجود پنہاں ہونے کے ہر جگہ نمایاں ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوایاے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

آشفتگی بر اوجِ فنا، بال می زند
ای شعلہ داغ گرد و نگہدار جای را

لغت: ''بال زدن''۔ پرواز کردن۔ اڑنا۔ ''جائی نگہ داشتن'' = اپنی جگہ کا خیال رکھنا، اپنی جگہ پر قائم رہنا۔

شعلہ ابھرا ہوا ہوتا ہے، گویا وہ بلندی پرواز کرنا چاہتا ہے پھر شعلے میں ایک آشفتگی سی بھی ہوتی ہے اس کے برعکس ''داغ'' دبی ہوئی آگ کی علامت ہے جو ایک جگہ برقرار رہتی ہے۔

شاعر نے آشفتگی محبت کے لیے شعلے کا استعارہ استعمال کیا ہے وہ جذبۂ محبت جب جوش میں آکر نمایاں ہو جائے۔ شاعر کے نزدیک یہ آشفتگی جذبۂ محبت کو ختم کر دیتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر ضبط کیا جائے تو جذبہ محبت کی گرمی ایک داغ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن یہ داغ پائدار ہوتا ہے چنانچہ شاعر کہتا ہے۔

آشفتگی فنا کی بلندیوں پر پر مارتی ہے اے شعلۂ (آشفتگی) تو داغ ہو جا اور پھر اس مقام پر قائم رہ۔

واماندگی است بی سپر وادیِ خیال

شوق تو جاده کرد رگِ خوابِ پای را

لغت: ''واماندگی'' تھک کررہ جانا ''بے سپر'' رہرو ''خواب پا'' انتہائی تھکن میں انسان کے پاؤں گویا سو جاتے ہیں، یہ خواب پا ہے ''پائے خفتہ'' وہ پاؤں جو سو جاتے ہیں۔

سفرِ شوق کی تھکن نے وادی خیال کو طے کرنا شروع کر دیا۔ تیرے شوق نے پائے خفتہ کی رگ ہی کو پگڈنڈی (جادہ) بنالیا۔

یعنی جب سفرِ عشق میں چلتے چلتے پاؤں تھک کر چور ہو گئے تو ہم خیال کی منزلیں طے کرنے لگے۔

سر منزل رسائی اندیشۂ خودیم

در ما گم است جلوہ پی رهنمائی را

کوئی راہ طے کرنی ہو تو اس کے لیے منزل مقصود کا ہونا ضروری ہوتا ہے اور منزل پر پہنچنے کے لیے رہنما درکار ہے۔

''جلوہ پے رہنمائے را'' کے الفاظ میں ''را'' اضافت کا ہے۔ مراد ہے جلوہ پے رہنما'' یعنی رہنما کے پاؤں کا جلوہ۔

کہتا ہے کہ ہمارے فکر کی رسائی کی منزل کیا ہے؟ وہ منزل ہم خود ہی ہیں ہمارے رہنما کی صورت ہم ہی خود میں گم ہے۔

یعنی ہم کسی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں، یہ کسی رہنما کو معلوم نہیں۔ یہ ہم خود ہی جانتے ہیں اور خود ہی اپنے رہنما ہیں۔

از پیچ و تاب آز ستوهند سر کشاں

انگشت زینهار شمر هر لوالی را

لغت: ''انگشت زینہار'' = زینہار کا مطلب پناہ ہے۔ جب کوئی شخص مخالف کے مقابلے میں ہار کر پناہ مانگنا چاہتا ہے تو وہ انگلی کھڑی کر دیتا ہے جسے ''انگشت زینہار'' کہتے ہیں۔
''لوا'' ۔جھنڈا ''ستوہ'' مغلوب، عاجز۔

سرکش لوگ اپنے حرص و آز کے پیچ و تاب کے باعث عاجز ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی سرکشی کا جھنڈا، جھنڈا نہیں ہوتا بلکہ ''انگشت زینہار'' ہوتی ہے جو وہ عاجز ہو کر اٹھاتے ہیں۔

حسنِ بتان ز جلوۂ نازِ تو رنگ داشت

بی خود بہ بوی بادہ کشیدیم لای را

دوسرے حسینوں کے حسن میں اگر رنگینی کی جھلک تھی تو وہ تیرے جلوۂ حسن کی بدولت تھی.. ہم بوئے شراب سے بے خود ہو کر یونہی تلچھٹ (لا) ہی پیتے رہے۔

شاعر نے اپنے محبوب کے حسن کو شراب ناب کہا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے حسینوں کے حسن کو دردِ شراب یعنی تلچھٹ کا نام دیا ہے۔ عاشق اس شراب ناب کی بو سے اتنا سرمست تھا کہ اس کے تصور میں تلچھٹ کو شراب سمجھ کر پیتا رہا۔

دینا والے، مادی حسن کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہ سارے مظاہر حسن درحقیقت حسن ازلی کے پرتو ہیں۔

گوید تغافل تو کہ رد کردۂ تو ام

از پشتِ چشم می نگرم، پشت پائی را

تیرا انداز تغافل بتا رہا ہے کہ میں تیرا رد کیا ہوا ہوں۔ میں پشتِ چشم سے اپنی پشت پا کو دیکھتا ہوں یعنی میں سامنے دیکھنے کی بجائے پیچھے کو دیکھتا ہوں اور لوٹ جانے کا تصور کرتا ہوں اور یہ تیری بے التفاتی کا نتیجہ ہے۔

یا رب بہ بالِ تیغ کہ پرواز می کند

ننگ است دوشِ فرقِ بلندی گرای را

لغت: ''پرواز می کند'' کا فاعل فرق ہے جو دوسرے مصرعے میں آیا ہے ''بلندی گرائے'' جس کا رجحان بلندی کی طرف ہو۔ سربلند۔ اے خدا میرا سر بلند کسی کی تلوار کے پروں کے سہارے پرواز کر رہا ہے کہ کندھے پر ٹھہرتے ہوئے اسے عار آتی ہے۔

یعنی محبوب تلوار لیے ہمارے قتل کو آ رہا ہے اور میرا سر اس فخر سے بلند ہو رہا ہے کہ اسے کندھوں پہ پڑے رہنا گوارا نہیں۔ معشوق کا تیغ بدست ہونا مژدہ شہادت ہے جو عاشق کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ اس سے اسے احساس سربلندی نصیب ہوا ہے۔

گر چشم اشک از وست و گر سینہ آہ از وست

با کیست داوری دلِ دردآزمای را

لغت: ''دل درد آزما'' = شاعر نے ذو معنی بات کی ہے اس سے مراد وہ دل ہے جو درد مند ہے لیکن درد مند اور دل درد آزما میں فرق ہے۔ دل درد آزما وہ دل ہے جو ہر نئے درد کو سینے سے لگاتا ہے اور آزماتا ہے اور شدید سے شدید تر درد کی جستجو میں رہتا ہے۔

مرزا غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو درد بھی ہے، محبوب ہی کا عطا کیا ہوا ہے، پھر شکایت کس بات کی۔

چنانچہ کہتے ہیں اگر آنکھ ہے تو اس کے آنسو اسی کی طرف سے ہیں اور سینہ ہے تو اس کی آہیں اسی کی عنایت ہیں۔ پھر یہ ہمارا دل درد آزما کس کے خلاف دادرسی چاہتا ہے۔

مُردم ز فرطِ ذوق و تسلی نمی شوم

یا رب کجا برم لبِ خنجر ستای را

مجھے دوست کے خنجر نے بے حد مزہ دیا ہے۔ میں نے اس کی تعریف میں جان دے دی لیکن تسلی نہیں ہوئی۔

اے خدا اس لب خنجر ستا کو کہاں لے جاؤں کہ جہاں مجھے اطمینان حاصل ہو۔

غالب بریدم از ہمہ خواہم کہ زین سپس

کنجی گزینم و بہ پرستم خدای را

اے غالب میں نے سب سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے بعد کسی ایک گوشے کو چن لوں اور وہاں بیٹھ کر ایک خدا کی پوجا کروں۔
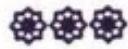
غزل نمبر(۲۷)

تا دوخت چاره گر، جگر چار پاره را
از بخیه خنده بر دمِ تیغ است چاره را

جب سے چارہ گر نے ہمارے جگر کو، جس کے چار ٹکڑے ہو چکے ہیں، سیا ہے، اس چارے سے جو بخیہ ہوا ہے وہ تلوار کی دھار پر ہنس رہا ہے۔

وہ زخم ہی کیا ہے جس کی چارہ گری ہو سکے۔ چنانچہ خود بخیہ (جس کی صورت خندۂ دنداں نما کی سی ہوتی ہے) دمِ تیغ یعنی تلوار کی دھار پر خندہ زن ہے کہ کوئی ایسا زخم نہ لگا سکی جو کار گر ثابت ہوتا۔

با اضطراب دل ز هر اندیشه فارغم
آسایشی است جنبشِ این گاهواره را

ہم اپنے دل کے اضطراب کی بدولت دنیا کے ہر طرح کے تفکرات سے فارغ ہیں اس گاہوارے کی جنبش گویا ایک آسائش ہے۔

گہوارے کا ہلنا بچے کو سکون دیتا ہے۔ شاعر نے اضطراب دل کے لیے جنبش گہوارہ کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ اس میں ندرت فکر و بیان پوشیدہ ہے۔ اس میں ایک محاکاتی کیفیت ہے اس سے ایک لطیف تجربہ مجسم ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

چون شعله هم ز روی تو پیداست خوی تو
تا کی به تاب باده فریبی نظاره را

تیرے چہرے کی سرخی سے، شعلے کی طرح، تیری، خو کی تندی اور گرمی ظاہر ہوتی ہے۔ لوگ کب تک تیرے حسن کے نظارے سے یہ دھوکا کھائیں گے کہ یہ سرخی شراب کے نشے کی وجہ سے ہے۔

سرگرمِ مهر شد دلِ چرخ ستیزه خو
چندان که داغ کرد جبینِ ستاره را

چرخ ستمگار کا دل محبت سے اس قدر گرم ہوگیا ہے کہ ستاروں کی جبیں جل کر رہ گئی۔

گویا آسمان محبت پر اتر آئے تو وہ محبت بھی ستم ڈھاتی ہے۔ ستارے کیا ہیں، اسی محبت کے داغ ہیں۔

دانی که ریگِ بادیهٔ غم روان چراست
اینجا گسسته اند، عنانِ شماره را

تو جانتا ہے کہ بیابانِ غم کی ریت رواں کیوں ہے۔ اس جگہ شمار کی باگ ڈور ٹوٹ گئی ہے، یہاں غم کے طوفان کی کوئی روک تھام نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی معینہ مدت ہے۔

قدیم زمانے میں وقت کا اندازہ شیشۂ ساعت سے کیا جاتا تھا۔ دو شیشے (بوتلیں) ایک دوسرے کے اُوپر ہوتی تھیں اور اُن کے منہ ملے ہوتے تھے۔ اوپر کی شیشی میں ریت ہوتی تھی جو ایک معین وقت میں لڑھک کر نیچے کی شیشی میں آجاتی تھی۔ پھر اُس بھری ہوئی شیشی کو اوپر کر دیتے تھے اور ریت اسی طرح روانی سے گر کر نیچے کی شیشی میں آجاتی تھی۔

مرزا غالب نے غم کی رو کو ریگِ رواں کہا ہے جس کی روانی کی کوئی حد نہیں۔

گیتی ز گریه ام ته و بالاست، بعد ازین
جویند در میانهٔ دریا کناره را

دینا میرے طوفان گریہ سے تہ و بالا ہو چکی ہے۔ اس کے بعد کنارے کو سمندر کے وسط میں تلاش کیا جائے گا، یعنی سمندر اور ساحل میں کوئی فرق نہیں رہا۔

ای لذتِ جفائی تو در خاک بعدِ مرگ

با جان سرشتہ، حسرت عمرِ دوبارہ را

تیری جفا میں وہ لذت ہے کہ مرنے کے بعد جب ہم خاک میں دفن ہوں گے تو ہماری روح میں، دوبارہ زندگی حاصل کرنے کی حسرت کی آمیزش کردی جائے گی۔

یعنی مرکر یہ خواہش ہوگی کہ ہمیں دوبارہ زندگی مل جائے تا کہ ہم تمہارے جور و ستم کے مزے اٹھا سکیں۔

جوھر دمید زائنہ دل ختہ تا کجا

دزدد بہ خود ز بیمِ نگاھت، اشارہ را

آئینے کا جوہر پھوٹ نکلا ہے آخر یہ بے چارہ دل خستہ کب تک تیری خشمگیں نگاہوں کے اشاروں سے خوف زدہ ہوکر اپنے آپ میں سموتا چلا جائے۔

یعنی حسن کی خشم آلود نظروں سے آئینہ بھی سہما ہوا ہے۔

خونم ستادہ بود بدرد فسردگی

دل داد پائی مردی تیغت گذارہ را

لغت: ''گذارہ'' = وہ چیز جو حد سے گزر جائے۔ انتہائی حالت۔ میرا خون افسردگی سے ٹھہر گیا تھا۔ اس میں روانی نہ رہی تھی اور اس میں بہنے کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی۔ آخر دل نے

تیری تلوار کو انتہائی قوت و استقامت عطا کردی یعنی تیری تلوار ہی سے ہمارا خون بہہ نکلا ورنہ وہ ایک طرح منجمد ہو چکا تھا۔

شمع از فروغِ چہرۂ ساقی در انجمن

چون گل بسر ز دست زمستی نظارہ را

بزم میں چہرۂ ساقی کی تابناکیاں دیکھ کر شمع بھی مست ہوگئی اور مستی میں اُس نے اس کے حسن کے نظارے کو پھول کی طرح سر پر جگہ دی، یعنی شمع جو محفل میں سرچشمہ روشنی تھی، خود ساقی کے حسن کی گرویدہ ہوکر رہ گئی۔ گویا اس کا نور ساقی کے چہرۂ درخشاں کے سامنے دب گیا۔

بنگر نخست تا ستم از جانب کہ بود

با شیشہ داوری پی داد است خارہ را

لغت: ''خارہ'' = سخت پتھر۔ تو دیکھ پہلے پہل ستم کس کی جانب سے ہوا تھا۔ ایک سخت پتھر یونہی شیشے کے خلاف داد رسی کر رہا ہے۔

یعنی ہمارا نازک دل توڑنے والا تو وہ سنگدل خود ہے ہم پر یونہی طعنہ زن ہو رہا ہے۔

داغم زبخت گر ھمہ اوجِ اثر گرفت

آہ از سپھر ریخت بہ فرقم شرارہ را

میں اپنے بخت کے ہاتھوں جل گیا کہ جس کو اثر انگیزی میں یہ بلندی نصیب ہوئی کہ میری آہ آسمان پر پہنچ کر لوٹ آئی اور شرارہ بن کر میرے سر پر گری۔

مرزا غالب نے آہوں کی بے اثری کو طنزیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ یعنی آہ کا اثر تو کیا

ہوتا۔ وہ خود آگ بن کر لوٹی اور ہمیں کو جلا گئی۔

غالب مر از گریہ نوید شہادتی ست
کاین سبحہ رنگ داد بہ خون استخارہ را

لغت: ''سبحہ'' = تسبیح۔ ''استخارہ'' = لغت میں (خدا سے) خیر طلب کرنے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں کسی کام کے انجام کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا استخارہ کہلاتا ہے۔ اس کے کئی ایک طریقے ہیں۔ عام طریقہ یہ ہے کہ دعائے قنوت یا کوئی اور دعا پڑھ کے سو جاتے ہیں۔ پھر جو کچھ خواب میں دکھائی دیتا ہے اور اسی سے نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ اہل تشیع کے یہاں یہ دستور ہے کہ دعائیں مانگ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ایک تسبیح اٹھا کر اس کا تقریباً تہائی حصہ مٹھی میں لے لیتے ہیں اور پھر باقی دانے دو دو کر کے تسبیح کے امام تک گنتے جاتے ہیں۔ اگر باقی ایک دانہ رہ جائے تو علامت خیر تصور کرتے ہیں اور دو رہ جائیں، دوسرے لفظوں میں پورے پورے دو دو گنے جائیں، تو یہ علامت شر ہوتی ہے۔

مرزا غالب نے آنسوؤں کے تار کو سبحہ یعنی تسبیح کا نام دیا ہے اور چونکہ وہ خون کے آنسو ہیں اس لیے اس گریہ کو شہادت کی علامت یا خوشخبری کہا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

اے غالب! میرا گریہ (رونا) میرے لیے شہادت کی بشارت ہے۔ اس تسبیح (یعنی آنسوؤں کے تار) نے خون سے استخارہ کو رنگین بنا دیا ہے۔ عاشق اشک ہائے خون کی تسبیح لیے استخارہ کر رہا ہے۔ اور استخارے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی شہادت واقع ہوگئی یعنی وہ رو رو کر جان دے دے گا۔

❀❀❀
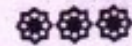
غزل (نمبر ۳۸)

قضا آئینہ دار عجز خواہد نازِ شاہی را
شکستی در نہادستی ادای کج کلاہی را

لغت: ''شکست'' کے لغوی معنے ٹوٹنے کے ہیں۔ اس کا ایک مفہوم شکن کا بھی ہے۔ چنانچہ ''شکست زلف'' سے مراد شکن زلف ہے۔ شعر میں شکست کا لفظ ذو معنی ہے اس سے ادائے کج کلاہی کی شان کا ٹوٹنا بھی مقصود ہے اور کلاہ کج یعنی ٹیڑھی ٹوپی کی شکن بھی۔

''کج کلاہی'' ناز و غرور کی علامت ہوتی ہے۔ اسی شان کج کلاہی میں ایک انداز شکست بھی ہوتا ہے یعنی اس میں شکن بھی ہوتی ہے اور ناز و انداز کا پہلو بھی۔

چنانچہ شاعر کہتا ہے: معلوم ہوتا ہے کہ ناز شاہی کے مقدر میں عجز و نیاز لکھا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کج کلاہی کی ادا کی طینت میں شکست مضمر ہے۔

طبیعی نیست ہر جا اختلاط، از وی حذر خوشتر
کم از سوزندہ آتش نیست آبِ گرمِ ماہی را

دو چیزوں کا باہمی اختلاط ہر وقت فطری امر نہیں ہوتا۔ اس سے بچنا ہی لازم ہے۔ دیکھ لو، مچھلی کے لیے گرم پانی جلا دینے والی آگ کی طرح ہوتا ہے۔ پانی مچھلی کی زندگی ہے لیکن یہی پانی اگر گرم ہو تو پانی اور مچھلی کا ملاپ غیر طبیعی ہو جائے گا۔

زرحتِ خوابم آتش پارہ ہارفت است میداند
تنم در لرزہ افگند است باد صبحگاہی را

لغت: ''رخت'' = خواب بستر'' آتش پارہ'' = آگ کے ٹکڑے یعنی چنگاریاں۔

بادِ سحری نے میرے بستر سے چنگاریاں جھاڑ دی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ میری گرمیٔ عشق نے ہوا کو لرزے میں ڈال دیا ہے۔

نماند از کثرتِ داغِ غمت آن مایہ جا باقی

کہ داغی در فضائی سینہ اندازد سیاھی را

تیرے غم کے داغوں کی کثرت سے اتنی جگہ بھی باقی نہیں کہ کوئی داغ سینے میں سیاہ نشان ڈال سکے۔

یعنی سینہ داغہائے غم اتنا سیاہ ہو چکا ہے کہ اب مزید سیاہی کی گنجائش نہیں رہی۔ مقصودِ شاعر یہ ہے کہ محبوب کے غم کے داغوں کے سوا کوئی اور داغ ہمارے سینے میں نہیں سما سکتا۔

شبنم تاریک و منزل دور و نقش جادہ ناپیدا

ھلاکم جلوۂ برقِ شرابِ گاہ گاھی را

پہلے مصرعے میں شاعر نے زندگی کی مشکلات کا تذکرہ یوں کیا ہے کہ میری رات تاریک ہے، منزل دور ہے۔ اور راستے کا نشان نہیں ملتا۔ یہاں اتنا ضرور ہے کہ کبھی کبھی شراب میسر آتی ہے اور اس اندھیری فضا میں ایک چمک پیدا کر جاتی ہے۔

ایک غمزدہ انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایک جام ے کا میسر آ جانا جس سے وہ اتنا غم غلط کر سکے ایسا ہی ہے جیسے سیاہ بادلوں میں گھری ہوئی فضا میں بجلی کی چمک ایک لمحے کے لیے اجالا کر جاتی ہے۔

شاعر نے اس کیفیت کو بڑے بلیغ اور موثر محاکاتی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ذرا اس

فارسی روزمرہ کو دیکھئے:

ھلاکم جلوۂ برق شراب گاہ گاہی را

''یعنی اس شراب گاہ گاہ کے جلوۂ برق کے قربان جاؤں'' سا خوبصورت انداز بیان ہے۔

چہ رومی سازی ای آئینہ، آہ از سادگی ھایت

بہ من بگذار گفتم شیوۂ حیرت نگاھی را

اے آئینہ! تو کیا منہ بنا رہا ہے۔ تیری ان سادگیوں پر افسوس۔ اس شیوہ حیرت نگاہی کے طریق کو مجھ پر چھوڑ دے، یعنی جلوۂ حسن کو دیکھ کر آئینہ حیرت زدہ ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ روگ اس کے بس کا نہیں، اسے عاشق پر چھوڑ دینا چاہئے۔

ودیعت بودہ است اندر نھادِ عجز ما نازی

جدا از قطرہ نتوان کرد طوفان دستگاھی را

لغت: ''نہاد'' فطرت، طینت ''طوفان دستگاہی'' = طوفان کی صلاحیت کا ہونا۔

شاعر نے قطرے کو طوفان دستگاہ کہا ہے کہ وہ اگرچہ بظاہر ایک حقیر سا قطرہ ہے لیکن اس میں سمندر پوشیدہ ہے۔

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر

ہر قطرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں سمندر ہوں۔ انسان ایک قطرہ ہے جو بحرِ حقیقت سے الگ ہو چکا ہے لیکن اس میں سمندر کی سی ساری صلاحیتیں اور وسعتیں موجود ہیں۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے۔ ہمارے عجز و نیاز کی طینت میں ہی ناز ودیعت کیا گیا ہے۔ قطرے سے طوفان کی وسعتیں جدا نہیں کی جا سکتیں۔

همانا کز نوآموزانِ درسِ رحمتی زاهد!
به ذوق دعوی ازبر کرده بحث بی گناهی را

لغت: "نوآموز" = مبتدی جو سبق کو رٹ لیتے ہیں۔

اے زاہد! تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا درس سیکھنے والے مبتدیوں میں سے ہے۔ تو نے یونہی جوش دعویٰ میں اپنے آپ بے گناہ ہونے کی رٹ لگائی ہے اور خود کو بے گناہ سمجھ لیا ہے۔ یہ تیرا خیال خام ہے۔

دلا گر داوری داری بچشم سرمه آلودش
نخستم بی زبان کن تا بکار آیم گواهی را

کہتے ہیں کہ سرمہ کھا لینے سے انسان کا گلا بند ہو جاتا ہے۔ اور اس کی آواز نہیں نکلتی۔
محبوب کی چشم سرمہ آلود یعنی سرگیں آنکھوں کے التزام سے اپنے بے زبان ہونے کی بات کی ہے۔ کہتا ہے کہ اے دل اگر تجھے اس کی چشم سرگیں کے خلاف دعویٰ کرنے اور دادرسی کا خیال ہے تو پہلے مجھے بے زبان کر لے کہ میں گواہی کے کام آسکوں اور کہہ سکوں کہ ہاں اس کی سرمہ آلود آنکھوں کی اثر انگریزی کو دیکھنا ہے تو میری زبان گنگ کو دیکھ لو۔
مقصود یہ ہے کہ محبوب کی سرمہ آلود آنکھوں کے اثر کا تقاضا خموشی ہے۔

مرو در خشم گر دستی بدامانِ تو زد غالب
وکیلش من، نمی داند طریقِ داد خواهی را

اگر غالب نے بے ساختہ ترے دامن پر ہاتھ مارا ہے (اسے پکڑ لیا ہے) تو غصے میں مت آ۔ میں اس کی وکالت کرتا ہوں، وہ بے چارہ دادخواہی کے طریق سے ناآشنا ہے۔

❀❀❀
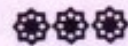
غزل نمبر(۳۹)

لرزه دارد خطر از هیبتِ ویرانهٔ ما
سیل را پائی به سنگ آمده در خانهٔ ما

لغت: "پائے بہ سنگ آمدن" = ٹھوکر کھانا، عاجز ہو جانا۔

ہمارے ویرانے کی ہیبت دیکھ کر، خطر خود کانپ جاتا ہے۔ سیلاب ہمارے گھر سے ٹکرا کر گر پڑتا ہے، یعنی ہم وہ مشکل پسند لوگ ہیں۔ کہ خطرات ہمیں دیکھ کر لرز جاتے ہیں۔

چشم بر تازگیِ شورِ جنون دوخته است
در خزان بیش بود مستیِ دیوانهٔ ما

بہار آتی ہے تو دیوانے کا جنوں جوش پہ آتا ہے۔ لیکن مرزا غالب کا جنوں شرمندہ بہار نہیں۔ وہ خزاں میں بھی تازہ رہتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔
ہمارے دیوانے کی مستی خزاں میں بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے کہ (بہار کی تازگی کی بجائے) اس کی نظریں جنوں کی تازگی پر لگی ہوتی ہے۔

می باندازه حرام آمده، ساقی برخیز
شیشهٔ خود بشکن برسرِ پیمانهٔ ما

ساقی سے خطاب کر کے شاعر کہتا ہے کہ اے ساقی! شراب اعتدال کے ساتھ پینی حرام ہے تو اٹھ اور اپنا شیشہ یعنی صراحی ہمارے گلاس پر دے مار۔
اس شعر کے سلسلے میں مولانا حالی فرماتے ہیں" جب کسی چیز کی طلب اور خواہش حد

سے گزر جاتی ہے تو اس بات کی حد نہیں رہتی کہ اپنے ظرف کے موافق اس کی خواہش کی جائے۔ جب پانی کی پیاس نہایت شدت سے ہوتی ہے۔ تو پیاسا دریا کو دیکھ کر یہ چاہتا ہے کہ سارے دریا کو پی جائے"۔

تنگی اش نام بر آوردہ تماشا دارد
در پیِ مور فرورفتنِ کا شانۂ ما

لغت: "تنگی اش میں "ش" کی ضمیر کاشانے کے لیے آئی ہے" "کاشانہ" = گھر۔
ہمارا گھر تنگ ہونے کے باعث ممتاز ہو گیا ہے۔ ایک چیونٹی کے لیے اس کا زمین میں غرق ہو جانا بھی ایک عجیب نظارہ ہے۔

بہ چراغی نہ رسیدیم درین تیرہ سرا
شمعِ خاموش بود طالعِ پروانۂ ما

اس تاریک گھر میں ہمیں ایک چراغ بھی میسر نہ آیا۔ ہمارے پروانے کی قسمت میں ایک بجھی ہوئی شمع لکھی ہوئی ہے۔
اس دنیا کے مال و منال پہ جان دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی پروانہ بجھی ہوئی شمع پر لپکے۔

دمِ تیغت تنک و گردنِ ما باریک است
آفرین بر تو و بر ھمتِ مردانۂ ما

تمہاری تلوار کی دھار بھی نازک ہے اور ہماری گردن بھی نازک۔ تجھ پر اور ہماری ہمت مردانہ دونوں پر آفریں ہو۔ اس شعر میں محبوب اور عاشق دونوں پر طنز ہے۔ یعنی ہم کون سے سخت جان تھے کہ عشق میں مر کر کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دیا اور محبوب نے ہم جیسوں کی جان لے کر کون

سی مردانگی دکھائی ہے۔

دودِ آہ از جگرِ چاک دمیدن دارد
زلف خیز است زھی دستگہِ شانۂ ما

شاعر نے دودِ آہ کو زلف سیہ سے اور اپنے جگر چاک کو شانے سے تشبیہ دی ہے۔ بجائے اس کے کہ محبت میں عاشق کی محبوب کی زلفوں تک رسائی ہوتی اور وہ انھیں اپنے ہاتھوں سے سنوارتا اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ اب اس کا جگر چاک ہے اور اس سے آہیں اُبھر رہی ہیں گویا اس کا جگر چاک ایسا شانہ ہے جو اپنے دودِ آہ کی، جو سیہ زلفوں کی طرح ہے، شانہ کشی کر رہا ہے۔
شاعر نے اپنی انتہائی محرومی اور شدت غم کی تصویر کھینچی ہے۔

خوش فرو می رود افسون رقیب در دل
پنبۂ گوش تو گردد مگر افسانۂ ما

کانوں میں روئی رکھنے سے آواز سنائی نہیں دیتی۔ شاعر نے رقیب کی جھوٹی باتوں کے طلسم کو افسون اور اپنی داستان محبت کو افسانہ کہا ہے۔ محبوب سے کہتا ہے کہ رقیب کی جھوٹی باتیں تو تمہارے دل میں اتر جاتی ہیں اور ہماری سچی داستان محبت شاید تمہارے کانوں میں پہنچ کر روئی (پنبۂ گوش) بن جاتی ہے، یعنی بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔

مو برآید ز کفِ دست اگر دھقان را
نیست ممکن کہ کشد ریشہ سر آز دانۂ ما

انسان کی ہتھیلی میں بال نہیں اُگتے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر دہقان (کاشت کار) انتہائی

محنت سے کام لے، یہاں تک کہ اس سخت کوشی ہی میں اس کی ہتھیلی میں بال بھی اُگ آئیں، تو بھی ہمارے دانے سے کوئی ریشہ نہیں پھوٹے گا۔ اپنی ناکامی کوشش کو بیان کیا ہے۔

دادہ بر تشنگی خویش گواہی غالب
دھن ما بہ زبانِ خط پیانۂ ما

قدیم زمانے میں پیانہ یا جام مے پر خط کھنچے ہوتے تھے جس سے شراب کی مقدار کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ اور اس اندازے سے شراب پینے والوں کو ان کے ظرف اور حوصلے کے مطابق شراب پلائی جاتی تھی۔ لیکن ایک عالی ظرف رند کے لیے یہ حد بندی اسے پیاسا رکھنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ کہتا ہے: اے غالب! ہمارا دہن، خط پیانہ کی زبان سے یہ گواہی دے رہا ہے کہ وہ پیاسا ہے۔

مرزا غالب کا اردو شعر یہ ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

اسی طرح ایک اور جگہ کہتے ہیں:

کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کا

یعنی خطِ جام، شراب خوار کے عجز حوصلہ کی دلیل ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۴۰)

ای گل از نقشِ کف پائی تو دامان ترا
گلفشاں کردہ قبا سرو خرامان ترا

تا ز خونِ کہ ازین پردہ شفق باز دمد
رونق صبح بھار است گریبان ترا

تیرے گریباں میں صبح بہار کی سی رونق ہے۔ یہ کس کا خون ہے جو اس پردے (گریبان) سے شفق بن کر پھوٹ رہا ہے۔

شفق سے صبح بہار اور بھی رنگین اور شگفتہ نظر آتی ہے۔ شاعر محبوب کے جسم کی سرخی اور رنگینی کو، جو اس کے گریبان سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے، شفق کا نام دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کس عاشق کے خون کی سرخی ہے جو تیرے گریبان سے نمایاں ہو رہی ہے، یعنی کس محبت کی سرشاری نے تیرے جوبن کو یوں شگفتہ بنا رکھا ہے؟

ھر قدر شکوہ کہ در حوصلہ گرد آمدہ بود
گوی گردید بہ مستی خمِ چوگانِ ترا

لغت: چوگان ''پولو'' کے کھیل کو کہتے ہیں۔ جو ایک گیند (گوے) اور ایک چھڑی کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔

''حوصلہ'' عربی لغت میں پوٹے کو کہتے ہیں عام مفہوم ظرف و حوصلہ ہے کہتا ہے کہ جس قدر بھی ہم میں شکوہ کا حوصلہ پیدا ہوا تھا۔ وہ تیری تندی طبع کے خم چوگاں کے سامنے آ کر گیند

بن کر رہ گیا۔ یعنی تیرا سامنا ہوتے ہی سارے شکوے، جو ہمارے دل میں تھے، دب کر رہ گئے۔

جذبۂ زخم دلم کارگر افتاد، مبار
عطسہ غربال کند، مغز نمکدان ترا

اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ عاشق دل پر زخم کھائے ہوئے ہے اور معشوق اپنے جور وستم سے اس پر نمک چھڑک رہا ہے۔

کہتا ہے کہ میرے دل پر زخم کھانے کا جذبہ کمال کو پہنچ چکا ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں زخم کی تیزی سے تجھے چھینک نہ آئے اور تیرے نمکدان کا مغز چھلنی چھلنی نہ ہو جائے

ندمد بوی کباب از نفسِ غیر و خوشم
می شناسم اثرِ گرمیِ پنہانِ ترا

میں تیری محبت کی پوشیدہ حرارت کو خوب پہچانتا ہوں اور خوش ہوں کہ اس حرارت کا اثر رقیب پر مطلقاً نہیں ہوا کیونکہ اس کے سانس سے بوئے کباب نہیں ابھرتی۔

راحت دائمیِ ذوق طلب را نازم
گرد نمناک بود سایہ بیابانِ ترا

تیری تلاش میں پیہم چلا جا رہا ہوں اور اس تلاش و طلب میں مجھے راحت دائمی نصیب ہے اور میں اس بات پر نازاں ہوں۔ تیری طلب میں جس بیاباں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہاں کے گرد وغبار میں ٹھنڈک ہے اور وہی گرد وغبار سایے کا کام دیتی ہے۔

چشم آغشتہ بخون بین و ز خلوت بدر آ
اینک ابرِ شفق آلودہ گلستانِ ترا

خلوت سے باہر اور میری خون میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں دیکھ۔ یہ تیرے گلستاں (حسن) کے لیے ایک ابرِ شفق آلودہ ہے۔

آئی از بزم رقیب و سرِ راہت میرم
تا ربایم دلِ از ناز پشیمانِ ترا

تو بزمِ رقیب سے آ رہا ہے اور میں تیری راہ میں جان قربان کر رہا ہوں تاکہ اس طرح تیرے دل کو، جو اپنی نافرمائیوں پر پشیمان ہو رہا ہے، موہ لوں، یعنی شاید تجھے میری اس قربانی پر ندامت ہو۔

چہ غم از سیلی سنگِ ستمش کرد کبود
سبزہ زاری است تنم طرفِ خیابانِ ترا

نہ جانے کس غم نے اپنے جور وستم کی سنگ ریزیوں سے میرے جسم کو نیلگوں کر دیا ہے کہ وہ تیرے صحن گلستان کا سبزہ زار بن گیا ہے۔

فرصت باد کہ سر در سرِ کارت کردیم
آفتابِ لبِ بامیم شبستانِ ترا

لغت: ''سر در سر کارے کردن''۔ کسی کام کی دھن میں جان تک دے دینا۔ ''آفتاب لب بام'' = غروب ہونے والا آفتاب۔

ہم نے تیری محبت میں جان پر کھیل جانے کا تہیہ کرلیا ہے۔ اب ہم آفتاب لب بام ہیں اور کچھ دیر کے لیے تیرے شبستان ناز پر چمک رہے ہیں۔ اب تجھے کسی طرح کا کوئی فکر نہیں۔ اب تو ہے اور زندگی کی شادمانیاں۔

هر حجابی که دهد روی به هنگامهٔ شوق

پرده ساز بود زمزمه سنجانِ ترا

لغت: ''روئے دادن'' = ظاہر ہونا۔ واقع ہونا۔

''پردہ = حجاب'' اس کا دوسرا مفہوم ''سر'' ہے شعر میں اسی دوسرے مفہوم میں آیا ہے۔ ''زمزمہ سنجان تو'' تیری محبت کے نغمے گانے والا عاشق۔

حجاب کے لفظ کے اعتبار سے، جو مصرعے میں آیا ہے، پردے کا مفہوم حجاب ہونا چاہیے لیکن شاعر نے اس قریبی معنی کو چھوڑ کر اس کے بعیدی معنی لیے ہیں۔ ایسا کرنا ایک شعری صنعت ہے جسے ایہام کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے Ambiguity کہتے ہیں اور یہ صنعت شعر میں بڑی معنوی بلاغت پیدا کرتی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ محبت کے ہنگاموں میں جو حجاب بھی سامنے آتا ہے (جس سے تیری محبت کی حقیقت کا راز کھلتا ہے)

مرزا غالب کا یہ اردو شعر اسی مفہوم کا آئینہ دار ہے:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یعنی تو ہی ساز کے سروں سے آشنا نہیں ورنہ تو جسے حجاب سمجھتا ہے وہ دراصل اس ساز کا پردۂ (سر) ہے جس سے حقیقت کا سراغ ملتا ہے۔

فارغش ساخته از حسرت پیکان غالب

حق بود بر جگر ریش تو دندان ترا

لغت: ''پیکان اصل میں تیر کی نوک کو کہتے ہیں، پھر تیر کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ فارغش'' کی ش کی ضمیر کا مرجع ''جگر ریش'' ہے جو دوسرے مصرعے میں آیا ہے۔

عاشق کے دل میں محبوب کے تیر محبت کھانے کا جو شوق تھا وہ پورا نہ ہوا اور اس کے دل میں حسرت رہ گئی۔ اس نے اس دکھ میں دانتوں سے اپنا جگر کاٹ کاٹ کر زخمی کرلیا۔ اس سے اس کے زخمی جگر کو پیکان محبوب کھانے کی حسرت سے نجات مل گئی چنانچہ شاعر کہتا ہے۔

اے غالب! تیرے دانتوں کا تیرے جگر ریش پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اسے حسرت پیکاں کی خلش سے (جو دل میں رہ گئی تھی) فراغت دلائی ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۴۱)

غمت در بوته دانش گدازد مغز خامان را

لبت تنگ شکر سازد دهان تلخ کامان را

لغت: ''بوتہ'' = دھات کو گلانے والی کٹھالی۔

''تنگ'' = با تاے مضموم بوری اور ایسے برتن کو بھی کہتے ہیں جو نیچے سے کشادہ ہو اور اس کی گردن پتلی ہو۔

تیرا غم خام لوگوں کے مغز کو علم کی کٹھالی میں پگھلا دیتا ہے اور تیرے غم محبت سے خام لوگ پختہ دماغ ہو جاتے ہیں اور تیرے دہن کی شیرینی سے، تلخ کام یعنی آزردہ لوگ مسرت کی لذت سے آشنا ہو جاتے ہیں۔

قضا در کارها اندازهٔ هر کس نگه دارد
بقطع وادیِ غم می گمارد تیز گامان را

قدرت ہر معاملے میں ہر شخص کے ظرف اور حوصلے کو ملحوظ رکھتی ہے (اور اسی اعتبار سے انھیں کام سپرد کرتی ہے) چنانچہ وادی غم کو طے کرنے کا کام تیز رفتار رہبروں کے سپرد کیا جاتا ہے۔

زهستی پاک شو گر مردِ راهی کاندرین وادی
گرانی هاست رختِ رهروِ آلوده دامان را

لغت: ''مردِ راہ'' = سالک

''آلودہ دامن'' = وہ جس کا دامن کسی چیز سے آلودہ ہو، مجازاً گنہگار کو کہتے ہیں۔

یہاں ''رہروِ آلودہ داماں'' سے وہ شخص مراد ہے جو زندگی کی راہ میں علائق دینا کا بھاری بوجھ اٹھا کر چلے۔

''ہستی'' سے مقصود یہی علائق زندگی ہیں۔

اگر تو مرد راہ ہے تو اپنے آپ کو علائق دنیا سے پاک کر لے کیونکہ آلودہ داماں مسافر کا رخت سفر اسکے لیے بھاری بوجھ بن جاتا ہے (اگر ایسا کوئی بوجھ نہ ہو تو زندگی کا سفر آسانی سے کٹ جاتا ہے۔)۔

ناصر علی سرہندی نے اسی بات کو یوں بیان کیا ہے:

تو رہ از کثرت اسباب بر خود تنگ می سازی
سبک روحان چون بوی گل رها کردند محمل ها

دماغ فتنه می نازد، بسامانِ رسیدن ها
طلوعِ نشه گردِ راه باشد خوش خرامان را

لغت: ''سامان رسیدن ہا'' = رسیدن مے، نشے کے چڑھنے کو کہتے ہیں۔ سامان رسیدن ہا میں شراب کی تندی و تیزی و تلخی سبھی کچھ شامل ہے اسی کو شاعر نے دوسرے مصرعے میں طلوع نشہ کہا ہے۔

''دماغ فتنہ'' = فتنہ سے مراد شر ہے جو خیر کی ضد ہے۔ شر کو یہ دعوی ہے کہ اس کا سحر کار گر ہے لیکن خیر اس سے بے نیاز گزر جاتا ہے۔ مرزا غالب نے ایسے لوگوں کے لیے خوش خرام کا لفظ استعمال کیا ہے جو ایسی فتنہ خیز راہ سے تیزی کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور فتنے کے پیدا کردہ نشے کو گرد راہ کی طرح پیچھے چھوڑ جاتے ہیں

چنانچہ مرزا صاحب کہتے ہیں۔

فتنے کا دماغ اس بات پر نازاں ہے کہ اس کے پاس نشہ انگیزیوں کا پورا پورا ساز و سامان ہے، لیکن خوش خرام لوگ، یعنی سالکان راہ خیر کے لیے ''طلوع نشہ'' اپنی خوش خرامی سے اس گرد راہ کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور اپنا دامن بچا کر بہت آگے نکل جاتے ہیں۔

پی رسوائیِ اربابِ تقویٰ جلوهٔ سر کن
کتان ها ماهتابی ساز، شاهم نیک نامان را

لغت: ''وحل مشکلات = ''کتاں'' = ایک باریک اور نرم و نازک کپڑا ہوتا ہے اجس

کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ چاندنی میں پھٹ جاتا ہے۔ ''ماہتابی'' پھٹا ہوا کپڑا ''ماہتابی ساز'' یعنی اسے پھاڑ دے شاعر نے ارباب تقویٰ (پارسا لوگ) کو رسوا کرنے کے لیے نیک کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ انہیں نیک نام کہا ہے یعنی دراصل نیکوکار نہیں صرف نیک مشہور ہیں۔ کہتا ہے کہ ارباب تقویٰ کو رسوا کرنے کے لیے اپنے حسن کا ایک جلوہ دکھا اے میرے شاہ ان نیک نام لوگوں کے کتان جیسے نازک لباس تقویٰ کو پھاڑ دے (تاکہ ان کی صحیح حیثیت نظر آجائے)۔

بعرضِ ناز خوبان را، ز مابی تاب تر دارد
عنان از برق باشد در رهش زرین ستامان را

لغت: ''زریں ستام'' = ستام لگام کو کہتے ہیں زریں ستام وہ شہسوار ہیں جن کے گھوڑوں کی لگامیں سونے کی ہیں، یعنی اصحاب شان وشوکت مراد ہے۔ حسین لوگ جنھیں شاعر نے پہلے مصرعے میں ''خوباں'' لکھا ہے۔

جب وہ ناز وادا دکھاتا ہے تو حسین لوگ ہم سے زیادہ بے تاب ہو جاتے ہیں۔ اس کی راہ میں بڑے بڑے شاہسوارانِ حسن کی عناں برق کی ہوتی ہے، یعنی وہ بے تاب ہو کر فی الفور آگے سے گذر جاتے ہیں۔

خرابیم و رضایش در خرابی های ما باشد
زچشمِ بد نگهدارد خدا، ما دوست کامان را

لغت: ''خراب'' = مست، ویران اور تباہ حال تینوں معنوں میں آتا ہے ''دوست کام'' وہ شخص جس کی حالت دوستوں کی خواہش کے عین مطابق ہو یعنی اچھی حالت۔

ہم خود بھی خراب ہیں اور دوست کی خوشی بھی اسی میں ہے کہ ہم خراب حال رہیں۔ خدا

تعالیٰ ہم دوست کاموں کو نظر بد سے محفوظ رکھے، یعنی اللہ کرے ہم خراب حال ہی رہیں کیونکہ اس سے بڑھ کر کوئی بڑی خوش نصیبی نہیں ہو سکتی۔

بسا افتاده سرمست و بسا افتاده در طاعت
تو دانی تا به لطف از خاک برداری کدامان را

بہت سے تیری راہ محبت میں سرمست پڑے ہیں اور بہت سے بندگی اور اطاعت میں مصروف ہیں۔ اب تو ہی جانتا ہے کہ ان میں سے کن کو تو اپنے لطف وعنایت سے خاک پر سے اٹھا لے گا، یعنی کون تیری نظر میں مقبول ہوگا۔

یہاں نظیری نیشاپوری کا ایک شعر یاد آگیا کہتا ہے:

دو نیم گشته از کفر و دین، نمی دانم
کزین دو پاره دل، آید ترا بکام کدام

یعنی میرا دل کفر ودین کے باہمی ہنگامۂ ہائے نزاع سے دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ نہ جانے دل کے ان دو ٹکڑوں میں سے کون سا تجھے مرغوب ہوگا۔ (کفر والا یا ایمان والا)

ز قاتل مژدهٔ زخمی گلم در جیب جان ریزد
نشاط انگیز باشد بوی خون، خونین مشامان را

لغت: ''خونیں مشام'' جن کے دماغ میں خون کی بو سمائی ہو۔ قاتل کی طرف سے اس خوشخبری کا آنا کہ اس کے ہاتھوں محبت کا زخم لگے گا، ہماری روح کے جیب و داماں کو پھولوں سے بھر دیتا ہے۔ کیوں نہ ہو خونیں مشام لوگوں کے لیے بوے خوں فرحت افزا ہوتی ہے۔

جهان را خاصی و عامی است آن مغرور و این عاجز
بیا غالب ز خاصان بگور و بگزار عاماں را

دنیا میں خواص بھی ہیں اور عوام بھی۔ خواص مغرور ہیں اور عوام عاجز۔ اے غالب تو ان اصحاب خاص کو بھی نظر انداز کر دے اور عامیوں سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لے۔

❀❀❀
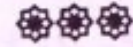
غزل نمبر (۴۲)

نگویم تازه دارم شیوه جادو بیانان را
ولی در خویش بیم کار گر جادوی آنان را

میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے جادو بیاں شاعروں کے اسلوب شاعری کو تازہ رکھا ہے، البتہ اُن کے سحرفن سے مسحور ضرور ہوا ہوں۔

همانا پیشکارِ بختِ ناسازم به تنهائی
ستوه آورده ام از چاره جوئی مهربانان را

میں تنہائی میں اپنے بخت ناساز گار کا خدمت گزار بنا بیٹھا ہوں۔ میں نے اپنے مہربان غم گساروں سے چارہ جوئی کا تقاضا کرتے کرتے انھیں عاجز بنا دیا ہے۔ اور اب میں اپنے بخت ناساز گار کی خدمت میں مصروف ہوں۔

یعنی میرے تمام چارہ ساز احباب میری چارہ سازیوں سے عاجز آ چکے ہیں۔ اب میں اکیلا اپنی بدبختی کو سنوارنے میں مصروف ہوں۔

ندارد حاجتِ لعل و گهر حسن خدا دادت
عبث در آب و آتش راندهٔ بازارگانان را

کہا جاتا ہے کہ آفتاب کی مسلسل گرمی سے سنگریزے لعل بن جاتے ہیں۔ لعل کا رنگ بھی آتشیں ہوتا ہے گوہر پانی میں ہوتا ہے اور پھر اس میں آب بھی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے شاعر شعر کے دوسرے مصرعے میں آب و آتش کے الفاظ لایا ہے جو بڑے موزوں ہیں کہتا ہے:

تیرے حسن خدا داد کو لعل و گوہر کی حاجت نہیں ہے۔ تو نے سوداگروں کو بے سود آب و آتش میں دھکیل دیا ہے۔ (جہاں وہ موتی اور لعل و جواہر ڈھونڈتے پھرتے ہیں)

چه بی برگی است جان دادن به زخمی زان دمِ خنجر
هلاکستم هستم فراخی هائی عیشِ سخت جانان را

لغت: ''بے برگی'' = بے مائگی۔ یہاں زبوں ہمتی یا کم ہمتی مقصود ہے۔

اس (محبوب) کے خنجر کی دھار سے ایک زخم کھا لینے پر جان دے دینا کتنی کم ہمتی ہے۔ میں تو اس بے پناہ وسعت نشاط و مسرت کا شہید ہوں جو سخت جانوں کو نصیب ہوتی ہے (کہ مزے سے زخم پہ زخم کھاتے چلے جاتے ہیں اور سخت جان ہونے کے باعث مرتے بھی نہیں کہ کہیں یہ لذت ختم نہ ہو جائے)۔

عوض دارد گر آزار دلم آزرده می خواهم
به قتل خویش دست و ساعدِ نازک میانان را

اگر میرے آزار دل کا کوئی عوض ہے تو وہ یہی کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے قتل میں نازک کمر محبوب کے دست و بازو (کلائی) بھی آزردہ ہوں۔

سراغ فتنہ ھای زھرہ سوز از خویشتن گیرم
رگ اندیشہ نبضِ کار باشد کار دانان را

لغت: ''فتنہ'' = محبت کا ہنگامہ۔

''زہرہ'' = پتا ''فتنہ ہائے زہرہ سوز'' محبت کی زہرہ گداز کیفیتیں۔ مجھے اپنی حالت ہی سے محبت کی زہرہ گداز کیفیات کا سراغ مل جاتا ہے۔ کارفہم لوگ، رگ فکر ہی سے کام کی نبض پہچان لیتے ہیں۔

بہ لفظ عشق صد رہ کوہ و دریا درمیان گفتن
بیاموزید تا پیشش برید افسانہ خوانان را

لغت: ''صدرہ'' = لفظی معنے سو راستے ہیں، مراد سو انداز سے شاعر یہ کہتا ہے کہ عشق میں ہزاروں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عشق نام ہے ہزاروں کٹھن منزلوں سے گزرنے کا۔ عشق میں کئی ایک مصیبتوں کے پہاڑ طے کرنے پڑتے ہیں اور سمندروں کے طوفانوں سے گزرنا پڑتا ہے عشق سے مقصود ایسی ہی کٹھن مشکلات ہیں چنانچہ اس مفہوم کو یوں ادا کیا:

لفظ عشق کی شرح بیان کرنے کے لیے ہزار انداز میں عشق کے افسانہ خوانوں کو کوہ و دریا کا تذکرہ کرنا سکھاؤ، پھر اس کے روبرو لے جاؤ۔

نہ بینی برگ رز زر گشت و گل کبریت احمر شد
کند پائیز گوئی کیمیا گر باغبانان را

کبریت گندھک ہے۔ ''کبریت احمر'' سرخ گندھک جو کمیاب ہے۔ ''پائیز'' = خزاں۔

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ انگور کے پتے سونا بن گئے اور گلاب کا سرخ پھول کبریت احمر بن گیا ہے۔ گویا خزاں نے باغبانوں کو کیمیا گر بنا دیا ہے، یعنی خزاں نے اکسیر کا کام کیا کہ جہاں انگور کی بیل تھی اس کے پتے زرد ہو کر سنہری ہو گئے اور سرخ پھول سرخ گندھک دکھائی دینے لگا۔ خزاں کیا آئی گویا کوئی اکسیر گر آ گیا جس نے چیزوں کی ہیئت کو بدل دیا۔

مراد یہ ہے کہ خزاں میں بھی اپنا ایک حسن ہوتا ہے شاعر نے رز اور زر دو لفظ استعمال کیے ہیں جن میں ترکیب حروف کی ضد ہے۔ یہ ایک لفظی صنعت ہے جسے تجنیس خطی کہنا چاہیے۔

مرنج از ناروائی، بی نیازی عالمی دارد
حکایت ھا بود با خویشتن مر بی زبانان را

دوسروں سے بات نہ کرنا اور خموش رہنا ایک ناروا سی بات ہے، اس سے بے نیازی ٹپکتی ہے لیکن اس میں بھی ایک شان ہوتی ہے۔

ہم جو بے نیاز ہیں تو اسے ناروا خیال نہ کر، بے نیازی کی بھی ایک شان ہوتی ہے۔
بے زبان لوگ اپنے آپ سے محو گفتگو ہوتے ہیں اور ہزار ہا باتیں کرتے ہیں۔

نگیرد دیگران را حق بہ جرمی کز یکی بخشد
سرت گردم شفیعی روز محشر دلستانان را

مرزا غالب کے نزدیک دلستانی یعنی دوسرے کا دل چرا لینا جرم ہے۔ چنانچہ جہاں دوسرے دلستاں ہیں وہاں ان کا محبوب بھی دلستاں ہے۔ سبھی جرم دار ہیں۔ لیکن مرزا غالب کے

محبوب کی دلستانی ایک ایسا جرم ہے جس کی شفاعت خود اس کا حسن کرتا ہے۔ اس کے حسن کا یہ عالم ہے کہ کوئی دل دیے بغیر نہیں رہ سکتا اس لیے وہ قابلِ مواخذہ نہیں۔ قیامت کے دن خدا اسے معاف کر دے گا۔ اب خدا کے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر وہ کسی ایک انسان کے خاص جرم سے درگزر کرے گا۔ تو اسی جرم کے دوسرے سزاواروں کو کیوں کر سزا دے گا۔ لازماً ان کے جرم سے بھی اسے درگزر کرنا ہوگا۔ چونکہ یہ عفوِ جرم مرزا غالب کے محبوب کے باعث ہوا ہے۔ اس لیے اسے شفیع کہا ہے۔ گویا اس کا حسن دوسرے دل چھیننے والوں کی شفاعت کا کام کرے گا۔

چنانچہ کہتا ہے کہ ''خدا کسی ایک شخص کا کوئی جرم معاف کرے تو اسی نوعیت کے جرم کی بنا پر دوسروں کا مواخذہ نہیں کرے گا۔ میں تیرے قربان جاؤں تو قیامت کے دن دوسرے معشوقان دلستان کا شفیع ہوگا۔''

نداند قدرِ غم تا در نماند کس بدان غالبؔ
مسرت خیزد از تقلید پیران نو جوانان را

اے غالب! کسی کو غم کی قدر نہیں ہوتی جب تک وہ خود غم میں اسیر نہ ہو۔ بوڑھوں کے تجربے کی پیروی سے نوجوانوں کو خوشی ہوتی ہے۔
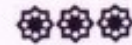
ردیف (ب)

غزل نمبر(۱)

خیز و بی راہ روی را سرِ راہی دریاب
شورش افزا نگہِ حوصلہ گاہی دریاب

لغت: ''دریاب'' دریافتن مصدر سے فعل امر ہے۔

فارسی زبان میں مصدر کے ساتھ حروف کو یا الفاظ کو پیوست کرنے سے بے شمار محاورے بنتے ہیں۔ بہم شدن۔ فراز کردن۔ آشنا ساختن۔

چنانچہ یافتن سے دریافتن بنا ہے۔ یافتن کے معنی محض کسی چیز کو پالینا ہے۔ دریافتن کا مفہوم کسی نامعلوم چیز کو معلوم کرنا یا کسی معاملے کی تہ تک پہنچنا ہے۔ اس کے بعد اس محاورے کے کئی ایک معنوی پہلو ابھرتے ہیں جیسا کہ اسی غزل میں ''دریاب'' کے لفظ سے جو اس غزل میں بطور ردیف کے آیا ہے واضح ہو جائے گا۔

عالم آئینۂ راز است چہ پیدا، چہ نہان
تابِ اندیشہ نداری بہ نگاہی دریاب

لغت: ''پیدا و نہان'' = ظاہر و باطن۔

اس کائنات کے دو پہلو ہیں۔ ایک ظاہر اور ایک باطن۔ بہر حال یہ عالم ظاہر ہو یا باطن، ایک ایسے آئینے کی طرح ہے جس میں رازِ حقیقت منعکس ہوتا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ

اگر تجھ میں اس کائنات پر غور کرنے کی طاقت نہیں ہے تو کم از کم اس پر ایک نظر ہی ڈال لے کیونکہ یہ عالم اسرار حقیقت کا مظہر ہے۔

گر بہ معنی نہ رسی ، جلوہ صورت چہ کم است
خم زلف و شکنِ طرف کلاھی دریاب

لغت: معنی وصورت باطن و ظاہر "شکن کلاہ" کلاہ کا ایک طرف کو جھکاؤ جس سے کج کلاہی کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر تو حسن کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا تو حسن کا ظاہری جلوہ کسی حالت میں کم نہیں۔ تو محبوب کی زلفوں کے خم اور شان کج کلاہی سے لذت اندوز ہو۔

غم افسردگی ام سوخت، کجائی ای شوق
نفسم را بہ پر افشانی آھی دریاب

لغت: "پرافشانی" = پروں کا پھڑ پھڑانا۔ کسی چیز کا شوق (عشق) زندگی میں توانائی پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ ہو تو زندگی پر افسردگی طاری ہو جاتی ہے اس افسردگی کے عالم میں انسانی سانس، سانس نہیں رہتا، اس میں ایک آہ کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا سانس آہ کے انداز میں پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

اس افسردگی کے غم نے مجھے جلا دیا۔ اے شوق تو کہاں ہے؟ آ اور میرے سانس کو اس عالمِ پیچ وتاب میں سہارا دے (تاکہ یہ افسردگی دور ہو جائے)

بہ توانائی نازِ تو گواھیم ز عجز
تابِ بی جادہ، بہ جذب پر کاھی دریاب

لغت: "بے جادہ" = ایک قسم کا جوہر یا پتھر ہے جو کھربا کی طرح تنکے (کاہ) کو کھینچ لیتا ہے۔

ہمارے عجز و نیاز سے تیرے ناز و انداز کی قوت کا پتا چلتا ہے۔ یوں سمجھ لے کہ تیرا نازِ حسن ایک کہربا ہے جو ایک تنکے کو کھینچے چلا جا رہا ہے۔

تا چھا آئینۂ حسرتِ دیدارِ تو ایم
جلوہ برخود کن و مارا بہ نگاھی دریاب

اگر تو ہمیں اپنا جلوہ نہیں دکھاتا تو نہ سہی، اپنے آپ ہی کو اپنا جلوہ دکھا تاکہ ایک نظر میں تمہیں ہماری حات کا اندازہ ہو جائے کہ ہم تیرے دیدار کی حسرت میں کس طرح سرتاپا آئینہ بنے بیٹھے ہیں۔

تو در آغوشی و دست و دلم از کار شدہ
تشنہ بی دلو و رسن بر سرِ چاھی دریاب

لغت: "دلو" = ڈول "رسن" رسی ان دو چیزوں کے ذریعے کنویں میں سے پانی نکالا جاتا ہے۔

اللہ تعالی ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ (نحن اقرب الیہ من حبل الورید) اس کے باوجود ہم اسے نہیں پا سکتے۔ یہی بات اس شعر کا پس منظر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تو ہمارے آغوش میں ہے۔ پھر بھی ہمارے ہاتھ اور دل تجھ سے محروم ہیں۔ ہماری محرومی کا اندازہ کر کے یوں سمجھ لے کہ ایک پیاسا کنویں کے کنارے کھڑا ہے اور اس کے پاس نہ ڈول ہے نہ رسی وہ حسرت سے پانی کو دیکھ رہا ہے۔

مرزا بیدل کا شعر ہے:

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

داغِ ناکامیِ حسرت بود آئینۂ وصل
شبِ روشن طلبی، روزِ سیاہی دریاب

جذبۂ عشق کے بارے میں مرزا غالب کا یہ تصور ہے کہ یہ جذبہ کبھی فنا نہیں ہوتا۔ وصل نصیب ہونے پر بھی اسے تسکین نہیں ہوتی بلکہ اس کی بے تابیاں بڑھ جاتی ہیں۔ ان کا شعر ہے:

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

یعنی اگر تجھے یہ خیال ہے کہ وصال میں شوق کے ولولے کم ہو جاتے ہیں تو پانی میں لہروں کو دیکھ کہ کس طرح ایک دوسرے سے گلے ملنے پر بھی کتنی بے تاب پھرتی ہیں۔ اس فارسی شعر میں مرزا مرحوم نے کم و بیش یہی تصور پیش کیا ہے کہتے ہیں آئینۂ وصل کی چمک کو نہ دیکھ یہ آئینۂ وصل بھی حسرتوں کی مایوسیوں اور ناکامیوں کے سیاہ داغ کی طرح ہے۔ وصل کی کوشش تو ایسی ہے کہ انسان ایک روشن رات کو طلب کرے مگر اسے روزِ سیہ مل جائے۔

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار
نیست گر صبحِ بہاری شبِ ماہی دریاب

موقع کو ہاتھ سے نہ چھوڑ اور وقت کو غنیمت سمجھ۔ اگر صبحِ بہار نہیں تو شبِ ماہ (چاندنی رات) ہی سے تمتع حاصل کر۔ مرزا غالب کا یہ شعر تو دیکھیے:

کوئی کہے کہ شب مہ میں کیا برائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

صبحِ بہار اور شبِ ماہی میں "ے" یائے تنکیری ہے یعنی کوئی سی صبحِ بہار اور کوئی شبِ ماہ

غالب و کشمکشِ بیم و امیدش ھیھات
یا بہ تیغی بکش و یا بہ نگاہی دریاب

غالب ہوا اور یوں امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ افسوس ہے! یا تو تلوار کے ایک وار سے اسے مار ڈال یا ایک بار نگاہِ لطف سے اس کا مداوا کر۔

❀❀❀

غزل نمبر (۲)

گر پس از جور بانصاف گراید چہ عجب
از حیا روئی بما گر نہ نماید چہ عجب

مولانا حالی اس شعر کی وضاحت یوں کرتے ہیں:۔

"ظلم و ستم کے بعد اگر وہ انصاف کی طرف مائل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں۔ یعنی اپنے پچھلے ظلم یاد کر کے ہم کو منہ نہ دکھلائے تو کچھ تعجب نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انصاف بھی کرے گا تو اس طرح کرے گا کہ ہم اس کے دیکھنے سے محروم رہیں۔"

مزید وضاحت کے لیے مرزا غالب کے یہ شعر دیکھیے:

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تم کو منہ دکھلائیں کیا

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

بودش از شکوہ خطر، ورنہ سری داشت بمن
بمزارم اگر از مھر بیاید، چہ عجب

لغت: ''سرے بمن داشت'' = اسے مجھ سے ایک لگاؤ تھا۔

میرے محبوب کو یہ اندیشہ تھا کہ مجھ سے ملے گا تو میں شکوہ کرونگا (اس لیے وہ ملنے سے گریز کرتا تھا) ورنہ وہ میری طرف مائل تھا۔ (اب جو میں مرگیا ہوں اور ایسے اندیشے کا کوئی امکان نہیں) اب اگر وہ میرے مزار پر مہربانہ انداز میں آجائے تو کوئی عجیب بات نہیں۔

رسم پیمان بمیان آمدہ، خود را نازم
گفتہ باشد کہ زبستن چہ کشاید، چہ عجب

مرزا غالب کے یہاں گہرے فکر اور شدید احساسات کے ساتھ ساتھ مزاح وظرافت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ شعر اسی انداز کا ہے۔

میرے محبوب نے رسمی طور پر عہد وصال کیا ہے اور میں اپنے آپ پر ناز کر رہا ہوں۔
کوئی عجب نہیں کہ اس کا یہ عہد و پیمان محض اس لیے ہو کہ خالی عہد و پیمان باندھنے سے کیا ہوتا ہے (پورا کرنا تو اور بات ہے)

شیوہ ھا دارد ومن معتقد خوی وی ام
شوقم از رنجشِ او گر بفزاید چہ عجب

اس کے ناز وانداز کے کئی ایک تیور ہیں، اور میں اس کی عادت کے ان تیوروں کا قائل ہوں۔ اگر اس کے مجھ سے روٹھ جانے سے میرا ذوق وشوق محبت اور بھی زیادہ ہو جائے تو کچھ عجب نہیں، یعنی محبوب کا روٹھنا دراصل عاشق کی آتش شوق کو بھڑکانا ہے۔

چون کشد مَی، کشدم رشک کہ در پردۂ جام
از لب خویش اگر بوسہ رباید چہ عجب

شراب پیتے وقت لوگ اپنے بھیگے ہوئے لبوں کو چاٹ لیا کرتے ہیں۔ معشوق بھی عالم مے نوشی میں اپنے لبوں کو چاٹتا ہے۔ عاشق یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے لبوں کو خود چوم رہا ہے۔ اس پر اسے رشک آتا اور کہتا ہے: جب وہ شراب پیتا ہے تو مجھے رشک آتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ کہیں اس جام کے پردے میں وہ اپنے لبوں کا خود ہی بوسہ نہ لے رہا ہو۔

طرۂ درھم و پیراھن چاکش نگرید
اگر از ناز بخود ھم نگراید، چہ عجب

اس کی پریشان زلفوں اور پیراہن چاک کو دیکھو۔ (اپنے چاہنے والوں کی طرف توجہ دینا تو درکنار) اگر اس عالم ناز وانداز میں اپنی طرف بھی مائل نہ ہو تو کوئی عجیب بات نہ ہوگی۔

ھرز میرم شمرد و ز پی تعلیم رقیب
بہ وفا پیشگی ام گر بستاید چہ عجب

لغت: ''ہرزہ میر'' = وہ شخص جو بے فائدہ اپنی جان دے دیتا ہے۔

''وفا پیشگی'' = شیوۂ وفا، وفاداری۔

مجھے رائگاں جان دینے والا خیال کرتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ میرے بارے میں یہ رائے قائم کر کے رقیب کو درس وفا دینے کے لیے میری وفاداری کی تعریف کرے تو کوئی عجیب بات نہیں۔

یعنی عاشق کی جاں نثاری کا تذکرہ کرنے سے عاشق کی تعریف کرنا مقصود نہیں بلکہ در پردہ رقیب کو وفا پر اکسانا ہے۔

کار با مطربۂ زہرہ نہادی دارم
گر لبم نالہ بہ ہنجار سراید چہ عجب

لغت: ''ہنجار'' = لغوی معنی راہ اور طریق کے ہیں مجازاً طرز روش کو کہتے ہیں۔

''زہرہ'' ستارہ ہے، اسے رقاصۂ فلک بھی کہا جاتا ہے۔ قدیم الایام میں یونانی اس کی طرف رقص و سرور کو منسوب کرتے تھے۔ ''زہرہ نہاد'' جس کی فطرت زہرہ جیسی ہو، یعنی مغنیہ۔

مجھے ایک زہرہ خصلت مطربہ سے واسطہ پڑا ہے اس لیے اگر میرے لبوں سے نالہ و فغاں بھی نغمہ کے انداز میں، بلند ہو تو یہ کوئی عجب بات نہیں ہوگی۔

آنکہ چون برق بہ یک جائی نہ گیرد آرام
گلہ اش در دل اگر دیر نپاید چہ عجب

عاشق کے دل میں وارفتگی محبت اور دیوانگی عشق کے باوجود کبھی کبھی معشوق کے خلاف شکایت کا جذبہ ابھر آتا ہے، لیکن وہ دیرپا نہیں ہوتا۔ چنانچہ شاعر اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

وہ محبوب جو برق کی طرح ایک لحظہ بھی کہیں نہیں ٹھہرتا، اگر اس کے بارے میں گلہ اور شکوہ دل میں ابھر بھی آئے تو یہ عجیب بات نہیں ہوگی کہ وہ گلہ اور شکوہ دیرپا نہ ہو اور جلد ہی مٹ جائے۔

با چنین شرم کہ ز ہستی خویشش باشد
غالب از رخ بہ رہِ دوست نساید، چہ عجب

غالب، خدائے مطلق کی ہستی کے مقابلے میں اپنی ہستی کو حقیر سمجھتا ہے اور شرم محسوس کرتا ہے۔ ایسی حقیر ہستی کا معبود مطلق کے آگے سر بسجود ہونا بھی مناسب نہیں۔ چنانچہ کہتا ہے:

اس شرم کے باعث جو غالب کو اپنی ہستی سے محسوس ہو رہی ہے۔ اگر وہ محبوب کی راہ کی جبہ سائی نہ کرے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔

❀❀❀

غزل نمبر (۳)

جنوں محمل بہ صحرای تحیر راندہ است امشب
نگہ در چشم و آہم در جگر واماندہ است امشب

لغت: ''تحیر'' = حیرت۔

عشق و محبت کے انتہائی مقامات میں ایک مقام حیرت ہے۔ مقام حیرت وہ مقام ہے کہ جہاں انسان، محبوب کے تصور میں ایک ہی جگہ ٹھہر جائے یا رک جائے۔ اسی مقام

حیرت کو مرزا غالب نے تحیر کہا ہے اور اس کیفیت کو بڑے خوبصورت اور پرزور اسلوب میں یوں بیان کیا ہے:

ہمارا جنونِ شوق آج صحرائے تحیر میں محمل رانی کر رہا ہے، (یعنی ہم مقام حیرت میں کھو گئے ہیں۔) میری نگہ آنکھ ہی میں اور آہ سینے ہی میں تھم کر رہ گئی ہے۔

به ذوق وعده سامان نشاطی کرده پندارم

ز فرش گل بروی آتشم بنشانده است امشب

لغت: ''فرش گل'' = پھولوں کا فرش جو خوشی اور نشاط کی نشانی ہے۔ کسی عزیز دوست یا مہمان گرامی کے آنے پر پھول فرش پر بکھیر دیے جاتے ہیں۔ ان بکھرے ہوئے پھولوں کو فرش گل کہا جاتا ہے۔

محبوب نے میرے گھر آنے کا وعدہ کیا ہے اور میں نے اس وعدے کی لذت میں عیش ونشاط کے سامان مہیا کر لیے ہیں۔ ایک طرف انتظار کی بے تابی، دوسری طرف وعدے کے پورا ہونے کی غیر یقینی حالت، مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں آج رات ''فرش گل'' پر نہیں، آگ پر بیٹھا ہوں۔

گلوں کی سرخی کو آگ سے تشبیہ بڑی شوخ تشبیہ ہے۔ انتظار کی بے چینی کا یہ عالم ہے کہ جیسے آتش زیر پا۔ ''از فرش گل بروے آتش'' میں اگر حرف جار ''از'' کے سادہ معنی لیے جائیں تو اس عبارت کا ترجمہ یہ ہوگا: فرش گل سے آگ پر۔ لیکن یہاں ''از'' اضافی ہے یعنی اضافت کے لیے آیا ہے، چنانچہ عبارت یوں بنتی ہے: بروے آتش فرش گل، یعنی فرش گل کی آگ پر یعنی وہ فرش گل جو آگ کی مانند محسوس ہو رہا ہے۔ چنانچہ آتش، فرش گل میں آتش کی اضافت تشبیہی ہے۔ بہر حال ''از'' کے ہر دو مفہوم سے انتظار کی بے انتہا بے چینی مقصود ہے جسے

مرزا غالب نے بڑی محاکاتی فنکاری سے ادا کیا ہے۔

خیالِ وحشت از ضعفِ روان صورت نمی بندد

بیابان برنگه، دامانِ ناز افشانده است امشب

لغت: ''خیال وحشت صورت نمی بندد'' وحشت کے تصور کی کوئی صورت نہیں بنتی۔''

''ضعف رواں'' = ضعف جاں۔

ناطاقتی کے باعث وحشت کا خیال ہی نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے آج رات بیاباں نے ہماری نگاہوں پر اپنا دامن ناز پھیلایا ہوا ہے۔ ضعف کے باعث، وحشت کا جذبہ دب کر رہ گیا ہے۔ اس خیال کو مرزا نے بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

دل از من عاریت جستند اہلِ لاف و دانستم

سمندر این غریبان را بہ دعوت خوانده است امشب

لغت: ''عاریت جستن'' = عارضی طور پر مانگنا۔

''اہل لاف'' = جھوٹے دعوے کرنے والے لوگ مراد اہل ہوس۔ ''سمندر'' ایک کیڑا ہے جو آگ میں رہتا ہے۔

''غریب'' = اجنبی یہاں آتش عشق سے بیگانہ لوگ مراد ہیں۔ عاشق کا دل سمندر کی طرح ہوتا ہے جس کی زندگی، محبت کی آگ ہے۔

شاعر نے اہل لاف کو شہر محبت کے اجنبی لوگوں کا خطاب دے کر کہا ہے:

اہل ہوس نے مجھ سے میرا دل عاریتاً مانگا اور میں سمجھ گیا کہ سمندر نے ان محبت سے بیگانہ لوگوں کو بلایا ہے۔ گویا عاشق سے اہل ہوس کا دل عاریتاً طلب کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ

محبت کی چاشنی سے آشنا ہونا چاہتے ہیں۔

زہی آسائشِ جاوید، ہمچون صورتِ دیبا

نمِ زخم تن و بستر بھم چسپانده است امشب

لغت: ''دیبا'' = رنگ برنگ نرم ریشم۔

چسپاندن = چپکانا۔

جب جسم پر بہت زیادہ زخم ہوں تو انسان زخموں سے تڑپتا اور بے چین ہوتا ہے لیکن جب زخم زیادہ رسنے لگیں اور بدن، بستر سے چمٹ جائے تو ہلنا ذرا دشوار ہو جاتا ہے۔اس حالت کو شاعر نے آسائش سے تعبیر کیا ہے۔کہتا ہے:-

زخموں کے رسنے نے میرے تن کو بستر سے یوں چپکا دیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے رنگین ریشمی لباس جسم سے چپک گیا ہے۔اس آسودگی جاوید کے کیا کہنے۔

مرزا غالب نے زخموں کے مختلف نشانات کو، جو بستر پر پڑ گئے ہیں۔رنگ برنگے ریشم سے تشبیہ دی ہے جو بڑی واضح ہے۔آسائش کے لفظ میں ایک لطیف طنز بھی ہے۔

بقدر شام هجرانش، درازی باد عمرش را

فلک نیز از کواکب سبحه ها گردانده است امشب

لغت: ''سبحہ'' = تسبیح۔''کواکب'' = ستارے۔''سبحہ گرداندن'' = تسبیح پھیرنا، دعا مانگنا۔آسمان کے ستاروں کو تسبیح کے دانوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔کہتا ہے:-

اللہ کرے اس کی (محبوب کی) عمر، اس کی شامِ جدائی کی طرح دراز ہو جائے۔آج رات تو آسمان بھی ستاروں کی تسبیح پھیر کر اس بات کی دعائیں مانگ رہا ہے۔

بخوابم می رسد بند قبا وا کرده از مستی

ندانم شوقِ من بروی چه افسون خوانده است امشب

لغت: ''قبا'' = ایک تنگ اور چست لباس ہوتا تھا۔

''بند قبا وا کردن'' = قبا کے بٹن کھول دینا۔

محبوب، مستی کے عالم میں بند قبا کھولے ہوئے مجھے خواب میں نظر آیا۔نہ جانے میرے شوق وصال نے آج رات اس پر کیا جادو کر دیا ہے۔

بدست کیست زلفت کاین دلِ شوریده می نالد

سرِ زنجیرِ مجنون را که می جنبانده است امشب

شاعر نے محبوب کی زلفوں کو، جو بل کھائے ہوئے ہیں، مجنوں (عاشق دیوانہ) کی زنجیر سے تشبیہ دی ہے۔کہتا ہے:

تیری زلفوں سے کس کے ہاتھ کھیل رہے ہیں کہ میرا دل دیوانہ فریاد کر رہا ہے۔

محبوب کی زلفوں میں تو عاشق اسیر ہے۔غیر کے ہاتھوں کا وہاں تک پہنچنا کس طرح عاشق کو گوارا ہو سکتا ہے۔

خوش است افسانۂ دردِ جدائی مختصر غالب

به محشر می توان گفت آنچه در دل مانده است امشب

جدائی کی داستان بڑی دراز ہوتی ہے۔اسے اس زندگی میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

شاعر کہتا ہے:

درد جدائی کا افسانہ مختصر ہی اچھا ہے اس کے بیان کرتے کرتے جو کچھ آج رات دل

میں رہ جائے وہ قیامت کے روز بیان کیا جاسکتا ہے۔

قیامت کا دن دراز ہوگا اور پھر اس روز داستان درد کی شنوائی بھی ہوگی ۔ اس دنیا میں دکھڑا جتنا کم رویا جائے بہتر ہے۔

❀❀❀
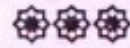
غزل نمبر (۴)

از اندہِ نایافت قلق می کنم امشب
گر پردۂ ھستی است کہ شق می کنم امشب

لغت: ''اندہ'' =اندوہ کا مخفف ہے۔ رنج و غم۔

''کہ'' کا حرف متعدد معنوں میں مستعمل ہے۔ یہاں ''کہ'' کا مفہوم ''ہم'' یعنی بھی کا ہے۔ دوسرے مصرعے کی عبارت یوں ہے۔

گر پردۂ ھستی است ھم شق می کنم امشب

یعنی اگر پردۂ ہستی بھی درمیان میں حائل ہے تو میں وہ بھی آج رات پھاڑ دوں گا ''نا یافت'' ''نارسائی'' حقیقت کا سراغ نہ ملنا۔

شاعر کہتا ہے کہ آج رات مجھے اپنی نارسائی کا انتہائی قلق محسوس ہو رہا ہے۔ آج رات اگر میرے اور حقیقت کے درمیان خود میری ہستی کا پردہ حائل ہوا تو اس پردے کو بھی پھاڑ دوں گا تا کہ حقیقت تک پہنچ سکوں۔

ھان آئنہ بگذار کہ عکسم نفریبد
نظارۂ یکتائی حق می کنم امشب

آئینے میں آئینہ دیکھنے والے کا عکس نظر آتا ہے جو ہو بہو وہی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود مختلف ہوتا ہے۔ صوفیہ کے نزدیک مظاہر کائنات، ذات حق کے عکس ہیں، لیکن ذات حق ان سے الگ تھلگ ہے وہ یکتا ہے۔ اس میں دوئی کا شائبہ تک نہیں۔ حق بیں آنکھ کو ان عکسوں سے تسکین نہیں ہوتی۔ وہ یکتائی حق کو ترستے ہیں۔

مرزا غالب کہتے ہیں کہ آئینے کو چھوڑ دے۔ میں اس آئینے میں پڑنے والے عکس کے فریب میں نہیں آسکتا۔ آج رات تو میں یکتائی حق کے نظارے کر رہا ہوں اور اسی میں محو ہوں۔

آتش بہ نھادم شود آب از تفِ مغزم
از تب نبود اینکہ عرق می کنم امشب

لغت: ''عرق کردن'' = پسینے سے شرابور ہونا۔

''نہاد'' = طینت، طبیعت۔ ''تب'' = حرارت۔ بخار

''تف'' = گرمی۔ تف مغز، ذہن یا خیالات کی گرمی۔

میرے ذہن کی گرمی سے میرے جسم یا طبیعت کی آگ پگھل کر پانی ہوگئی ہے۔ یہ جو مجھے پسینہ آ رہا ہے یہ پسینہ نہیں ہے۔ یہ اُسی پانی کے قطرے ہیں جو میرے جسم پر نمودار ہو رہے ہیں۔

جان برلبم اندازۂ دریا کشیِ ام نیست
از مَی طلبِ سدِ رمق می کنم امشب

لغت: ''دریا'' = فارسی میں سمندر کے معنوں میں مستعمل ہے۔

''دریا کشی'' = شراب کے سمندر کے سمندر پی جانا۔ کثرتِ مے نوشی مراد ہے۔

''رمق'' = بقیہ جان۔ نحیف جانی یا نیم جانی کا عالم۔

''سدِ رمق'' = بقیہ جان کو روکے رکھنا، زندہ رہنے کی کوشش۔

میں جاں بلب ہوں۔ مجھے اپنی بلا نوشی کا کوئی اندازہ نہیں، (پے بہ پے چلا جا رہا ہوں) میں تو شراب سے اپنی جان کو، جو باقی رہ گئی ہے، روکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اس شعر میں 'طلب' کا لفظ بہت بلیغ واقع ہوا ہے اور شعر کی جان ہے۔ شاعر نے یہ نہیں کہا میں شراب سے بقیہ جان کو قائم رکھے ہوئے ہوں۔ اس نے سد رمق نہیں لکھا بلکہ طلب سدرمق کہا ہے۔ شراب سے سدرمق کی محض توقع ہے یعنی شراب سے زندہ رہنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ شراب کا مداوائے غم ہونا کوئی قطعی بات نہیں۔ یہ تو ایک عارضی سہارا ہے:

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

از هر بن مو چشمۂ خون باز کشادم
آرایشِ بستر ز شفق می کنم امشب

میں نے ہر بن مو سے ایک چشمۂ خون بہا دیا ہے۔ آج میں اس خون سے شفق کا کام لے کر اپنے بستر کی آرایش کر رہا ہوں۔

مرزا غالب نے زندگی کے غم و آلام کو اپنا سرمایۂ فن بنا لیا تھا۔ عالم رنج والم میں خوں کے آنسو بہا کر آرایش بستر کرنا اسی نکتے کی تائید کرتا ہے۔

می می چکد از لعلِ لبش در طلبِ نقل
مستی ز کواکب بہ طبق می کنم امشب

لغت: ''نقل'' = وہ چیز جو تلخیِ مے کے اثرات کو دور کرنے کے لیے تھوڑی شراب کے ساتھ کھائی جائے۔

''لعل لبش'' = لعل لب رو'' میں لعل اضافت، اضافت تشبیہی ہے یعنی لعل جیسے لب۔''

'کواکب'' ستارے۔

محبوب کے لب لعلیں نقل کی طلب میں بے تاب ہیں اور ان سے شراب ٹپک رہی ہے۔ میں نے مناسب نقل مہیا کرنے کے لیے کچھ ستارے توڑ کر تھال میں رکھ لئے ہیں کچھ مے کی مستی اور کچھ محبوب کے شراب کے سے سرخ لب، تر لبوں سے شراب کے قطرے یوں گر رہے ہیں۔ جیسے چمکتے ہوئے ستارے ہوں۔ اسی رعایت سے شاعر نے ''ستاروں کے نقل'' کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ ایک حسین ندرت ہے۔

نازم سخنش را و نیابم دهنش را
خوش تفرقہ در باطل و حق می کنم امشب

ہمارے شعرا معشوق کے دہن تنگ کو عدم قرار دیتے ہیں۔ گویا وہ ہے ہی نہیں۔ مرزا غالب نے اس شعر میں ایک نیا استعارہ استعمال کیا ہے۔ محبوب کے دہن تنگ کو باطل کہا ہے اور اس کی میٹھی، پیاری پیاری، دل میں اترنے والی باتوں کو حق کا نام دیا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے اس کی باتوں پر ناز ہے لیکن مجھے اس کے دہن کا سراغ نہیں ملتا (جہاں سے یہ باتیں ابھر رہی ہے۔) میں نے آج رات حق و باطل میں ایک خوبصورت امتیاز قائم کیا ہے۔

اس شعر میں ایک لطیف نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ شاعر نے استعارے کے رنگ میں نہ صرف

محبوب کے دہن اور اس کی باتوں کا تذکرہ کیا ہے بلکہ باطل کی نفی اور حق کے اثبات اور عظمت کی وضاحت بھی کی ہے۔

عمری است کہ قانونِ طرب رفتہ ز یادم
آموختہ را باز سبق می کنم امشب

لغت: ''قانون'' = دستور، قاعدہ، (قانون ایک ساز کا نام بھی ہے)۔
''باز سبق می کنم'' = پھر یاد کر کے دہرا رہا ہوں۔

مدت ہوئی کہ میرے ذہن سے عیش و طرب کے انداز اور طور طریقے مٹ چکے ہیں۔
آج رات میں پڑھی ہوئی (آموختہ) باتوں کو دوبارہ سبق کے طور پر یاد کر رہا ہوں۔

یعنی عیش وطرف کے دن بھولی بسری داستان بن چکے ہیں۔ آج رات کی کیفیت اس بھولی ہوئی داستان کی یاد کو تازہ کر رہی ہے۔

غالبؔ نبود شیوۂ من قافیہ بندی
ظلمی است کہ بر کلک و ورق می کنم امشت

مرزا غالب نے اس غزل میں سنگلاخ قافیے استعمال کیے ہیں۔ فارسی اور اردو کے بعض شعراء اس طرز کی سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کو کمال فن سمجھتے تھے جس سے شعر کا فکری پہلو دب جاتا ہے اور شاعری محض لفاظی بن جاتی ہے۔ اسی بنا پر مرزا غالب کہتے ہیں:

اے غالب! قافیہ بندی میرا شیوہ نہیں، آج رات (میں ایسی غزل کہہ کر) اپنے قلم اور کاغذ پر ظلم کر رہا ہوں۔

مرزا غالب نے اس غزل کی ساخت و پرداخت کو قافیہ بندی سے تعبیر کیا ہے اور کہا

ہے کہ اس قافیہ بندی سے وہ اپنے قلم اور کاغذ پر، دوسرے لفظوں میں خود اپنی شاعری پر ستم ڈھا رہا ہے۔ اس کا یہ احساس محض اظہار انکسار ہے کیونکہ باوجود سخت ''قافیہ ردیف'' کے اس کی یہ غزل بہت بلند ہے اور اس ں اُن بہترین غزلوں میں سے ہے۔ جن میں فکر وفن کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

مرزا غالب کے اردو دیوان میں بھی اسی نوع کی بعض غزلیں ہیں جو محض الفاظ کے شعبدہ بازوں کو شرماتی ہیں۔ مثلاً:

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

اور

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

❁❁❁

ردیف ''پ''

غزل نمبر(۱)

سحر دمیده و گل در دمیدن است، مخسپ
جهان جهان گلِ نظارا چیدن است، مخسپ

لغت وحل مشکلات:

''دمیدن'' = پھوٹنا، کھلنا۔

''سحر دمیدن'' = طلوع سحر۔ ''گل دمیدن'' = پھولوں کا کھلنا۔ ''گل در دمیدن است'' = یعنی پھول کھل رہے ہیں۔

''خسپیدن'' = سونا، مخسپ خسپیدن مصدر سے فعل نہی ہے، یعنی مت سو۔

''جہان جہان'' میں لفظ ''جہان'' کا تکرار کثرت کا مفہوم پیدا کر رہا ہے۔ ''گل چیدن'' = پھول چننا۔ ''گل نظارہ چیدن'' = پھولوں کا نظارہ کرنا۔ جہاں جہاں گل نظارہ چیدن سے مراد جی بھر کر پھولوں کو دیکھنا ہے۔ کہتا ہے:

صبح ہو چکی ہے اور پھول کھل رہے ہیں۔ جاگ، یہ سماں تو جی بھر کو پھولوں کو دیکھنے کا ہے، جن کی ایک دنیا آباد ہو چکی ہے۔ آنکھیں کھول اور دیکھ۔

مشام را بہ شمیم گلی نوازش کن
نسیم غالیہ سا در وزیدن است، مخسپ

لغت: ''مشام'' = دماغ۔ ''شمیم'' = خوشبو۔

''نسیم غالیہ در وزیدن است'' = معطر ہوا چل رہی ہے۔

اپنے دماغ کو کسی پھول کی خوشبو سے لطف اندوز کر لے سو کیوں رہا ہے۔ آنکھیں کھول اور دیکھ کہ معطر ہوا چل رہی ہے۔

ز خویش حسن طلب بین در صبوحی کوش
می شبانہ ز لب چکیدن است، مخسپ

لغت: ''صبوحی'' = وہ شراب جو صبح سویرے پی جائے۔ اس کی ضد ''سبوغی'' = شام کی شراب ہے۔ ''حسن طلب'' = کسی شے کو بڑے خوبصورت طریقے سے مانگنا۔

اپنے حسن طلب کے جذبے کے احساس کو دیکھ اور صبح کی شراب نوش کر۔ (ابھی تو رات کی پی ہوئی شراب لبوں سے ٹپک رہی ہے۔ اٹھ، مے شبانہ کا لبوں سے ٹپکنا بتا رہا ہے کہ مستی کی کیفیت ابھی باقی ہے اور اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ مے نوشی کو جاری رکھا جائے۔ یہی تقاضا گویا حسن طلب کا جذبہ ہے، جس کی طرف شاعر نے بڑے شاعرانہ اسلوب بیان سے اشارہ کیا ہے۔

ستارۂ سحری مژدہ سنج دیداری است
ببین کہ چشم فلک در پریدن است مخسپ

لغت: ''پریدن چشم'' = آنکھ پھڑکنا۔ اسے ''پرواز چشم'' بھی کہتے ہیں۔ آنکھ کے

پھڑکنے کا سبب ریح ہے لیکن اکثر لوگ آنکھ کے پھڑکنے سے کسی دوست یا عزیز کے آنے یا ملنے کا شگون لیتے ہیں۔

مرزا غالب کہتے ہیں کہ صبح کا ستارہ کسی کے دیدار کی خوشخبری دے رہا ہے۔ دیکھ کہ آسمان کی آنکھ پھڑک رہی ہے۔ یہ سونے کا وقت کا نہیں۔

تو محو خواب و سحر در تاسف از انجم
بہ پشت دست بدندان گزیدن است مخسپ

لغت: ''پشت دست بدندان گزیدن'' کے لغوی معنے ہیں دانتوں سے ہاتھ کاٹنا، افسوس کرنا یا پشیمان ہونا۔

شاعر کہتا ہے کہ تو محوخواب ہے اور صبح (تجھے اس نیند کی حالت میں دیکھ کر) افسوس کر رہی ہے اور اس افسوس کے عالم میں وہ دانتوں سے اپنے ہاتھوں کو کاٹ رہی ہے۔ (شاعر نے ستاروں کو صبح کے دانتوں سے تعبیر کیا ہے)۔

نفس زنالہ بہ سنبل درودن است بخیر
زخون دل، مژہ در لالہ چیدن است مخسپ

لغت: ''سنبل'' = ایک پیچ دار اور خوشبودار پودا جس سے زلف کو تشبیہ دی جاتی ہے۔
''درودن'' کاٹنا، فصل کاٹنا۔

مرزا غالب اس شعر میں صبح کی تازہ اور معطر فضا اور ہوا اور سرخ سرخ پھولوں کی بہار کا سماں دیکھ کر اپنے تاثرات کو یوں بیان کرتے ہیں کہ:

آٹھ کہ سانس فریاد کی طرح پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ یوں ہے جیسے سنبل کو کاٹ کر اسے

ڈھیر لگا رہا ہے۔ اور دل کا خون ابھر کے مژگاں سے ٹپک کر لالہ کاری کر رہا ہے۔ مت سو۔ سانس کے بہار کی فضا میں پیچ و تاب کھانے کو سنبل سے اور دل کے جوش کو لالہ کاری سے تشبیہ دینا عجیب محاکاتی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔

نشاط گوش بر آواز قلقل است، بیا
پیالہ چشم براہِ کشیدن است مخسپ

لغت: ''گوش بر آواز قلقل است'' = یعنی صراحی کی قلقل کی آواز پر کان لگائے ہوئے ہے۔ ''چشم براہ بودن'' = بے تابی سے انتظار کرنا۔
پیالہ کشیدن'' = شراب پینا مے کشی۔

بہارِ صبح دعوتِ نشاط دے رہی ہے جسے شاعر نے بڑے خوبصورت انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

آ کہ خوشی قلقل کی آواز پر کان لگائے ہوئے ہے اور پیالہ سرتاپا اس انتظار میں ہے کہ کوئی اسے اٹھائے اور یہ سونے کا موقع نہیں ہے۔

نشان زندگی دل دویدن است، مایست
جلائی آئنہ چشم دیدن است مخسپ

لغت: ''دویدن'' = لغوی معنے دوڑنا، یہاں اس سے مقصود حرکت اور تڑپ ہے۔
''جلائے آئینہ'' = آئینے کی چمک اور آب و تاب۔

یو کیوں ٹھہر گیا ہے؟ زندہ دلی کی نشانی تو یہ ہے کہ دل لگاتار متحرک رہے انسانی آنکھ اس آئینے کی طرح ہے جس کی آب و تاب دیکھنے ہی سے ہوتی ہے۔ تو نے کس لیے آنکھیں بند کر لی

ہیں۔ بقول وارث شاہ۔

رب اکھیاں دتیاں ویکھنے نوں

ز دیدہ سود حریفان کشودن است، مبند

ز دل مراد عزیزان تپیدن است مخسپ

لغت: ''حریف کا لفظ'' متضاد المعنی ہے۔ حریف ہم پیشہ لوگوں کو کہتے ہیں ایک ہی پیشے کے لوگوں میں دوستی بھی ہوتی ہے اور رقابت بھی، اس لیے یہ لفظ دونوں معنے دیتا ہے۔ اس شعر میں دوستی کا مفہوم دے رہا ہے۔ دوستوں کے لیے آنکھ کا فائدہ اسی میں ہے کہ کھلی رہے، اسے بند نہ کر۔ دل سے عزیزوں کا مقصد تڑپنا ہے، جاگ۔

بہ ذکرِ مرگ شبی زندہ داشتن ذوقی است

گرت فسانۂ غالب شنیدن است، مخسپ

لغت: ''شب زندہ داشتن'' = رات بیدار رہ کر گزارنا۔

موت کا تذکرہ کرتے ہوئے رات جاگ کر گزارنے میں بھی ایک لذت ہوتی ہے۔ اگر تو فسانۂ غالب سننا چاہتا ہے تو مت سو۔ گویا غالب کی زندگی کا فسانہ سراسر موت ہی کا تذکرہ ہے۔

❀❀❀
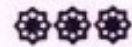
ردیف ''ت''

غزل نمبر(۱)

حق جلوہ گر ز طرزِ بیان محمدؐ است

آری کلامِ حق بہ زبان محمدؐ است

لغت: ''حق'' = سچائی اور خدا دونوں کا مفہوم دیتا ہے چنانچہ ''کلام حق'' سے مراد کلام الٰہی یعنی قرآن پاک بھی ہے اور سچ بات بھی۔

یہ غزل نعتیہ ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں:

محمد ﷺ کے انداز بیان سے حق ٹپکتا ہے۔ کیوں نہ ہو، ان کی زبان پر کلام حق ہے۔

آئینہ دار پرتو مہر است ماہتاب

شان حق آشکار، شان محمدؐ است

ماہتاب کی روشنی میں سورج ہی کی چمک کا عکس ہوتا ہے۔ چنانچہ شان محمدؐ سے شان حق آشکار ہوتی ہے۔

تیر قضا ہر آئنہ در ترکشِ حق است

اما کشادِ آن ز کمانِ محمدؐ است

لغت: ''تیر قضا'' = میں تیر کی اضافت، اضافت استعارہ ہے جیسے ''مرغ دل'' میں مرغ کی اضافت۔ چنانچہ تیر قضا سے مراد قضا ہی ہے جو تیر کا کام کرتی ہے۔

''ترکش'' = تیردان۔ وہ تھیلا یا خول جس میں تیر رکھتے ہیں۔

''کشاد'' = کھلنا۔ یہاں کشاد تیر مراد ہے۔ یعنی تیر کا چلنا۔

اس میں شک نہیں کہ تیر قضا ترکش حق ہی میں ہوتا ہے۔ (یعنی قضا رضائے حق ہی کا دوسرا نام ہے) لیکن یہ تیر قضا کمان محمدؐ سے چلتا ہے، گویا رائے حق رضائے محمدؐ ہے۔

دانی اگر بہ معنی لولاک وا رسی

خود ھر چہ از حق است، ازان محمدؐ است

لغت: ''لولاک'' اس کے لفظی معنی ہے ''اگر تو نہ ہوتا

''لولاک'' مخفف ہے ''لولاک لما خلقت الافلاک'' یعنی اگر تو نہ ہوتا تو میں اس افلاک (مراد، اس کائنات) کو پیدا نہ کرتا۔ اور یہ عبارت حدیث قدسی ہے۔ حدیث قدسی سے مراد وہ وحی ہوتی ہے جو آنحضرت ﷺ پر خواب میں نازل ہوئی ہو۔

اگر تو معنی لولاک تک رسائی حاصل کر لے تو تجھے معلوم ہو جائے کہ حق تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے وہ محمدؐ ہی کا ہے۔

ھر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد

سوگند کر دگار بجانِ محمدؐ است

لغت: ''سوگند'' = قسم۔

ہر شخص اس چیز کی قسم کھاتا ہے جو اسے عزیز ہو۔ اللہ تعالیٰ جان محمد کی قسم کھاتا ہے۔

واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گذار

کاینجا سخن ز سروِ روان محمدؐ است

لغت: ''طوبیٰ'' کے لغوی معنی پاکیزہ ہیں۔ اصطلاحاً جنت کا ایک درخت ہے۔

''حدیث'' بات ذکر، اے واعظ سایۂ طوبیٰ کا ذکر چھوڑ دے۔ یہاں تو محمدؐ کے سرو رواں (حضور کے قد) کی بات ہو رہی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے قد مبارک کے آگے طوبیٰ ایک بے حقیقت شے ہے۔

بنگر دو نیمہ گشتن ماہ تمام را

کان نیمہ جنبشی ز بنانِ محمدؐ است

لغت: ''بنان'' = انگلیاں۔

دو نیمہ گشتن ماہ تمام'' = چاند کے دو ٹکڑے ہونے یعنی شق القمر کی طرف اشارہ ہے۔

ماہ کامل کے دو نیم ہونے کو دیکھ کہ وہ محمد کی انگلی کی نیم جنبش کی وجہ سے ہے۔

رسول پاک کی انگشت مبارک کی نیم جنبش سے چاند کے دو نیم ہونے کو کس شاعرانہ لطافت سے بیان کیا ہے۔

در خود ز نقش مہر نبوت سخن رود

آن نیز نامور ز نشان محمدؐ است

لغت: ''مہر نبوت'' = آنحضرت ﷺ کے جسم مبارک پر ایک قدرتی نشان تھا جسے مہر نبوت کہا جاتا ہے اور اسے نبوت کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

اگر مہر نبوت کی حقیقت کے بارے میں بھی بات کی جائے تو یہ یاد رہنا چاہیے کہ مہر

نبوت محمدؐ کی ذاتِ گرامی سے سرفراز ہوئی ہے۔

غالب ثنای خواجہ بہ یزدان گزاشتیم

کان ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

لغت: ''خواجہ''=سرورِ کائنات۔

اے غالب! ہم نے سرورِ کائنات کی مدح وثنا، بزرگ و برتر ہی پر چھوڑ دی ہے کیوں کہ اسی کی ذات پاک محمدؐ کی مرتبہ شناس ہے۔

❀❀❀
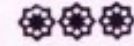
غزل نمبر (۲)

گلشن بہ وفضای چمن سینہ ما نیست

هر دل کہ نہ زخمی خورداز تیغ تو وانیست

گلشن ہمارے سینے کی فضائے چمن جیسا نہیں ہے۔ جو دل تیری تیغ محبت کا زخمی نہ ہو وہ کبھی نہیں کھلتا۔

عاشق کا سینہ محبت کے زخموں سے چمن زار بنا ہوا ہے۔ اس کا مقابلہ معمولی باغ کیا کر سکتا ہے جہاں صرف بہار اپنا جوبن دکھاتا ہے اور پھول کھلاتی ہے۔ دل ان پھولوں سے شگفتہ نہیں ہوسکتا۔ دل تو وہی شگفتہ ہوگا جس پر تیغ محبت نے زخم کاری کی ہو۔

می سوزم و می ترسم از آسیب ز دانش

آوخ کہ در آتش اثر آبِ بقا نیست

لغت: ''آبِ بقا''=آبِ حیات۔ ''آوخ''=افسوس۔

میں آگ میں جلتا ہوں لیکن ساتھ ہی اس کی گزند سے ڈرتا بھی ہوں اور یہ ڈر میری عقل کا نتیجہ ہے۔ افسوس کہ آگ میں آب بقا کا اثر نہیں۔

آتش عشق سے ہراساں ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عقل وحکمت مانع آتی ہے۔ کاش آگ میں ہمیشہ کی زندگی عطا کرنے کی صلاحیت ہوتی اور میں اسی میں جلتا رہتا۔

عمری است کہ می میرم و مردن نتوانم

در کشورِ بیدادِ تو فرمانِ قضا نیست

ایک عمر گزر گئی کہ میں مرتا ہوں (یعنی مرنے کی سعی کرتا ہوں) لیکن مر نہیں سکتا۔ تیری سلطنت جور وستم میں قضا کا حکم نہیں چلتا۔

محبت میں عاشق کی زندگی کا ہر مرحلہ گویا جان سے گزر جانا ہے۔ لیکن اس عالم جاں کنی میں موت نہیں آتی۔

هفت اختر وُنہ چرخ خود آخر بچہ کار اند

بر قتلِ من این عربدہ با یار روا نیست

لغت: ''عربدہ''=لڑائی جھگڑا۔

سات سیارے اور نو آسمان آخر کس کام کے لیے ہیں۔ میرے قتل پر میرے دوست سے یہ جھگڑا کس لیے ہو رہا ہے۔

سیاروں اور آسمانوں کی گردش، دنیا میں تباہ کاریاں مچاتی ہی ہے۔ عاشق کا محبوب کے ہاتھوں قتل ہونا بھی اسی نوع کا ایک حادثہ ہے۔ پھر محبوب سے مواخذہ کیسا۔

عمرم سپری گشت و ھمان بر سرِ جور است
گویند بتان را کہ وفا نیست چرا نیست

لغت: ''سپری گشت'' = ختم ہوگئی۔
''وفا'' = کسی ایک روش پر قائم رہنا۔

عمر ختم ہوگئی اور وہ بدستور جور و ستم پر قائم ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ معشوقوں میں وفا نہیں ہوتی، کیوں نہیں ہوتی (ہوتی ہے) معشوق محبت میں ثابت قدم نہیں تو نہ سہی، جور و ستم میں تو ثابت قدم ہے۔ عاشق کے نزدیک یہی وفا ہے۔

مرزا صاحب کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاشکے کے تم مرے لیے ہوتے

جنت نکند چارۂ افسردگیِ دل
تعمیر بہ اندازۂ ویرانیِ ما نیست

جنت ہماری افسردگیِ دل کو دور نہیں کرسکتی۔ یہ تعمیر یعنی جنت ہماری ویرانی کے مطابق نہیں ہے۔

کسی ویران جگہ کو آباد کرنے کے لیے، جگہ کی ویرانی کے اندازے کے مطابق، تعمیر درکار ہوتی ہے۔ مان لیا کہ جنت ہر طرح کی آسائشیں اور راحتیں مہیا کرتی ہے لیکن ہماری ویرانیاں

اور افسردگیاں اس حد تک پہنچی ہوئی ہیں کہ جنت بھی ان کا مداوا نہیں کرسکتی۔

با خصمِ زبون غیر ترحم چہ توان کرد
من ضامنِ تاثیر اگر نالہ رسا نیست

لغت: ''خصم زبوں'' = ایک حقیر دشمن، مقصود رقیب۔

ایک حقیر دشمن کے ساتھ سوائے رحم کی دعا کرنے کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ اگر نالہ رسا نہیں تو میں اس کی تاثیر کی ضمانت دیتا ہوں۔

مان لیا کہ عاشق کی فریاد بے اثر ہوتی ہے لیکن رقیب جیسے زبوں حال دشمن کے حق میں بے اثر نہیں ہوسکتی۔

فریاد ز زخمی کہ نمک سود نباشد
ھنگامہ بیفزای کہ پرسش بسزا نیست

لغت: ''زخم نمک سود'' = وہ زخم جس پر نمک چھڑکا گیا ہو۔
زخم پر نمک چھڑکنے سے زخم کے درد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔
''پرسش'' = پرسش حال، عیادت۔
''بسزا'' = مناسب حال۔
''ہنگامہ'' = عاشق پر جور و ستم کرنا، طرح طرح کے چرکے لگانا۔ محبوب کی تمام ستم ظریفیوں کے لیے شاعر نے ہنگامے کا لفظ استعمال کیا ہے۔

شاعر معشوق سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اس زخم کی حالت قابل رحم ہے جس پر نمک نہ چھڑکا گیا ہو۔ ان ستم رانیوں میں اضافہ کیونکہ میری پرسش حال کرنا میرے حال کے

مطابق نہیں ہے۔

عاشق، معشوق کے جور وستم کو بھی، پرسش حال ہی تصور کرتا ہے کیونکہ اس میں بھی التفات کا ایک پہلو ہوتا ہے، لیکن یہی کافی نہیں، زخم لگانے کے بعد نمک چھڑکنا بھی ضروری ہے۔ اس سے درد بڑھ جائے گا اور لذت درد میں اضافہ ہوگا۔ اسی کو عاشق مناسب پرسش حال سے تعبیر کرتا ہے۔

گرمہر و گرکین ھمہ از دوست قبول است
اندیشہ جز آئینۂ تصویرنما نیست

لغت: "اندیشہ" = خیال، تصور۔

"آئینۂ تصویرنما" = آئینہ جس میں عکس ہو بہو اُبھر آئے۔

"مہر و کیں" = محبت اور دشمنی، یہاں مراد نرمی و سختی ہے۔

دوست کی طرف سے محبت میسر آئے یا جور و جفا، سبھی کچھ غنیمت ہے۔ ہمارا وجود تو ایک آئینے کی طرح ہے جس میں دوست کا عکس نظر آجاتا ہے، خواہ وہ کسی رنگ میں ہو۔

زندگی کی شیرینیاں اور تلخیاں سبھی اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہیں۔ ان میں تفریق کرنا غلط ہے۔

یہ اس کی ذات کے مختلف انداز ہے۔

مینای مَی از تندیِ این مَی بگدازد
پیغام غمت در خورِ تحویل صبا نیست

شاعر نے اس شعر میں پیغام غم یا پیغام محبت کو (جو لبریز غم ہے) تند و تیز شراب سے تعبیر کیا ہے اور صبا کو مینائے مے سے تشبیہ دی ہے۔ غم محبت کی تندی اور تیزی سے شیشہ مے بھی

گداز ہو جاتا ہے یہ ایسا پیغام ہے جسے صبا کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ پیغام تو ایک دل سے دوسرے دل تک براہ راست پہنچتا ہے۔ اور اسے عاشق کا دل ہی گوارا کرسکتا ہے۔

ھر مرحلہ از دھر سراب است لبی را!
کز نقشِ کف پای کسی بوسہ ربا نیست

"سراب" = چمکتی ہوئی ریت جو دور سے پانی معلوم ہوتی ہے۔ دھوکا، چھلاوہ۔ اس دنیا کا ہر قدم (ہر ٹکڑا) ایسے لب کے لیے ایک سراب کی حیثیت رکھتا ہے جس نے کسی کے نقش کف پا کو بوسہ نہ دیا ہو۔

عاشق کی نظر میں یہ سرزمین اسی وقت دل آویز ہوتی ہے جب اس پر کسی حسینہ کے نقش قدم ہوں۔ عاشق ان نقوش کو چوم کر اپنے دل کی پیاس بجھاتا ہے ورنہ یہ سرزمین تو ایک مشت خاک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

از ناز دل بی ھوس ما نہ پسندید
دل تنگ شد و گفت درین خانہ ھوا نیست

لغت: "ہوا" = ہوا کو بھی کہتے ہیں۔ اور اس کا ایک مفہوم ہوس بھی ہے، جیسے مرکب حرص و ہوا کا مطلب حرص و ہوس ہے۔

"دل تنگ" = یہ مرکب مقلوب ہے یعنی تنگدل، افسردہ، آزردہ۔

اُس (محبوب) نے ناز سے ہمارے بے ہوس دل کو پسند نہ کیا۔ آزردہ خاطر ہوا اور کہا کے اس گھر میں تو ہوا ہی نہیں ہے۔

عاشق کا دل محبت سے لبریز ہے اور اس میں حرص و ہوا کا شائبہ تک نہیں لیکن معشوق کو ایسا

دل پسند نہیں وہ اسے ایسا گھر خیال کرتا ہے جس میں ہوا نہ ہو۔اس سے مکین کی طبیعت گھبراتی ہے۔

شاعر نے ''ہوا'' کا ذومعنی لفظ استعمال کیا ہے یہ صنعت ابہام ہے جب شعر میں کوئی ایسا لفظ جس کے دو معنے ہوں، ایک قریبی اور دوسرے بعیدی، اور بعیدی، معنے مراد لیے جائیں تو وہ صنعت ایہام کہلاتی ہے۔

اس شعر میں سیاق وسباق کے اعتبار سے ہوا کے قریبی معنی ہوا ہونے چاہیں لیکن یہاں ہوا بعیدی معنوں، یعنی ''ہوس'' کے لیے آیا ہے اس صنعت کے استعمال سے شاعر قارئین شعر کے ذہن میں استعجاب کی کیفیت پیدا کرتا ہے جو مزہ دیتی ہے۔

برگشتنِ مژگانِ تو از روی عتاب است

کاندر دلم از تنگی جا یک مژہ جا نیست

لغت: ''برگشتن مژکان'' = پلکوں کا پھر جانا۔ آنکھیں پھیر لینا یا بے رخی کا اظہار کرنا۔

''تنگ دل'' = دل کی گھٹن یا افسردگی۔

- تیری پلکوں کا پھر جانا عتاب کی وجہ سے ہے کیوں کہ (تو جانتا ہے کہ) میرے دل میں جگہ کی تنگی کے باعث ایک مژہ کی بھی گنجائش نہیں۔

عاشق کا دل اتنا افسردہ ہے کہ اس میں یادِ یار یا خیالِ یار بھی نہیں سما سکتا۔اس پر ایک بے دلی کی حالت طاری ہے۔جس کے باعث معشوق بگڑ کر اس سے آنکھیں پھیر لیتا ہے۔

''جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا۔'' (غالب)

دریوزۂ راحت نتوان کرد ز مرہم

غالب ہمہ تن خستۂ یار است گدا نیست

لغت: ''دریوزہ'' = گداگری۔

''دریوزۂ راحت'' = آرام اور راحت طلب کرنا۔

''خستہ'' = زخمی، خراب حال۔

مرہم طلب کر کے راحت و آرام کی دریوزہ گری نہیں کی جا سکتی۔ غالب محبوب کا سر تا پا زخمی تو ہے، گدا نہیں ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۳)

بسکہ درین داوری بی اثر افتادہ است

اشک، تو گوئی، مرا از نظر افتادہ است

لغت: ''مرا از نظر'' میں را اضافی ہے یعنی اضافت کا کام دے رہا ہے۔اس سے مراد ہے۔ ''از نظرِ من'' ''داوری'' = لغوی معنے ہیں اضافت طلبی۔ یہاں محبت کا معاملہ یا تقاضا۔ چونکہ محبت میں میرے آنسو بے اثر ہیں اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ میری نظر سے گر گئے ہیں۔ محبت میں آنسو بہانے سے معشوق کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا اس لیے عاشق کہتا ہے کہ یہ آنسو میری آنکھوں سے نہیں بلکہ نظر سے گر گئے ہیں یعنی حقیر ہیں۔

عکسِ تنش را در آب لرزہ بود ھم ز موج

بیم نگاہِ خودش کار گر افتادہ است

اُس (محبوب) کے جسم کا عکس پانی میں لہروں کے تموج سے لرز رہا ہے۔ اس کی نظروں کا عتاب کتنا کارگر واقع ہوا ہے۔

یعنی محبوب خود بھی اپنے عکس کو پانی میں دیکھ کر برہم ہو رہا ہے اور وہ عکس اس کے عتاب سے لرز رہا ہے۔ عکس کا پانی میں لرزنا لہروں کی وجہ سے ہے لیکن شاعر اسے محبوب کے عتاب سے منسوب کرتا ہے۔ اس طرح سے کسی واقعے کی اصلی علت کو چھوڑ کر اس واقعے کو کسی اور علت کا معلول قرار دینا علم بدائع میں ایک صنعت کہلاتا ہے جسے حسن تعلیل کہتے ہیں، یعنی کوئی عمدہ اور خوبصورت علت تلاش کرنا۔

نالہ نداند کہ من شعلہ زیان کردہ ام

ھر چہ ز دل جستہ است، در جگر افتادہ است

فریاد کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ میرے سینے سے ابھرا ہوا ایک شعلہ ضائع ہو گیا کیونکہ جو آگ دل سے لپکی تھی وہ لپک کر جگر پر جا پڑی ہے۔

عاشق کی فریاد بے سود ہوتی ہے جو معشوق کے دل پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ بظاہر یہ آتش محبت کا زیاں معلوم ہوتا ہے کہ ایک شعلہ ضائع ہو گیا۔ لیکن نہیں۔ ایسی فریادیں کرنے سے دل کی گرمی کہاں کم ہوتی ہے۔ دل سے ابھرے ہوئے آتشیں نالے جگر پر اور جگر سے اٹھے ہوئے شعلے دل پر جا پڑتے ہیں اور کبھی ٹھنڈے نہیں ہوتے۔ غرض عاشق کے دل و جگر دونوں لبریز سوز عشق ہوتے ہیں اور نالاں رہتے ہیں۔

خاطرِ بلبل بجوی، قطرۂ شبنم مگوی

کز پسی گوشِ گل نالہ تر افتادہ است

بلبل کی دلداری کر۔ (یہ جو پھول پر قطرے نظر آ رہے ہیں) انھیں قطرۂ شبنم نہ سمجھ کیونکہ یہ تو پھول کے کان کے پردے پر نالہ (فریاد) ٹھنڈا اور بے اثر ہو کر پڑا ہوا ہے۔

بلبل، پھول کے عشق میں فریاد کرتی ہے لیکن پھول اس سے بے نیاز ہے۔ بلبل کی آتشیں فریادیں، پھول کے کان میں اثر انداز ہونے کی بجائے نالہ و فریاد بن کر شبنم کے قطروں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

از نگہ سر خوشت کام تمنا کند

آئنۂ سادہ دل، دیدہ ور افتادہ است

لغت: "نگہ سرخوش" = شوق بھری نگاہ۔

"کام تمنا کند" = اپنی تمنا پوری کر لیتا ہے۔

"دیدہ ور" = صاحب نظر۔

تو آئینہ سادہ دل کو اپنی شوق بھری نظروں سے دیکھتا ہے اور وہ تیرے جلوۂ حسن سے تجھے دیکھنے کی تمنا پوری کر لیتا ہے۔ دیکھو، آئینہ کتنا صاحب نظر واقع ہوا ہے۔

معشوق بڑے ذوق و شوق سے آئینہ دیکھنے میں محو ہے اور یہ آئینے کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس کے دیدار سے فیضیاب ہو رہا ہے۔ اسے گویا آئینے کی دیدہ وری کہنی چاہئے۔

او دلی از ما گداخت وین نفست گرم ساخت

نالۂ ما از نگاہ شوخ تر افتادہ است

لغت: "اُو" کا ضمیر "نگاہ" کے لیے اور "این" کا "نالہ" کے لیے آیا ہے۔

تیری نگہ سے ہمارا دل گداز ہو گیا اور ہماری فریاد نے تیرے سانس کو گرما دیا۔ ہماری

فریاد، تیری نگاہ سے شوخ تر نکلی۔

معشوق نے عاشق کو ایک نظر دیکھا تو اس کا دل جل اٹھا۔ عاشق کی فریاد نے معشوق کو برہم کر دیا یعنی فریاد نگاہ سے شوخ تر نکلی۔

خون ہوس پیشگان، خوش نبود ریختن
تیغِ ادا پارۂ بد گہر افتادہ است

لغت: ''ہوس پیشگان'' = ہوس پیشہ لوگ، اہل ہوس، اہل وفا کی ضد۔
''پارہ'' = قدرے، تھوڑی سی۔ ''تیغ بدگہر'' = اشارہ ہے ایسی تلوار کی طرف جو اصیل نہ ہو۔

ہوس پیشہ لوگوں کا خون بہانا اچھا نہیں ہوتا لیکن معشوق کی تیغ ادا اس بارے میں قدرے اصیل واقع نہیں ہوئی۔

عاشق کے لیے تو معشوق کی تیغ ادا کا ایک ہی وار کافی ہوتا ہے۔ اہل ہوس جان دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ انھیں مارنے کا کیا فائدہ۔ وہ اس کے شایاں نہیں مگر معشوق اپنے ناز و انداز کی تلوار کو وہاں پر بھی آزماتا ہے جو غلط ہے۔ اسی اعتبار سے شاعر نے تیغ ادا کو بدگہر کہا ہے جو بہت موزوں ہے۔

رشک دھانت گذاشت غنچۂ گل چون شگفت
دید کہ از روی کار پردہ افتادہ است

لغت: '' از روے کار پردہ بر افتاد'' یعنی معاملے سے پردہ اٹھ گیا۔
معشوق کے دہن تنگ اور کلی میں ایک مشابہت ہوتی ہے۔ اسی لیے شاعر، دہن

معشوق کو غنچۂ ناشگفتہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ غنچے کو محبوب کا دہن تنگ دیکھ کر رشک آتا ہے جیسا کہ اس شعر میں ظاہر کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے:
غنچہ جب کھل گیا تو گویا اس نے تیرے دہن پر رشک کرنا چھوڑ دیا اس لیے کہ اس نے دیکھا کہ معاملہ فاش ہو گیا۔

پھول کی کلی کو محبوب کے دہن تنگ پر رشک آتا تھا لیکن اس نے آخر محسوس کیا کہ وہ اس کی رعنائیوں اور خاموش لبوں کے مقابل میں ہیچ ہے، اس لیے وہ کھل گئی اور غنچگی کی حالت کو خیر باد کہہ دیا۔ اسی راز کا انکشاف تھا جسے شاعر بات کا فاش ہونا قرار دیتا ہے۔

دہ بہ فرو ماندگی دادِ فرو ماندگان
سایہ در افتادگی وقفِ ہر افتادہ است

لغت: ''فرو ماندگاں'' = عاجز، خستہ حال لوگ۔
فرو ماندگی اُسی سے اسم مصدر ہے، یعنی فرو ماندہ ہونے کی حالت افتادہ = گرا ہوا، اور ''افتادگی'' گرے ہوئے ہونے کی حالت۔ شاعر محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے:
عاجزوں اور خستہ حالوں کی خستگی کی داد دو۔ دیکھو کہ سایہ کس طرح گرے ہوؤں کا ساتھ دیتا ہے۔

انسان جب کھڑا ہو تو اس کا سایہ زمین پر ہوتا ہے لیکن جب وہ گر پڑے تو اس کا سایہ اس سے لپٹ جاتا ہے۔ گویا سایہ گرے ہوئے انسان کا ساتھ دیتا ہے۔ شاعر اسی حالت کو بیان کر کے محبوب سے کہتا ہے کہ تجھے بھی یونہی خستہ حالوں کی دلداری کرنی چاہیے۔

غزل نمبر (۴)

در گرد نالہ وادیِ دل رزمگاہ کیست

خونی کہ می دود بہ شرائین سیاہ کیست

لغت: ''شرائین'' = رگیں۔

عاشق کے دل میں جذبات محبت نے ایک ہنگامہ بپا کر رکھا ہے اور اس سے فریادیں ابھر رہی ہے۔ دل کے اس ہنگامہ زار جذبات کو شاعر نے ''رزمگاہ'' (میدان جنگ) کا نام دیا ہے۔ کہتا ہے: نالہ وفریاد کے گرد وغبار میں وادی دل کس کی رزم گاہ بنا ہوا ہے۔ یہ خون جو ہمارے رگ وریشے میں دوڑ رہا ہے کس کی سپاہ ہے۔

حسن تو در حجاب ز شرم گناہ کیست

جا بر کرشمہ تنگ ز جوش نگاہ کیست

یہ غزل کا دوسرا مطلع ہے۔ اصطلاح شعر میں ایسے مطلع کو مطلع ثانی یا حسن مطلع کہتے ہیں۔ حسن مطلع سے مراد یہ ہے کہ یہ دوسرا مطلع پہلے مطلع سے بہتر ہے۔

لغت: ''جا بر کرشمہ تنگ'' = ناز وادا کے حسن کے اظہار کا دائرہ۔

تنگ ہو کر رہ گیا، یعنی محبوب ناز وادا دکھانے سے معذور ہے۔ کس کے احساس گناہ کی ندامت سے حسن پردے میں چھپ گیا ہے۔ یہ کس کی شوخ نگاہی سے حسن اپنے (ناز وادا کے) جلوے نہیں دکھا سکتا۔ عاشق کا محبوب کو شوخ شوخ نظروں سے دیکھنا ایک طرح کی شان حسن میں گستاخی ہے۔ معشوق نہیں چاہتا کہ عاشق یہ گناہ کرے چنانچہ اس نے اپنے آپ کو چھپا لیا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ حسن کے لیے جلوہ فرمائیوں کا موقع نہیں رہا۔ شاعر نے اس کی وجہ عاشق کا جوش نگاہ کہا ہے۔

مست است و رخ کشادہ بہ گلزار می رود

خون در دل بہار ز تاثیر آہ کیست

محبوب، مستانہ وار، نقاب اٹھائے، باغ کی طرف جا رہا ہے اور اس کے ان بے باک جلوؤں سے رشک کے باعث، بہار کا دل گویا خون میں غرق ہے۔ یہ کس کی آہوں کے اثر کا نتیجہ ہے؟

یعنی وہ کون ہے جس کی آہیں محبوب کو بے نقاب باہر کھینچ لائی ہیں کہ اس کے بے حجاب جلوے، بہار پر ستم ڈھا رہے ہیں۔

ما با تو آشنا و تو بیگانہ ز ما

آخر تو و خدا کہ جہانی گواہ کیست

لغت: ''تو و خدا'' = تجھے خدا کی قسم

ہم تیرے آشنا ہیں، اور تو ہم سے بیگانہ ہے۔ تجھے خدا کی قسم، آخر تو ہی بتا کہ دنیا کیا کہتی ہے۔

یعنی وہ ہماری آشنائی اور وفاداری کو دیکھتی ہے یا تمہاری بے التفاتی اور بے وفائی کو۔

مو بر نتابد این ہمہ پیچ و خم و شکن

زلف تو روز نامۂ بخت سیاہ کیست

محبوب کی زلفیں پر پیچ ہیں اتنی ہی پیچ کہ اس سے زیادہ بالوں میں پیچ وخم کا تصور

ہی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ بال تو اتنے پیچ وخم اور شکن برداشت نہیں کر سکتے۔ بتا کہ یہ تیری زلفیں کس کے بخت سیاہ کا روزنامچہ ہے۔

گویا معشوق کی سیہ اور پیچ وخم کھائی ہوئی زلفیں، عاشق کی سیاہ بختی اور الجھے ہوئے نصیبے کی تصویر ہیں۔

زینسان کہ سربسر گل وریحان وسنبل است
طرف چمن نمونۂ طرف کلاہ کیست

گوشۂ چمن میں جو اس طرح، گل، ریحان وسنبل کی کثرت ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کی طرح دار کلاہ کا نمونہ ہے۔

یعنی چمن معشوق کی کلاہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں گل کی رنگت، ریحان کی سی خوشبو، اور سنبل کے سے پیچ وخم اور شکن ہیں۔

رشک آیدم بہ روشنی دیدہ ھائی خلق
دانستہ ام کہ از اثر گرد راہ کیست

مجھے لوگوں کی روشنیٔ چشم (آنکھوں کی چمک) پر رشک آتا ہے میں جانتا ہوں کہ کس کی راہ کے گرد و غبار کا اثر ہے۔

یعنی معشوق کی راہ سے جو غبار اٹھتا ہے وہ لوگوں کی آنکھوں کو بینائی بخشتا ہے اور عاشق کو اس بات سے رشک آتا ہے

با من بخواب ناز و من از رشک بدگمان
تا عرصۂ خیال عدو جلوہ گاہ کیست

وہ میرے ساتھ ناز سے سویا ہوا ہے لیکن میری حالت دیکھیے کہ مجھے یہ بدگمانی رہی ہے کہ دشمن (رقیب) کے خیال اور تصور میں کس کی جلوہ گاہ سمائی ہوئی ہے۔

باوجود اس کے کہ عاشق محبوب کے وصل سے فیض یاب ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ رقیب کے ذہن میں اس کا خیال بھی آئے اور وہ اس کے تصور سے لذت اندوز ہو۔

بی خود بہ وقت ذبح تپیدن، گناہ من
دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

لغت: ''دشنہ'' = خنجر، چھری۔

قتل کے وقت بیخودی اور سرشاری کے عالم میں تڑپنا تو خیر میرا گناہ ہے لیکن یہ تو بتا کہ جان بوجھ کر چھری کو تیز نہ کرنا کس کی خطا ہے۔

غالب حساب زندگی از سرگرفتہ است
جانا! بمن بگو کہ غمت عمر کاہ کیست

لغت: ''عمر کاہ'' = عمر کو کم کر دینے والا۔

غالب نے تو حساب زندگی کو از سر نو شروع کر دیا، اے محبوب! بتا کہ تیرا غم کس کی عمر کو گھٹاتا ہے؟

ایک وہ ہیں کہ محبوب کے غم محبت میں ان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ مصیبت سے نجات حاصل کر لیتے ہیں لیکن غالب ہے کہ غم جدائی میں نہ جانے کتنی زندگیاں گزار چکا ہے۔ ایک ختم ہوتی ہے تو دوسری شروع کر دیتا ہے، گویا سخت جان بھی ہے کہ نہیں مرتا اور جدائی کے صدموں سے جو موت سے کم نہیں عہدہ برآ بھی نہیں ہوتا اور لذت اندوز ہوتا چلا جاتا ہے۔ غالب کے اس شعر کو دیکھیے۔

کہوں تجھ سے میں کہ کیا ہے، شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اور پھر اس کے اس شعر پر نظر ڈالیے:

کارفرمائی شوق تو قیامت آورد
مردم و باز بہ ایجاد دل و جاں رفتم

ان تینوں شعروں میں ایک ہی جذبہ اور تجربہ کارفرما ہے۔

❀❀❀
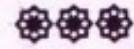
غزل نمبر (۵)

در تابم از خیال کہ دل جلوہ گاہ کیست
داغم ز انتظار کہ چشمش براہ کیست

میں اپنے اس تصور سے پیچ وتاب کھا رہا ہوں کہ اس کا دل کس کی جلوہ گاہ ہے اور اس کے انتظار کی حالت کو دیکھ کر (رشک سے) جل رہا ہوں کہ اس کی آنکھیں کس کی راہ دیکھ رہی ہیں۔

اس پوری غزل میں مرزا غالب نے اپنے محبوب کے کسی اور پر فریفتہ ہو جانے کی حالت بیان کی ہے اور اس بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں کہتا ہے کہ مجھے یہ تصور مارے ڈالتا ہے کہ وہ کونسی ہستی ہے جس کا خیال میرے محبوب کے دل میں سمایا ہوا

ہے اور وہ اس کے انتظار میں محو ہے۔

از نالہ خیزی دل سختش در آتشم
این سنگ پر شرر زہجوم نگاہ کیست

میں اس کے دل سخت سے نالہ وفریاد ابھرتے دیکھ کر، رشک سے جل رہا ہوں۔ سو چتا ہوں کہ کس کی نگاہوں کے ہجوم سے اس کے پتھر جیسے دل سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔

چشمش پر آب از تف مہر پریوشی است
من در گمان کہ از اثر دود آہ کیست

لغت: ''تف مہر''= محبت کی گرمی

اس کی آنکھیں پرنم ہیں اور یہ کسی پریوش (حسینہ) کی محبت کی گرمی کا اثر ہے لیکن میں اس گماں میں مبتلا ہوں کہ یہ کس کی آہوں کے دھوئیں کا اثر ہے۔ عاشق کو رشک آ رہا ہے کہ کہیں محبوب کے دل پر رقیب کی آہوں کا اثر نہ ہوا ہو۔

ظالم تو و شکایت عشق اینچہ ماجر است
باری بمن بگو کہ دلت داد خواہ کیست

اے ظالم! تو اور عشق کے ہاتھوں شکایت کرے، یہ کیا ماجرا ہے؟ قربان جاؤں مجھے یہ تو بتا کہ تیرا دل کس سے محبت کے دکھوں کی داد خواہی کر رہا ہے۔

در خود گم است جلوۂ برق عتاب تو
این تیرگی بہ طالع مشت گیاہ کیست

تیرے غیظ و غضب کی برق پاشیوں کے جلوے، اپنے ہی میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ
سیاہی اور تاریکی کس کے "مشت گیاہ" (مٹھی بھر تنکے) کی سیاہ بختی کا عکس ہیں۔

محبوب کے عتاب میں بھی حسن کا جلال ہوتا تھا۔ اب کسی پر عاشق ہو جانے سے وہ
جلال دب گیا ہے۔ گویا برق عتاب ماند پڑ گئی ہے اور اس سے شعلے نکلنے کی بجائے اب سیاہ دھواں
اٹھ رہا ہے جسے شاعر نے مٹھی بھر تنکوں کے جلنے سے تعبیر کیا ہے۔

نیرنگ عشق شوکت رعنائی تو برد
در طالع تو گردش چشم سیاہ کیست

لغت: "گردش چشم" = آنکھوں کا پھرنا

عشق کی عجب کاری دیکھو کہ اس نے تیرے حسن کی شان و شوکت چھین لی ہے۔ یہ کس
محبوب کی چشم سیاہ کی گردش، تیرے نصیبے کی گردش بن گئی۔

محبوب کے عشق میں مبتلا ہو جانے سے اس کے حسن کا رنگ روپ ماند پڑ گیا ہے۔
اب وہ اپنے معشوق کی آنکھوں کے اشاروں پر چلتا ہے، اس کی آنکھوں کا پھرنا گویا نصیبے کا
پھر جانا ہے۔

گوید بعجز چوں تو خدا ناشناس، حیف
با چون خودی کہ داور گیتی گواہ کیست

کس قدر افسوس ہے کہ اب تجھ جیسا خدا ناشناس بھی ایک اپنے جیسے سے یہ کہہ رہا ہے
کہ اس دنیا کا انصاف کرنے والا، (خالق کائنات) بھی کوئی ہے۔

"داور گیتی گواہ کیست" فارسی محاوراتی اسلوب بیان ہے جس کا مفہوم ہے کہ اللہ

تعالیٰ جو انصاف کرنے والا ہے، سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ مرزا غالب نے اپنے محبوب کو جور و ستم
کے اعتبار سے خدا ناشناس کہا ہے کیونکہ وہ خدا سے نہیں ڈرتا۔ اب وہ خود کسی کے عشق میں مبتلا
ہو کر اور اس کے جور و ستم دیکھ کر اسے خدا کے واسطے دے رہا ہے۔

با اینہمہ شکست، درستی ادای اُوست
رنگ رخت نمونۂ طرفِ کلاہ کیست

لغت: "لغوی طور پر شکست، درستی کی ضد ہے۔ محاورۂ شکست کا مفہوم مختلف ہے۔
شکست رنگ، رنگ کے اڑنے کو کہتے ہیں شکست کلاہ سے مراد، وہ شکن ہے جو کلاہ کے ٹیڑھا رکھنے
سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس انداز شکست میں ایک دلکشی ہوتی ہے۔

شاعر کہتا ہے، تیرے چہرے کا رنگ اتنا اڑ گیا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں ایک
رعنائی (درستی) کی ادا پائی جاتی ہے۔ تیرے شکست رنگ میں کسی کی شکست کلاہ کا انداز ہے، یعنی
کس حسین کے حسن نے تجھے گرویدہ کر لیا ہے۔

مرزا غالب کے تصورات حسن میں ایک تصور یہ بھی ہے کہ حسن کسی حالت میں بھی ہو،
حسین و دل کش ہوتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے:

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے، جوں جوں کہ اڑتا جائے ہے

باتو بہ پند حرف بہ تلخی گناہ من
با من بعشق، غلبہ بدعویٰ گناہ کیست

یہ درست کہ میں تجھے نصیحت کرتے اور سمجھاتے کبھی تلخ بات بھی کرتا ہوں، یہ میرا

قصور ہے۔ لیکن عشق کے معاملے میں میرے ساتھ، اپنے عاشق ہونے کے دعوے میں اتنے جذبات کے غلبے کا اظہار کرنا، کس کا گناہ ہے؟

غالب! کنون کہ قبلہ او کوی دلبر است
کی می رسد بدین کہ درش سجدہ گاہ کیست

اے غالب اب جب کہ کوئے دلبر اس کا (یعنی محبوب کا) قبلہ بن چکا ہے، اس بات کا کیا تذکرہ کرنا کہ اس کا اپنا دروازہ کس کی سجدہ گاہ ہے؟

میرا محبوب تو اپنے در معشوق پر جبہہ سائی کر رہا ہے اور اس نے اسے اپنا قبلہ بنا لیا ہے۔ اب اسے اس بات کی کیا پرواہ ہے کہ اس کے دروازے پر کون سر جھکا رہا ہے، یعنی وہ اپنے عشق کے جذبات میں کھو گیا ہے، اب وہ عاشق کے جذبات کو کب خاطر میں لا سکتا ہے۔

❀❀❀
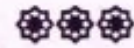
غزل نمبر (۶)

یاد از عدو نیارم وین ھم ز دور بینی است
کاندر دلم گذشتن با دوست ھم نشینی است

مولانا حالی نے اس شعر کی شرح بڑی وضاحت سے کی ہے۔ فرماتے ہیں:

میں جو رقیب کا خیال دل میں نہیں لاتا، یہ دور بینی کی بات ہے کہ کیونکہ میرے دل

میں ہر وقت دوست رہتا ہے کہ رقیب کا خیال دل میں آئے گا تو گویا رقیب دوست کے ساتھ ہم نشیں ہو جائے گا۔

در عالم خرابی از خیل منعمانم
سیلم برخت شوئی، برقم بخوشہ چینی است

جہاں تک بربادی اور تباہی کی دنیا کا تعلق ہے، میں اس دنیا کے بڑے بڑے امرا میں سے ہوں۔ میرا سیلاب، ساز و سامان کو بہا کر لے جانے میں مصروف رہتا ہے اور میری برق، خرمن کو اچک کر لے جانے میں۔

یعنی مجھ سے زیادہ برباد حال کوئی نہ ہوگا، سیل عشق، برق عشق دونوں میرے ساز و سامان حیات کے درپے ہیں۔

میرم، ولی بترسم کز فرط بدگمانی
داند کہ جان سپردن از عافیت گزینی است

میں جان تو دیتا ہوں لیکن جان دیتے ڈرتا ہوں کہ اس میں اتنی بدگمانی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جان دینا تو عافیت کوشی کی علامت ہے۔

در بادہ دیر مستم، آری ز سخت جانی است
در غمزہ زود رنجی آری ز نازنینی است

میں شراب پیتا ہوں تو بڑی دیر میں مست ہوتا ہوں، ہاں یہ میری سخت جانی کی علامت ہے۔ تو ناز و ادا دکھانے میں جلد بگڑ جاتا ہے، ہاں یہ بات تیرے نازنین ہونے کے

باعث ہے، یعنی تیرے یہ تیور بھی ناز و ادا ہی ہیں۔

من سوی او بہ بینم، داند ز بی حیائی است

اُو سوی من نہ بیند، دانم ز شرمگینی است

میں اُس کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ اسے گستاخی اور بے حیائی خیال کرتا ہے۔ وہ میری طرف نہیں دیکھتا، میں سمجھتا ہوں یہ اس کی شرم وحیا کی وجہ سے ہے۔

ذوقی است در ادایت، قاصد تو و خدایت

در جیب من بیفشان خلدی کہ آستینی است

اے قاصد! پیغام محبوب کے سلسلے میں، تیرا انداز ایک خاص ذوق رکھتا ہے، خدا کے واسطے جو جنت تیرے آستین میں پنہاں ہے وہ (جلدی سے) میری جیب میں ڈال دے۔

قاصد محبوب کی طرف سے پیغام لے کر آیا ہے اور اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ پیغام خوش آیند پیغام ہے۔ شاعر اسے خلد کہہ کر پکارتا ہے جسے قاصد نے آستین میں چھپا رکھا ہے۔

زین خونچکان نواھا در یاب ماجراھا

ھنگامہ ام اسیری، اندیشہ ام حزینی است

میری ان خونچکاں فریادوں سے اندازہ کر لے کہ مجھ پہ کیا کیا حالتیں گزرتی ہوں گی۔ میری زندگی کے ولولے کیا ہیں اسیری اور افکار کیا ہیں۔ غم و اندوہ۔

درد شکست دل را، رام صدا نخواھم

ساز شکایت من تارش ز موی چینی است

لغت: ''موے چینی'' = اسے موے پیالہ یا موے کاسہ بھی کہتے ہیں۔ اردو میں موے کی جگہ بال بھی بولتے ہیں۔ وہ ہلکی سی دراڑ جو پیالے میں آجاتی ہے، دیکھنے میں بال کی شکل کی ہوئی ہے۔ وہی موے چینی ہے۔

ایسے پیالے کو کھڑکانے سے آواز نہیں آتی۔

ذوق کہتا ہے:

ہے بے صدا وہ چینی جس میں کہ بال آیا

''میں نہیں چاہتا کہ میرے دل کا ٹوٹنا آواز کا پابند ہو (یعنی اس سے کوئی آواز نکلے) میرے ساز شکایت کے تار موے چینی کے ہیں۔

عاشق کا دل ٹوٹ چکا ہے لیکن وہ خاموش ہے اور شکایت لب پہ نہیں لاتا۔

سوزم دمی کہ یارم یاد آورد کہ غالب

در خاطرش گذشتن با غیر همنشینی است

اس مقطع میں مرزا غالب نے ایک ہی نوعیت کے احساس کو بیان کیا ہے لیکن نئے انداز کے ساتھ۔

''غالب جب بھی مجھے میرا محبوب یاد کرتا ہے تو میں جلتا ہوں کیونکہ اس کے دل میں کسی کا خیال آنا (رقیب کا ہم نشیں ہونا ہے۔

معشوق کے دل میں رقیب کا خیال سمایا رہتا ہے، اس لیے جب عاشق کا خیال اس کے دل میں آئے گا تو وہ گویا رقیب کا ہمنشیں ہوگا اور عاشق یہ بات گوارا نہیں کرسکتا۔

❀❀❀

غزل نمبر(۷)

لب شیرین تو جانِ نمک است
وین که گفتم به زبانِ نمک است

شیرینی اور نمکینی دونوں خوشگوار ذائقے کی چیزیں ہیں۔ دونوں کا مزہ الگ الگ ہے۔ معشوق کے لبوں کو عموماً شیریں کہا جاتا ہے لیکن شاعر کہتا ہے: ''تیرے شیریں لب نمک کی جان ہیں اور پھر کہتا ہے کہ یہ بات بھی جو میں کہہ رہا ہوں نمک ہی کی زبان سے کہہ رہا ہوں۔ یعنی معشوق کے لبوں کی شیرینی میں نمکینی کی آمیزش ہے اور وہ اس قدر نمکین ہیں کہ خود نمک انھیں جان نمک کہہ کر پکارتا ہے۔

در نهاد نمک از رشک لبت
هست شوری که فغان نمک است

لغت: ''شور'' نمک اور فریاد دونوں کا مفہوم دیتا ہے۔ یہاں رعایت لفظی کے طور پر آیا ہے۔ شور کا مفہوم نمک ہی ہے۔ لیکن فغاں کی رعایت سے لایا گیا ہے۔ جس سے شعر میں صنعت ایہام پیدا ہوگئی ہے۔

نمک کی طینت میں، تیرے لبوں کے رشک سے وہ نمکینی کا اندازہ آگیا ہے کہ اسے فغاں نمک کہنا چاہیئے۔

ای شده لطف و عتابت همه ناز
ناز در عهد تو کانِ نمک است

تیرا لطف ہو کہ عتاب سر تا پا ناز ہے۔ ناز تو ترے عہد حسن میں کان نمک بن گیا ہے۔ جس طرح کان کی طینت اور تعمیر ہی نمک سے ہوتی ہے اور نمک کبھی ختم نہیں ہوتا اسی طرح معشوق کا ہر تیور ناز ہے اور نہ ختم ہونے والا ناز ہے۔

ناز سر مایۂ دیگر ز تو یافت
نمک خوان تو خوانِ نمک است

تیری بدولت تیرے ناز و انداز کو ایک نئی شان ملی ہے۔ گویا خوان میں جو نمک ہے وہ بذات خود خوان نمک بن گیا ہے۔

شورها صرف فغانم کردند
نمک از حسرتیان نمک است

میری فریاد میں اتنی نمک (شور) کی آمیزش ہے کہ نمک کو خود نمک ہونے کی حسرت ہے۔

زخم ما پنبۂ مرهم دارد
زین سفیدی که نشان نمک است

زخموں پر مرہم لگانے کے لیے روئی کا (پنبہ) استعمال کیا جاتا ہے جو سفید رنگ کا ہوتا ہے اور وہی رنگ نمک کا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے کہتا ہے۔

''ہمارے زخم پر پنبہ مرہم ہے۔ اس لیے کہ یہ سفید ہے اور سفیدی نشان نمک ہے۔

کہنا یہ ہے کہ عاشق کے زخم پر محبت کا مرہم نمک ہے۔ گو نمک زخم میں تلخی پیدا کرتا ہے لیکن عاشق اس تلخی کو مداوائے درد خیال کرتا ہے کیونکہ درد کی شدت میں اسے راحت ملتی ہے۔

گر نمک سود کنی زخم دلم

سود زخم است و زیان نمک است

لغت: ''نمک سود'' = زخم کو نمک سود کرنے کا مفہوم ہے زخم پر نمک چھڑکنا

''سود'' = فائدہ

کہتا ہے کہ اگر تو میرے زخم دل پر نمک چھڑکے تو یہ زخم کے لیے سرتا پا سود (نفع) ہے اور نمک کے لیے نقصان۔

عاشق کا زخم دل نمک سے راحت محسوس کرتا ہے اس لیے نمک زخم کے لیے مفید ہے لیکن پیہم نمک چھڑکنے سے نمک کی مقدار گھٹتی جائے گی یا اس کا زیاں ہوا۔

گفتی الماس فشاندم، تو و حق

نازش من بہ گمان نمک است

لغت: ''الماس'' = یعنی ہیرا۔ کہا جاتا ہے کہ ہیرے کا کوئی ریزہ زخم میں گر جائے تو وہ زخم کو چیرتا چلا جاتا ہے۔

شاعر کہتا ہے: تو نے کہا کہ میں نے (زخم پر) الماس چھڑکا۔ تو نے سچ کہا (تو و حق) لیکن میں جو اس پر ناز کرتا ہوں تو الماس پاشی کو نمک پاشی سمجھ کر کر رہا ہوں۔

مرزا غالب کا یہ شعر دیکھیے:۔

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا

کہ اس میں ریزہ الماس جزو اعظم است

نطق من مایۂ من بس غالب

خود نمک گوھر کان نمک است

غالب! میرا نطق (یعنی قوت بیان) ہی میرا سرمایہ ہے۔ نمک ہی کان نمک کا گوہر ہے۔

شاعر کا سرمایہ اس کا فن شعر ہے اور وہ خود ہی اپنے فن کا مداح بھی ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر (۸)

چہ فتنہ ھا کہ در اندازۂ گمان تو نیست

قیامت است، دلِ دیر مہربان تو نیست

لغت: ''چہ'' = بظاہر کلمۂ استفہام ہے لیکن یہاں نفی کے معنے دیتا ہے ''دل دیر مہربان'' = ایسا دل جو بڑی دیر کے بعد کسی پر مہربان ہو۔ کون سے ایسے فتنے ہیں جو تیرے تصور میں نہیں ہیں۔ تیرا دیر سے مہربان ہونے والا دل کیا ہے ایک قیامت ہے۔

محبوب کو عاشق پر ستم ڈھانے کے ہزاروں انداز معلوم ہیں۔ عاشق کی حالت زار کو دیکھ کر بھی بے اعتنائی سے کام لینا ایک ایسا ہی شیوہ ہے۔ اس کے مہربان ہوتے ہوتے عاشق پر قیامت گزر جاتی ہے۔

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

فریب آشتی دہ، این ظفر مبارک باد

دلِ ستم زدہ در بند امتحان تو نیست

(اب) محبت اور صلح کا فریب دے۔ تجھے یہ کامیابی مبارک ہو کہ میرا ستم زدہ دل، تیرے امتحان محبت سے آزاد ہو چکا ہے۔

محبوب، عاشق کی وفاداری کو آزمانے کے لیے ستم کرتا رہا۔ اگر اس جور وستم میں خلوص ہوتا تو پھر بھی کوئی بات تھی کیونکہ اس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک ربط کا پہلو تو نکلتا ہے۔

لیکن یہ محبوب کی ستم رانیاں بھی فریب ہی تھیں۔ عاشق کا دل مایوس ہو چکا ہے چنانچہ وہ اس سے کہتا ہے کہ اس فریب دہی میں تم کامیاب ہو گئے، مبارک ہو، اب کوئی اور انداز فریب سوچو اور وہ یہ کہ محبت سے پیش آؤ۔

شاعر نے کس ندرت بیان سے محبت کا واسطہ دیا ہے۔

مگر ز پارۂ سنگم کہ ریزدت دم تیغ

بکش، مترس کہ در سود من زیان تو نیست

شاید میں کوئی پتھر کا ٹکڑا ہوں کہ (تم ڈرتے ہو) اس سے تمہاری تلوار کی دھار خراب ہو جائے گی۔ ڈر نہیں۔ مجھے مار ڈال، میرے اس نفع میں تیرا کوئی نقصان نہیں۔

دلم بہ عہد وفائی فریفت نامہ سپار

خوش است وعدۂ تو، گرچہ از زبان تو نیست

لغت: ''نامہ سپار'' = پیام لانے والا قاصد۔

قاصد تیری طرف سے عہد وفا کا پیغام لایا اور میرا دل اسی پر فریفتہ ہو گیا۔ کتنا اچھا ہے یہ وعدہ! (دل تو لبھا گیا) اگرچہ یہ وعدہ تیری زبان سے نہیں، قاصد کی زبانی پہنچا ہے۔

شکست رنگ تو از عشق، خوش تماشای است

بہار دھر بہ رنگینی خزان تو نیست

لغت: ''شکست رنگ'' = رنگ اڑنا۔

عشق سے تیرے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے اور یہ ایک حسین نظارہ ہے۔ دنیا کی بہار میں تیری خزاں سی رنگینی نہیں ہے۔

محبوب کے زرد چہرے میں ایک ایسی حسین **شگفتگی** کا انداز ہے جو بہار کی رنگینیوں میں بھی نہیں ہوتا۔

مرزا غالب کے تصور حسن کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حسن ہر حالت میں حسین اور دلکش ہوتا ہے۔ کسی کی محبت میں ایک حسینہ کے زرد چہرے کا عجیب عالم ہوتا ہے۔

مرزا غالب کا یہ اردو شعر دیکھیے جسے سمجھنے میں عام لوگ غلطی کھا جاتے ہیں۔

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے

یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

''رنگ شکستہ'' سے مراد محبوب کا رنگ شکستہ ہے، جس سے طرح طرح کی ناز آفرینیوں کے پھول کھلتے ہیں۔

شباھتی است مر آن را کہ بر نیامدہ است

وگر نہ موی بہ باریکی میان تو نیست

پہلے مصرعے میں ''آن'' کا اشارہ ''میان'' یعنی کمر کی طرف ہے۔

تیری کمر کو بال سے صرف اتنی مشابہت ہے کہ یہ ایسے بال کی طرح ہے جو ابھی اگا نہیں، ورنہ کوئی بال تیری کمر کی طرح باریک نہیں۔ یعنی کمر اتنی باریک اور نازک ہے کہ نظر بھی نہیں آتی۔ اس شعر میں محض مبالغہ آمیزی ہے۔

ز حق مرنج و در ابرو ز خشم چین مفگن

خوش است رسم وفا، گرچہ در زمان تو نیست

سچ بات سے کبیدہ خاطر نہ ہو اور غصے سے ابرو میں شکن نہ ڈال۔ رسم وفا اچھی بات ہے، یہ الگ بات ہے کہ تمھارے زمانے میں اس کا دستور نہیں۔

وفاداری ایک مسلمہ خوبی ہے، کوئی اسے تسلیم نہ کرے تو اور بات ہے۔

روان فدای تو نام کہ بردہٗ ناصح
زہی لطافت ذوقی کہ در بیان تو نیست

اے ناصح! میری جان تجھ پر قربان، تو نے یہ کس کا نام لیا ہے۔ (سبحان اللہ) وہ کیسی لطافت اور لذت ہوگی کہ جو تیرے بیان میں نہیں (لیکن ہم اس سے محظوظ ہو رہے ہیں)۔

ناصح، عاشق کو ترکِ عشق کی تلقین کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ محبوب کا نام مزے لے کر نہیں بلکہ ایک طرح نفرت سے لے رہا ہے۔ لیکن اس برے انداز سے ذکر کرنے کے باوجود، محبوب کے نام میں دل آویزی ہے جسے شاعر نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

عتاب و مہر تماشائیان حوصلہ اند
بہ ہیچ عربدہ اندیشہ راز دان تو نیست

تیرے غصے اور محبت کا انداز ایسا ہے (ان سے تیری طبیعت کا کچھ سراغ نہیں ملتا) کہ انھیں صرف تماشائی کہا جا سکتا ہے جو عاشق کے حوصلے کو دیکھ رہے ہیں، ورنہ محبت کے کسی ہنگامے سے ہمارا تصور تیرے راز کو نہیں پا سکتا۔

دل از خموشی لعلت امیدوار چرا است
چہ گفتہٗ بہ زبانی کہ در دہان تو نیست

نہ جانے میرا دل تیرے لبِ لعلیں کی خموشی سے اتنا امیدوار کیوں ہے؟ تو نے ایسی زبان سے جو تیرے منہ میں نہیں ہے کیا کہہ دیا ہے؟

کوئی شخص خاموش ہو تو لوگ کہتے ہیں، اس کے منہ میں زبان نہیں۔ معشوق خاموش ہے لیکن اس کی خموشی کا انداز اس کی گویائی سے زیادہ حسین، دل کش اور فصیح ہے۔

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

گمانِ زیست بود برمنت زبی دردی
بد است مرگ، ولی بدتر از گمان تو نیست

یہ تیری بے دردی کی دلیل ہے کہ تجھے مجھ پر زندہ ہونے کا گمان ہے۔ موت بری شے سہی لیکن تیرے اس گمان سے زیادہ بری نہیں۔

معشوق کے جور و ستم سے عاشق کی زندگی موت کے برابر ہو رہی ہے۔ اور اُس کی ستم ظریفی کا یہ عالم ہیں کہ وہ عاشق کو زندہ شمار کرتا ہے۔ اس کا یہ انداز موت سے بھی زیادہ المناک ہے۔

عیار آتش سوزان گرفتہ ام صد بار
بہ سینہ تابی داغ غم نہان تو نیست

لغت: ''عیار چیزے گرفتن'' = فارسی کا محاورہ ہے یعنی کسی چیز کا اندزہ کرنا۔ ''سینہ تابی'' = سینے کی حرارت۔

میں جلا دینے والی آگ کا سو بار اندازہ کیا ہے تیری محبت کے غمِ پنہاں سے جو داغ ہمارے سینے میں ہے، اس کی حرارت اور تپش کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔

یہاں پنجابی کے مشہور شاعر ہاشم شاہ کا شعر یاد آ گیا۔ کہتا ہے:

آتش تو، بر ہوں دی آتش وچ تختی بہت پچھاتی

سوہنی روز ملے تریندیاں، پر سرد نہ ہویوس چھاتی

تغافل تو دلیل تجاہل افتاد است

تو و خدای تو، غالب ز بندگان تو نیست؟

لغت: ''تغافل'' = مصنوعی غفلت اور ''تجاہل'' = بناوٹی بے خبری ہے۔ معشوق سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

تیرا تغافل تیری بے خبری کی دلیل ہے۔ تجھے خدا کی قسم، یہ تو بتا دے کہ کیا غالب تیرے بندوں میں نہیں (کہ اسے تو نے یکسر بھلا دیا ہے۔)

❀❀❀

غزل نمبر (۹)

ای کہ گوئی غم درون سینہ جانفرساست، ھست

خامشیم اما اگر دانی کہ حق باماست، ھست

تو جو کہتا ہے کہ انسان کے سینے میں غم جانفرسا ہوتا ہے، واقعی ہوتا ہے۔ ہم خاموش ہیں، کچھ نہیں کہتے، لیکن اگر تو سمجھے کہ ہم حق بجانب ہیں تو یہ بھی بجا ہے۔

غم عاشق کی جان کو اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے اور وہ اف نہیں کرتا، اور اس کا خاموش رہنا بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔

این سخن حق بود و گاھی بر زبان ما نرفت

چون تو خود گفتی کہ خوبان را دل از خاراست، ھست

یہ بات سچ تھی اور ہماری زبان پر کبھی نہیں آئی۔ اب جو تو نے خود ہی کہہ دیا کہ معشوقوں کا دل سخت پتھر کا ہوتا ہے تو ہاں ہوتا ہے۔

دیده تا دل خون شدن کز غم روایت می کنی

گر بگویم کاین نخستین موج آن دریاست، ھست

یہ جو تو کہہ رہا ہے کہ سنا ہے محبت میں عاشق آنکھوں سے لے کر دل تک خون ہو کر رہ جاتا ہے، میں اگر اس سلسلے میں یہ کہہ دوں کہ یہ تو اس خون کے سمندر کی پہلی لہر ہوتی ہے تو درست ہوگا۔

عاشق کی آنکھوں سے خون کے آنسوؤں کا بہنا اور دل کا خون ہو کر رہ جانا تو دراصل اس عشق کے سیلاب کی ابتدا ہے۔

دیدی آخر انتقام خستگان چون می کشند

آنکہ می گفتیم ما کامروز را فرداست، ھست

تو نے دیکھ لیا کہ عاشقان دل خستہ کا انتقام کیوں کر لیا جاتا ہے۔ وہ جو ہم کہا کرتے تھے کہ آج کے بعد کل بھی ہوتا ہے تو واقعی ہوتا ہے۔ یعنی عاشقوں کا جور و ستم اٹھانا آخر رنگ لاتا ہے۔

ھم وفا ھم خواھش ما ھیچ پرسش عیب نیست

آنکہ میگفتی کہ خواھش در وفا بی جاست، ھست

ہم خود ہی وفا کرتے ہیں اور وفا کرنے کے خود ہی خواہشمند ہیں، اس لیے تیری طرف سے اگر ہماری پرسش حال نہ ہو تو عیب کی بات نہیں۔ چنانچہ تمہارا یہ کہنا کہ وفا میں کوئی خواہش کرنا بے جا ہے تو واقعی بے جا ہے۔

باری از خود گو که چونی ور زمن پرسی پرس

بخت ناسازست، آری، یار بی پرواست، هست

تو اپنی بات کر کہ تیرا چلن کیا ہے اور اگر مجھ سے میری بات پوچھنا چاہتا ہے تو وہ پوچھ لے۔ میرا بخت، ناساز گار ہے۔ اور یار بے پرواہوا ہے۔ یہ صورت حال ہے تو ہے کیا کہا جاسکتا ہے۔

خوئی یارت را تو دانی، ورنه از حسن و جمال

زلف عنبر بوست، دارد، عارض زیباست، هست

تو اپنے محبوب کی خو کو جانتا ہی ہے (اس کا کیا تذکرہ) رہا حسن و جمال کا اندازہ وہ زلف عنبریں بھی رکھتا ہے اور عارض زیبا بھی۔

صبر وانگه از تو، پندارم نه حد آدمی است

وین که می گوئی، به ظاهر گرم استغناست، هست

صبر اور وہ بھی جس کا تو اظہار کر رہا ہے، کسی انسان کی تو ہمت نہیں۔ اور یہ جو تو کہتا ہے کہ معشوق بظاہر بے نیازی کا مظاہرہ کر رہا ہے، یہ درست ہے۔

معشوق کی ظاہرا بے نیازی ہی تو ستم ڈھاتی ہے جسے برداشت کرنا بے حد مشکل ہے۔

با چنین عشقی که طوفان بلا میخوانیش

چون بنی کان شکوه دلبری بر جاست، هست

ایسے عشق کے ہوتے ہوئے جسے تو ایک طوفان بلا کہتا ہے، جب تک تجھے حسن کی دلبرانہ شان قائم نظر آتی ہے عشق کا طوفان بلا بھی قائم رہے گا۔

رهگذارت را دل و جان محبان فرش ست، هان

جلوه گاهت راز جان بازان همان غوغاست، هست

تیری رہگذر میں عاشقوں کے دل و جان، فرش راہ بنے ہوئے ہیں۔ ہاں جلوہ گاہ میں جاں بازوں کا بدستور وہی ہنگامہ اور شور و غوغا ہے، اس میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

نظم و نثر شورش انگیزی که می باید بخواه

ای که می گوئی که غالب در سخن یکتاست، هست

تو جو کہتا ہے کہ غالب فن سخن میں یکتا ہے تو واقعی ہے، اس لیے اگر تجھے ولولہ انگیز نظم و نثر کے شہ پارے درکار ہوں تو بے جھجک طلب کر لے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۱۰)

سینه بکشودیم و خلقی دید کاینجا آتش است

بعد ازین گویند آتش را که گویا آتش است

ہم نے اپنے سینے کو کھولا اور لوگوں نے دیکھا کہ اس جگہ آگ ہے۔ اب اس کے بعد

لوگ اصلی آگ کو دیکھ کر آگ نہیں کہیں گے۔ بلکہ کہیں گے یہ کوئی آگ جیسی چیز ہے۔

عاشق کے سینے میں محبت کے جو شعلے بھڑکتے ہیں اس کے مقابلے میں اصلی آگ کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی۔

انتظار جلوۂ ساقی کبابم می کند

مَی بہ ساغر آب حیوان و بہ مینا آتش است

میں جلوۂ ساقی کو دیکھنے کے انتظار میں جل اٹھتا ہوں۔ شراب مینا میں ہو تو آگ ہے اور ساغر میں ہو تو آب حیات بن جاتی ہے۔

جب تک ساقی نہیں آتا شراب صراحی میں پڑی رہتی ہے، اور اسے دیکھ کر میخواروں کے دل جلتے ہیں۔ جب وہی شراب ساقی اپنے ہاتھوں سے پیالے میں انڈیل دیتا ہے تو آب حیات بن جاتی ہے:

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا

گریہ ات عشق از تاثیر دود آہ ماست

اشک در چشم تو آب و در دل ما آتش است

عشق میں تیرا رونا ہماری آہوں کے دھوئیں کی تاثیر کے باعث ہے۔ تیری آنکھ میں آنسو پانی کی طرح ہے اور ہمارے دل میں آگ کی طرح۔

آنکھوں میں دھواں لگے تو پانی بہنے لگتا ہے۔ معشوق کے کسی پر عاشق ہو جانے اور پھر عشق میں آنسو بہانے کو، اپنی آہوں کی تاثیر پر محمول کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ آنسو، محض پانی کی طرح ہیں۔ ہمارے آنسو تو آتشپارے ہیں، جو ہمارے دل میں بھڑک رہے ہیں۔

دل میں کہنے کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ عاشق انہیں دل میں ضبط کیے ہوئے ہے اور دوسرے یہ کہ وہ دل سے ابھرتے ہیں۔

ای کہ می گوئی تجلی گاہ نازش دور نیست

صبر مشتی از خس و ذوق تماشا آتش است

لغت: ''مشت خس'' = مٹھی بھر تنکے

تو جو یہ کہہ رہا ہے کہ اس کی (یعنی محبوب کی) تجلی گاہ ناز دور نہیں، ٹھیک ہے لیکن یہ بھی تو دیکھ کہ صبر کی حیثیت ایک مشت خس کی ہے۔ جلوۂ ناز کو دیکھنے کا شوق، آگ کی طرح ہے۔ جلوۂ معشوق کو دیکھنے کی بے تابی میں صبر کیوں کر ہو سکتا ہے۔ صبر تو ایک تنکا ہے جو بے تابی شوق کی آگ میں فوراً جل جاتا ہے۔

بی تکلف در بلا بودن از بیم بلاست

قعر دریا سلسبیل و روی دریا آتش است

مصیبت میں بے دھڑک کود پڑنا، مصیبت کے خوف زدہ ہونے سے بہتر ہے۔ سمندر کی تہ سلسبیل کی طرح ہے اور سمندر کی سطح آب سراسر آگ ہے۔

سمندر کی سطح پر لہروں کا بے پناہ تلاطم، ساحل پر کھڑے اس طوفان کو دیکھنے والوں کو ہراساں کر دیتا ہے لیکن جب انسان طوفان میں کود پڑے تو یہ خوف دور ہو جاتا ہے۔ مصیبت کا تصور مصیبت سے کہیں زیادہ برا ہے۔

مرزا غالب نے یہ غزل عرفی کی ایک زمین میں کہی ہے، اور عرفی کے ایک مصرعے کو الٹ دیا ہے۔ عرفی کا مصرعہ ہے روے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش میں کیا ہے (چنانچہ اس کا ذکر

غالب نے اپنی غزل کے مقطع میں کیا ہے) اس الٹ پھیر سے غالب کے شعر میں ایک فکر کی بلاغت آگئی ہے۔

پردہ از رخ برگرفت و بی محابا سوختیم
بادہ باد است آتش او را و ما را آتش است

اس نے چہرے سے پردہ اٹھایا اور ہم بے دھڑک جل گئے: شراب اس کی آگ کے لیے ہوا کی حیثیت رکھتی ہے اور ہمارے لیے آگ کی، یعنی شراب سے اس کا شعلہ حسن یوں بھڑک اٹھتا ہے جس طرح ہوا سے آگ اور ہم اس آگ میں جلنے والے ہیں۔

هم بدین نسبت ز شوخی در دلت جا کرده ایم
فاش گوییم از تو سنگ است آنچه از ما آتش است

تیرے اور میرے درمیان ایک باہمی نسبت ہے جس سے ہم تیرے دل میں سما گئے ہیں۔ صاف صاف کیوں نہ کہہ دوں کہ جو شے تیرے لیے پتھر ہے وہ ہمارے لیے آگ ہے۔

معشوق کا دل پتھر کی طرح ہے اور عاشق کے دل میں محبت کی آگ ہے۔ پتھر میں آگ ہوتی ہے۔ یوں گویا عاشق کا معشوق کے دل میں سما جانے کا پہلو ابھر آتا ہے۔

گریہ دارم کہ تا تحت الثریٰ آب است و بس
نالہ دارم کہ تا اوج ثریا آتش است

لغت: ''تحت ثریٰ'' = زمین کی تہ

میرے رونے کا یہ عالم ہے کہ تحت ثریٰ تک پانی ہی پانی ہے۔ نالہ و فریاد ہے کہ جس سے اوج ثریا تک فضا شعلوں کی لپیٹ میں آگئی ہے۔

پاک خور امروز و زنهار از پی فردا منه
در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش است

لغت: ''پاک خوردن'' = ساری کی ساری شراب پی جانا۔

آج پوری شراب پی جا اور کل کے لیے بالکل نہ رکھ۔ شریعت رو سے شراب آج (یعنی اس دینا میں) تو پانی ہے اور کل (یعنی اس دنیا میں) آگ۔

قیامت کے دن تو رندان بادہ خوار دوزخ کی آگ میں جلیں گے یعنی یہ شراب ان کے لیے آگ بن جائے گی۔ اس دنیا میں تو وہ پانی ہی ہے۔

راز بد خویان نهفتن بر نتابد بیش ازین
پردہ دار سوز و ساز ماست هر جا آتش است

بدخو لوگوں کے راز کو اس سے زیادہ چھپانے کی تاب نہیں۔ جہاں کہیں آگ ہے وہ ہمارے ہی سوز و ساز کی پردہ دار ہے۔

بدخو لوگوں کی گرم طبیعت آگ کی طرح ہوتی ہے۔ اس کو برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ہم نے بڑے حوصلے اور خوشی سے اس کو دل میں جگہ دی ہے گویا وہ ایک راز ہے جو ہمارے دل میں چھپا ہوا ہے۔ گویا وہ آگ ہمارے دل میں سوز و ساز محبت بن گیا ہے۔

معشوقان بدخو کے غضب کو برداشت کرنا، بلند جذبہ محبت ہی کا کام ہے۔

گشتہ ام غالب طرف با مشرب عرفی کہ گفت
روی دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

غالب میں مشرب عرفی کا مقابل ہو رہا ہوں جس نے کہا، سمندر کی سطح سلسبیل ہے اور اس کی تہ آگ۔

❁❁❁

غزل نمبر(۱۱)

بخود رسیدنش از ناز بسکہ دشوار است
چو ما بدام تمنای خود گرفتار است

لغت: ''بخود رسیدن'' = اپنے آپ تک رسائی۔ خودشناسی۔

معشوق، احساس ناز میں اس قدر کھو گیا ہے کہ اس کی اپنے تک رسائی نہیں (اسے اپنا بھی ہوش نہیں) وہ ہماری طرح اپنی تمنا میں گرفتار ہے۔

عاشق اپنی تمنا میں یوں گرفتار ہے کہ اس کی کوئی تمنا پوری نہیں ہوتی۔ ادھر معشوق کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ اپنے نازِ حسن میں گرفتار ہے، اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ میں کیا ہوں اور میرا حسن کیا ستم ڈھا رہا ہے۔

تمام زحمتم از ہستی ام چہ می پرسی
ز جسم لاغر خویشم بہ پیرہن خار است

لغت: ''بہ پیرہن خار بودن'' پہنے ہوئے کپڑوں میں کوئی کانٹا ہو تو اس کے چبھنے سے تکلیف ہوتی ہے۔

میری ہستی کے بارے میں کیا پوچھتا ہے، میں اس کے ہاتھوں سرتاسر زحمت ہوں۔ میرا جسم لاغر میرے لباس میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے اور میرے دکھوں کا باعث بنا ہوا ہے۔

صلای قتل دہ و جانفشانی ما بین
برای کشتن عشاق وعدہ بسیار است

عاشقوں کو قتل ہونے کی دعوت دے اور پھر ہماری جانفشانی کا جذبہ دیکھ، یوں تو تو نے عاشقوں کو قتل کرنے کے بہت سے (جھوٹے) وعدے کیے ہیں۔

الگ الگ عشق کے دعوے داروں سے انھیں قتل کرنے کا وعدہ کر کے انھیں خوش کر لینا اور بات ہے۔ قتل کی صلاے عام دینے ہی سے سچے عاشق کی پہچان ہوتی ہے اور اس کی جانفشانی کے صحیح جذبے کا راز کھلتا ہے۔

ستم کش سر ناموس جوی، خویشتنم
کہ تاز جیب برآمد بہ بند دستار است

لغت: ''سر ناموس جو'' = جس سر میں عزت و شہرت کے حصول کا سودا سمایا ہوا ہو۔
''جیب'' = جیب و گریبان دونوں معنے دیتا ہے۔

جیب و دستار کے الفاظ، انسانی لباس کی زینت کا سامان ہوتے ہیں شاعر کہتا ہے:

میں اپنے سر کے ستم اٹھا رہا ہوں جس میں عزت و ناموس کا سودا سمایا ہوا ہے۔ جیب کے فکر سے فارغ ہوتا ہے تو دستار کے فکر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

انسان عزت و ناموس کا بھوکا ہوتا ہے اور اس کے لیے ظاہرا نمائش کے وسائل کے حصول میں پڑا رہتا ہے۔ یہی چیز انسان کی زحمتوں کا باعث بنی رہتی ہے۔

بہ شب حکایتِ قتلم زغیر می شنود
ہنوز فتنہ بہ ذوق فسانہ بیدار است

میرا معشوق رات کو رقیب سے میرے قتل ہونے کی حکایت سنتا ہے (اور مزے لیتا ہے) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس قسم کا افسانہ سننے کا شوق کم نہیں ہوا۔ یہ فتنہ اس کے سر میں جاگ رہا ہے۔

بقامت من از آوارگی است پیرهنی
که خار رهگذرش پود و جاده اش تار است

لغت: ''تار و پود'' = تانابانا

میرے تن پر آوارگی کا وہ لباس ہے کہ جس کا بانا راستے کے کانٹے ہیں اور تانا پگڈنڈی ہے۔

یہ شعر جنون عشق کی آوارگی کی تصویر ہے کہ عاشق دیوانگی کے عالم میں پھر رہا ہے اور تن بدن کا ہوش نہیں۔ جسم پر لباس ہے تو وہی راستے کی خاک اور کانٹے۔

بیا که فصل بهار است و گل به صحن چمن
کشاده روی تر از شاهدان بازار است

آ کہ فصل بہار آ گئی ہے اور صحن چمن میں پھول، حسینان بازاری سے کہیں زیادہ شگفتہ اور بے تاب چہرے لیے بیٹھے ہیں۔

''کشادہ رو'' کے الفاظ میں بڑی معنوی بلاغت اور شعری حسن ہے، اس سے مراد شگفتگی بھی ہے اور بے حجابی بھی۔ شاعر نے اپنے محبوب کو بڑے انداز میں جلوہ گر ہونے کی دعوت دی ہے۔

غم شنیدن و تلخی به خود فرو رفتن
خوشا فریب ترحم چه ساده پرکار است

میرا محبوب میری داستان غم سنتا ہے اور سن کر قدرے گم سم ہو جاتا ہے (گویا یہ ظاہر کرتا ہے کہ غمزدہ ہو گیا ہے)۔ سبحان اللہ! رحم دلی دکھانے کا کیسا انداز ہے! کتنا سادہ بھی ہے اور

ہوشیار و چالاک بھی۔

فناست هستی من در تصور کمرش
چو نغمه که هنوزش وجود در تار است

میری ہستی اس کی کمر کے تصور میں اس طرح گم ہے جس طرح وہ نغمہ جو ابھی ساز کے تار سے نہیں ابھرا (تار ہی میں گم ہے)۔

مرزا غالب نے معشوق کی کمر کی باریکی کو سو طرح سے باندھا ہے اور ہر بار نئے انداز کا اظہار کیا ہے۔

یہاں اپنی ذات کو معشوق سے بڑے خوبصورت پیرائے میں وابستہ کیا ہے۔

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست
بگرد نقطهٔ ما دور هفت پرکار است

لغت: ''ہفت پرکار'' = سات آسمان مراد ہے۔

اس کائنات کی غرض و غایت سوائے انسان کے اور کچھ نہیں ہمارے نقطے کے گرد سات پرکاریں چکر کاٹ رہی ہیں۔

مرزا غالب نے اس شعر میں عظمت انسانی کی وضاحت کی ہے اور کہا ہے کہ انسان ہی اس کائنات کا مرکز واحد ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب اسی کی تکمیل حیات کے لیے ہے۔

سعدی کہتے ہیں:-

ابرو باد و مه خورشید همه در کار اند
تا تو نانی بکف آری و بغفلت نه خوری

نگاہ خیرہ شد از پرتو رخش غالب

تو گوئی آئنۂ ما سراب دیدار است

معشوق کے چہرے کی چمک دمک سے نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا آئینہ سراب دیدار ہے۔

یعنی معشوق کے جلوۂ حسن کی تاب نہیں لائی جا سکتی۔ عاشق کو جو کچھ بظاہر نظر آتا ہے وہ دیدار معشوق نہیں بلکہ فریب دیدار ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر (۱۲)

سموم وادی امکان ز بس جگر تاب است

گداز زہرۂ خاک است ہر کجا آب است

چونکہ اس وادی امکان (دنیا) کی گرم ہوا بے حد جگر سوز ہے، اس صفحہ ارضی پر جہاں کہیں بھی پانی ہے سمجھ لیجئے (وہ پانی نہیں ہے) خاک کا پتا اس گرمی سے گداز ہو گیا ہے۔

مرنج از شب تار و بیا بہ بزم نشاط

کہ پنبہ سر مینای بادہ مہتاب است

اس سیاہ رات سے نہ ڈر اور (ہماری) بزم نشاط میں آجا۔ یہاں تو مینائے مے کے منہ پر جو سفید روئی پڑی ہے وہی چاندنی کا کام دے رہی ہے۔

خم مے پہ جو سفید روئی کا ڈھکنا ہے وہ چاند کی طرح چمک رہا ہے۔ شاعر نے اس سے

میخانے کی شگفتہ فضا کو اجاگر کیا ہے۔

بخواب آمدنش جز ستم ظریفی نیست

خدا نخواستہ باشد بہ غیر ہم خواب است

میرے معشوق کا خواب میں دکھائی دینا ستم ظریفی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ خدا نہ کرے، رقیب کے ساتھ سویا ہوا ہے۔

معشوق رات تو رقیب کے ہاں گزار رہا ہے اور عاشق کو خواب میں جلوہ دکھا کر رشک دلا رہا ہے۔

ز وضع روزن دیوار میتوان دانست

کہ چشم غمکدۂ ما براہِ سیلاب است

لغت: ''روزن'' = وہ سوراخ جو روشنی اور ہوا کے لیے دیوار میں رکھتے ہیں، روشندان۔

ہماری دیوار کے روزن کی وضع قطع بتا رہی ہے کہ یہ روزن نہیں بلکہ ہمارے غمکدۂ کی آنکھ ہے جو بڑی بے تابی سے سیلاب کی آمد کا انتظار کر رہی ہے۔ گویا عاشق کا گھر آمادہ فنا ہے اور ہر لحظہ کسی سیلاب کا منتظر ہے۔

ز نالہ کار بہ اشک اوفتادہ، دل خون باد

ز شرم بی اثری ھا فغانِ ما آب است

فریاد کرتے کرتے معاملہ آنسو بہانے پر آگیا۔ یہ دل خون ہو جائے، اس کے باعث ہماری فریاد و فغاں بے اثر رہی اور شرم سے پانی پانی ہو گئی ہے۔

نالہ بے اثر تھا، اپنی بے اثری کی ندامت سے پانی پانی ہوا۔ وہی پانی آنسوؤں کی صورت میں بہہ رہا ہے۔ عاشق کا رونا بے چارگی اور بے بسی کی علامت ہے۔

ز وهم نقش خیالی کشیدهٔ ورنه
وجود خلق چو عنقا بدهر نایاب است

تو نے اپنے وہم میں ایک نقش خیالی بنالیا ہے ورنہ اس دنیا کا وجود عنقا کی طرح نایاب ہے۔ یہ خیال بعض صوفیا اور فلسفیوں کے اس نظریے کا آئینہ دار ہے کہ اس کائنات کا وجود ذہنی ہے خارجی نہیں۔ غالب کا یہ شعر دیکھیے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

نگه ز شوخی حسنت چه طرف بربندد
چنین که طاقتِ ما را بنا ز سیماب است

لغت: ''طرف بستن'' = فائدہ برداشتن۔ ہماری نگاہیں تیری شوخی حسن سے کیسے فیضیاب ہوسکتی ہیں، جبکہ ہماری تاب وطاقت کی بنا سیماب (پارے) پر ہے۔

ادھر حسن کی شوخیاں بے تاب اور ادھر عشق کی بے تابیاں سیماب صفت ہیں۔

بعرض دعوی همطرحی تو خوبان را
نگه در آئنه همچو خسی به گرداب است

دوسرے حسین جب تیرے حسن کی ہمسری کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کی نگاہیں آئینے

میں یوں گھبرا کر بے قرار ہو جاتی ہیں، جیسے بھنور میں تنکے۔

معشوق کے حسن کے مقابلے میں آنے کے لئے جب کوئی حسینہ آئینے کے سامنے آکر آرائش کرتی اور اپنا رنگ روپ آئینے میں دیکھتی ہے تو معشوق کے حسن کا تصور ہی انھیں پریشان کر دیتا ہے۔ ان کی نگاہیں آئینے پہ نہیں جمتیں بلکہ چکرانے لگتی ہیں۔ اس شعر میں بڑا خوبصورت محاکاتی رنگ ہے۔

زمین ز نقش سم توسن تو ساغر زار
هوا ز گرد رهت، شیشهٔ می ناب است

لغت: ''توسن'' = گھوڑا۔

زمین تیرے گھوڑے کے سموں کے نشانوں سے ساغر زار بنی ہوئی ہے اور فضا تیری گردراہ سے مے ناب کی صراحی معلوم ہوتی ہے۔

قوی فتاده چو نسبت ادب مجو غالب
ندیدهٔ که سوئ قبله پشت محراب است

جب ہمارے مابین ایک مضبوط رشتہ ہے تو غالب، ادب کے تکلفات کی ضرورت۔ دیکھتا نہیں کہ محراب کی پیٹھ قبلے کی طرف ہوتی ہے۔

مسجدوں اور مسجدوں میں نماز پڑھنے والوں کا رخ کعبے کی طرف ہوتا ہے لیکن محراب کی پشت کعبہ کی طرف ہوتی ہے۔ اس کی وجہ محراب اور قبلہ کی باہمی نسبت ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۱۳)

گرد رہ خویش از نفسم باز ندانست

تنگش ز خرام آمد و پرواز ندانست

وہ میرے سانس اور اپنے راستے کی گرد میں فرق نہ کر سکا۔ اسے خرام سے عار آئی اور وہ اڑنے سے نا آشنا تھا۔

معشوق نے عاشق کی آواز کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھا اور اسے محض گرد راہ سمجھا۔ معشوق اڑنا نہیں جانتا تھا ورنہ وہ عاشق سے نظر بچا کر اڑ کر گزر جاتا۔ اور خراماں خراماں عاشق کے سامنے سے گزرنے کو اس نے عار خیال کیا۔

زان سان غم ما خورد کہ رسوائی ما را

خصم از اثر غمزۂ غماز ندانست

لغت: ''خصم'' = دشمن، رقیب۔

''غمزۂ غماز'' = معشوق کا شیوۂ ناز و انداز جس سے عاشق کی محبت افشاں ہو جاتی ہے اور وہ بدنام ہو جاتا ہے۔

رقیب پر ہمارے غم کا یہ اثر ہوا کہ اس نے ہماری رسوائی محبت کو معشوق کے ناز و ادا پر محمول نہ کیا بلکہ اس کی اور ہی تاویل کی کیونکہ اسے اس بات سے دکھ ہوتا تھا، اور شاعر نے اس کے غم کی یہی توجیہ بھی پیش کی ہے۔

فریاد کہ تا اینہمہ خون خوردنم از غم

یکرہ بہ دلش کرد گزر، راز ندانست

(افسوس) کہ میری فریاد، جو میں نے غم میں اتنا خون پی کر کی تھی، ایک بار اس کے دل میں سے گزری اور وہ راز کو نہ سمجھ سکا۔ عاشق نے عمر بھر ضبط سے کام کیا اور خون جگر پیتا رہا ایک فریاد لبوں تک آئی اور اس فریاد کا اثر معشوق پر نہ ہوا۔

نازم نگہ شرم کہ دلھا ز میان برد

زان سان کہ خود آن چشم فسون ساز نداست

مجھے محبوب کی نگاہ شرگیں پر ناز ہے کہ جس نے ہزاروں دلوں کو موہ لیا لیکن اس طرح کہ خود اس کی چشم سحر کار کو اس کا پتا نہ چلا۔

یکچند بہم ساختہ ناکام گذشتیم

من عشوہ نہ پزرفتم و او ناز ندانست

ایک دفعہ میرے اور میرے محبوب کے درمیان ملاپ کی صورت ہوئی لیکن دونوں ناکام رہے اور گزر گئے۔ میں اس کے عشوے کے اثر کو قبول نہ کر سکا اور اسے دل لبھانے کا انداز بھول گیا۔

یہ شعر عاشق اور معشوق دونوں کی بے نیازی کی تصویر ہے

از شاخ گل افشاند و ز خارا گہر انگیخت

آئینۂ ما در خور پرواز ندانست

لغت: ''پرداختن'' = کا ایک مفہوم صیقل کرنا اور چمکانا بھی ہے۔ چنانچہ اس شعر میں '' پرداز آئینہ'' سے مقصود صیقل آئینہ ہی ہے قدرت نے شاخ سے پھول برسا دیے اور سخت پتھروں سے جواہرات پیدا کیے لیکن ہمارے آئینہ دل کو جلا دینے کے قابل نہ سمجھا۔

گریم کہ برد موجۂ خون خواب گہش را

در نالہ مرا دوست ز آواز ندانست

میں نے نالہ و فریاد کی لیکن میرا دوست میری آواز کو نہ پہنچان سکا۔ اب میں اس لیے روتا ہوں کہ میرے خونیں آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلے اور اس کی خواب گاہ کو بہا لے جائے۔ یعنی آہ و فریاد تو اس پر اثر انداز نہ ہوئی، شاید آنسو ہی کارگر ہو سکیں۔

ہمدم کہ ز اقبال نوید اثرم داد

اندوہ نگاہ غلط انداز ندانست

لغت: ''نگاہ غلط انداز'' = سرسری نگاہ، بے رخی سے دیکھنا۔

میرے معشوق نے مجھ پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ اس پر میرے ہمدم نے اس خوش نصیبی پر مبارک باد دی، یہ سمجھ کر کہ میرا کچھ تو محبوب پر اثر ہوا ہے لیکن میرے دوست نے اس دکھ کا خیال نہ کیا جو محبوب کی نگاہ غلط انداز سے مجھے ہوا۔

مخمور مکافات بہ خلد و سقر آویخت

مشتاق عطا شعلہ ز گل باز ندانست

لغت: ''مکافات'' = اعمال کا بدلہ۔ ''خلد و سقر'' = جنت و دوزخ۔

جو لوگ انسانی اعمال کے صلے کے نشے میں مست تھے، وہ تو جنت و دوزخ میں الجھ

گئے اور جو اللہ تعالیٰ کے عام جود و عطا کے مشتاق ہیں وہ آگ اور پھول میں فرق نہیں کرتے۔

مشتاقانِ عطا کو حق کی طرف سے جو بھی عطا ہو وہ قابل قبول ہے۔ ان کی نظروں میں خدا سراپا رحمت ہے، انھیں اس کی رحمت پر بھروسا ہے۔ باقی لوگ اپنے اعمال کے گھمنڈ میں دوزخ و جنت کے وسوسوں میں گرفتار ہیں۔

غالب سخن از ہند برون بر کہ کس اینجا

سنگ از گہر و شعبدہ ز اعجاز ندانست

اے غالب! اپنے کلام کو ہند سے باہر لے چل کہ یہاں تو کوئی موتیوں اور سنگریزوں نیز لفظی شعبدہ کاریوں اور معجزۂ فن میں تمیز نہیں کرسکتا۔

❁❁❁

غزل نمبر (۱۴)

ہر ذرہ محو جلوۂ حسن یگانہ ایست

گوئی طلسم شش جہت آئینہ خانہ ایست

کائنات کا ہر ذرہ حسن یکتا (حسن ازلی) کے نظارے میں ہمہ تن محویت ہو کر رہ گیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا (جو شش جہت کا ایک طلسم ہے) ایک آئینہ خانہ ہے۔

آئینہ خانے میں ہزاروں آئینے دیواروں پر لگے ہوتے ہیں۔ کوئی حسینہ جب اس آئینہ خانے میں جاتی ہے تو اس کے ہزاروں جلوے ہر طرف رونما ہوتے ہیں۔ کائنات اسی آئینہ خانے

کی طرح ہے۔جس میں تمام مظاہرات عالم، حسن ازلی ہزاروں عکس کی طرح ہیں۔گویا یہ عالم "ہمہ اوست" ہی کا مظہر ہے۔

بر روے شش جہت در آئینہ باز ہے

حیرت بدهر بی سروپا می برد مرا
چون گوھر از وجود خودم آب و دانہ ایست

موتی صدف میں بند ہوتا ہے اور اپنے وجود ہی سے اپنی نشو ونما حاصل کرتا ہے۔اس کی چمک دمک سے یوں ظاہر ہوتا ہے گویا وہ ہمہ تن حیرت بن گیا اور یوں اس کی وضع قطع سے اس کی بے سروپائی ٹپکتی ہے۔

شاعر کہتا ہے حیرت مجھے اس عالم میں بے سروپالے جارہی ہے۔موتی کی طرح مجھے اپنی ذات ہی سے آب ودانہ میسر آتا ہے۔

اس دنیا میں جو ایک طلسم حیرت ہے، انسان کھویا ہوا سرگرداں رہتا ہے، اس موتی کی طرح جو صدف میں تنہا ہوتا ہے۔

ناچار با تغافل صیاد ساختم
پنداشتم کہ حلقۂ دام، آشیانہ ایست

میں نے چاروناچار صیاد کے تغافل سے موافقت کرلی اور جال کے حلقے ہی کو ایک آشیانہ سمجھ لیا۔

صیاد، پرندے کو جال میں اسیر کر کے اس کی طرف سے ارادۃً بے نیاز ہوجاتا ہے اور طائر اسیر حلقہ راہ میں یوں پڑارہ جاتا ہے جیسے آشیانہ ہو۔ایک عاشق کا معشوق کے تغافل کا عادی

ہونا بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

ای وای ھر اسیری کز یاد رفتہ باشد
در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

پا بستۂ نورد خیالی، چو وا رسی
ھر عالمی ز عالم دیگر فسانہ ایست

تو وہم کی لپیٹ میں آیا ہوا ہے۔جب تو معاملے کی تہ تک پہنچ جائے گا تو تجھے معلوم ہوگا کہ ہر نیا عالم ایک دوسرے عالم ہی کا فسانہ ہے۔

خود داریم بہ فصل بھاران عنان گسیخت
گلگون شوق را رگ گل تازیانہ ایست

لغت: "گلگون" = شیریں کے گھوڑے کا نام تھا۔عام گھوڑا "عناں گسیختن۔لگام تڑا لینا۔آزاد ہوجانا۔

فصل بہار آئی اور میری ساری متانت اور خود داری جاتی رہی۔یوں کہنا چاہیے کہ رگ گل اب شوق کے لیے تازیانے کا کام دیتی ہے۔شعر میں بہار آنے پر عاشق کے جذبات بے قابو ہوجانے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

ھر سنگ عین ثابتۂ آبگینہ
ھر برگ تاک قفل در شیرہ خانہ ایست

لغت: "ثابتہ" = جس سے کوئی بات محقق ہوجائے۔

"آبگینہ" = شیشہ، صراحی۔

ہر پتھر سرتا سر صراحی کا نمونہ بنا ہوا ہے، انگور کی بیل کا ہر پتا شیرہ خانہ کا قفل دکھائی دے رہا ہے۔

بہار کی آمد نے ایک عجیب سماں پیدا کر رکھا ہے۔ ہر سنگریزہ صراحی بن گئی ہے اور ہر انگور کے پتے سے شراب ٹپکتی نظر آتی ہے۔

ہر ذرہ در طریق وفای تو منزلی
ہر قطرہ از محیط خیالت کرانہ ایست

تیری وفا کی راہ میں ہر ذرہ نشانِ منزل بن گیا ہے اور ہر قطرہ تیرے خیال کے سمندر کا کنارہ۔

عشق و وفا کی راہ میں ہر قدم پر ہر ذرہ یوں نظر آتا ہے جیسے منزل آ پہنچی۔ محبوب کے تصور کا ہر قطرہ ساحل بن گیا ہے۔ سفرِ عشق میں انسان کا قدم نہ جانے کتنی منزلیں اور مسافتیں طے کر لیتا ہے۔

در پردۂ تو چند کشم ناز عالمی
داغم ز روز گار و فراقت بہانہ ایست

میں تیرے پردے میں کب تک ایک دنیا کے ناز اٹھاؤں گا۔ دنیا نے مجھے جلا دیا ہے لیکن میں اسے تیرے فراق کے صدموں سے تعبیر کرتا ہوں۔

عاشق نے زمانے کے دکھوں کو بھی محبت میں گوارا کر لیا ہے۔ گویا انھیں بھی بلند مقام عطا کیا ہے۔ دراصل یہ دکھ بھی محبوب کی محبت کی وجہ سے ملے ہیں۔

وحشت چو شاهدان بنظر جلوه می کند
گرد ره وهوا سر زلفی و شانه ایست

وحشت، ایک حسینہ کی طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ راستے کی گرد زلف اور ہوا اس کی شانہ کشی کر رہی ہے۔

وحشت کے عالم میں عاشق سرگرداں ہے اور بیاباں نوردی کر رہا ہے لیکن اس عالم وحشت میں بھی ایک کیفیت ہے کہ اب اسے گردِ راہ زلفِ محبوب معلوم ہوتی ہے جسے ہوا شانے کی طرح سنوار رہی ہے۔ شاعر نے اس وحشت کو ایک ایسی حسینہ قرار دیا ہے کہ جس نے ساری فضا کو حسین و جمیل بنا دیا ہے۔

غالب دگر ز منشاء آوارگی مپرس
گفتم کہ جبهہ راهوس آستانہ ایست

لغت: "جبہہ" = جبیں، پیشانی۔

منشا" = خواہش

غالب اب آوارگی کی خواہش کی بات نہ کر۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ میری جبیں کو اب کسی ایک آستانے کی تمنا ہے، جہاں آرام سے سجدہ کیے پڑا رہوں۔

❁❁❁

غزل نمبر(۱۵)

ھرچہ فلک نخواست ہیچکس از فلک نخواست
ظرف فقیہ می نہ جست بادۂ ما گزک نخواست

لغت:''گزک'' = کوئی لذیذ چیز جو شراب پینے والے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کھاتے ہیں۔

جو کچھ آسمان نے نہیں چاہا وہ شے کسی شخص نے آسمان سے طلب نہیں کی۔فقیہ نے اپنی تنگ ظرفی سے شراب نہ مانگی اور ہماری شراب (شراب نوشی) کو گزک کی ضرورت نہ پڑی۔

قدرت انسان کو وہی کچھ دیتی ہے جس کا اس میں ظرف ہو۔دین پرست فقیہ میں شراب نوشی کا ظرف نہ تھا، وہ اس سے محروم رہا اور ہم میں اس کا ظرف وافر تھا، اتنی ملی کہ گزک کے چکھنے کی نوبت نہ آئی۔

غرقہ بموجہ تاب خورد، تشنہ ز دجلہ آب خورد
زحمت ہیچ یک نداد، راحت ہیچ یک نخواست

غرق آب ہونے والا لہروں کے تھپیڑے کھاتا رہا۔پیاسے نے دریا (دجلہ) سے پانی پیا اور خوب سیراب ہوا۔غرق ہونے والے نے کسی اور کو زحمت نہ دی اور پانی سے سیراب ہونے والے نے کسی اور کی راحت کا خیال نہ رکھا۔

دنیا میں دکھ سہنے والا بھی تنہا دکھ سہتا ہے اور سکھ اٹھانے والا بھی تنہا سکھ اٹھاتا ہے۔

جس عالم میں بھی ہو کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ہوتا۔

جاہ ز علم بی خبر، علم ز جاہ بی نیاز
ھم محک تو زر نہ دید، ھم زر من محک نخواست

لغت:''محک'' = کسوٹی۔جاہ وحشمت (والے) علم سے بےگانہ ہوتے ہیں اور علم، جاہ وحشمت سے بے نیاز تیری کسوٹی نے سونا نہ دیکھا، میرے سونے کو کسوٹی کی ضرورت نہ پڑی ۔امارت پرست انسان کو علم کی دولت نصیب نہیں اور صاحب علم کو زر ومال کی پروا نہیں۔

شحنۂ دھر برملا ھرچہ گرفت، پس نداد
کاتب بخت درخفا ھرچہ نوشت حک نخواست

لغت:''شحنہ'' = کوتوال۔شحنہ دہر۔ زمانے کی دست برد ''کاتب بخت'' = کاتب تقدیر۔

''برملا اور درخفا'' اعلانیہ اور پوشیدہ۔دونوں لفظوں میں معنوی تضاد ہے اور شعر کے باقی الفاظ سے مل کر جو بڑے برجستہ اور مترنم واقع ہوئے ہیں۔شعر میں موسیقیت پیدا کر رہے ہیں۔

زمانے کی دست برد انسان سے جو کچھ چھین لیتی ہے، واپس نہیں دیتی اور کاتب تقدیر جو کچھ لکھ دیتا ہے اُس میں سے کسی لفظ کو نہیں کاٹتا۔

خون جگر بجائی می مستی ما قدح نداشت
نالۂ دل نوای نَی، رامش ما چنگ نخواست

لغت: ''غچک'' = سارنگی، اسے غوک بھی لکھتے ہیں۔ ''رامش'' = نغمہ۔

ہماری قسمت میں شراب کی جگہ خون جگر تھا۔ ہمارے نشے کو جام و ساغر کی حاجت نہیں تھی۔ (ہماری بزم میں) ہمارے نالۂ دل ہی نے آوازِ نے کا کام دیا۔ ہمارے نغمے کو سارنگی درکار نہ تھی۔ ہم خون جگر پیتے رہے اور اسی میں سرشار رہے۔ فریادیں کیں اور وہی ہمارا نغمہ تھیں۔

زاهد و ورزش سجود، آه ز دعوی وجود

تا نه زد اهرمن رهش، بدرقهٔ ملک نخواست

لغت: ''بدرقہ'' = رہنما، رہبر۔ دراصل یہ لفظ ''بدرہ'' کا معرب ہے۔ قدیم فارسی میں ''بد'' کا مفہوم بزرگ یا سردار کا ہے جیسے ''سپہ بد'' سردارِ لشکر۔ بدرہ کا مطلب ایسا شخص جو رہنمائی کر سکے۔

(اللہ اللہ) زاہد کی یہ پیہم سجدہ ریزیاں (جیسے وہ سجدوں کی ورزش کر رہا ہو) افسوس جب تک اس میں ان سجدوں سے کبر و ناز پیدا نہ ہوا اور غرور نفس کے ہاتھوں شیطان نے اسے گمراہ نہ کیا، زاہد نے فرشتے کو اپنا رہنما نہ بنانا چاہا۔

فرشتوں کا وجود کبر و غرور سے پاک ہوتا ہے۔ ان میں زہد۔ بے ریا ہوتا ہے۔ وہ زاہد کی طرح، غرور نفس میں مبتلا نہیں ہوتے۔

بحث و جدل بجائی مان، میکده جوی کاندران

کس نفس از جمل نه زد، کس سخن از فدک نخواست

لغت: ''بجائے ماں'' = بمفہوم بجائے دار یعنی یونہیں رہنے دے۔ مولانا حالی اس شعر کی شرح یوں کرتے ہیں جو بہت خوب اور واضح ہے۔

''بحث و جدال کو یونہی رہنے دے اور مے خانے میں جا کہ وہاں نہ جمل کا جھگڑا نہ فدک کا قصہ ہے جمل سے مراد جنگ جمل جس میں حضرت عائشہؓ جمل یعنی اونٹ پر سوار ہو کر حضرت امیر (علیؓ) سے لڑنے گئی تھیں۔ فدک ایک کھجوروں کا باغ تھا جس پر حضرت سیدہ النساء فاطمہ زہراؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت میں وراثت کا دعویٰ کیا تھا۔

یہ دونوں جھگڑے من جملہ ان بے شمار نزاعوں کے ہیں جن پر سنی شیعہ حضرات میں ہمیشہ نزاع رہتی ہے۔

گشته ره انتظار پور، دیدهٔ پیر ره سفید

در ره شوق، همرهی دیده ز مردمک نخواست

اس شعر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے فرزند یوسفؑ کی جدائی میں بینائی کھو دینے کی طرف اشارہ ہے۔ اسے علم بدیع میں صنعت تلمیح کہتے ہیں۔

بیٹے کے انتظار میں پیر رہ (حضرت یعقوبؑ) کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ شوق محبت کی راہ میں انھوں نے آنکھوں کی پتلی کی ہمراہی بھی طلب نہ کی، یعنی حضرت یعقوبؑ کی محبت اور شوق کا یہ عالم تھا کہ بیٹے کے انتظار میں نابینا ہو گئے۔ اس شوق کی محویت میں انھوں نے آنکھوں کی بینائی کو بھی اپنا ہمراہ نہ بنانا چاہا۔

حسن چه کام دل دهد چون طلب از حریف نیست

خست نگاه گر جگر خسته ز لب نمک نخواست

لغت: ''حریف'' = مقابل کو کہتے ہیں۔ اس شعر میں حسن کا مقابل عشق ہے۔ جب مقابل یعنی عشق کی طرف سے طلب کے جذبے کا اظہار نہ ہو تو حسن اس کی دلی خواہش کو کیوں پورا

کر سکتا ہے۔ عاشق خستہ جگر نے منہ سے نمک نہ مانگا، نگاہ عاشق خستہ ہو کر رہ گئی۔ عاشق کا جگر زخمی ہو چکا ہے۔ اب اس کی یہ آرزو ہے کہ حسن زخم جگر پر نمک ریزی کرے لیکن یہ بات وہ منہ سے نہیں کہتا، محض خاموش نگاہوں سے کہہ رہا ہے۔ محبوب تغافل سے کام لے رہا ہے۔ اور عاشق کی اس آرزو کو بے طلبی پر محمول کرتا ہے چنانچہ آرزو پوری نہیں ہوتی۔ اور عاشق کی نگاہ خاموش التجائیں کرتے کرتے تھک جاتی ہے۔

خرقہ خوش است در برم پردہ چنیں حسن خوش است
عشق بہ خارِ خارِ غم پیرہنم تنک نخواست

میرے تن پر گدڑی ہی اچھی لگتی ہے۔ یہ ایک موٹا اور سخت لباس ہے جو خوب پردہ پوشی کر لیتا ہے۔ اسی لیے عشق کے اس غم کی تڑپ میں میرے جسم پر ہلکا لباس گوارا نہیں۔

گدڑی گویا اس طرح کا پردہ ہے جس سے مرض میں اضافہ ہونے کا خدشہ نہیں اور اس نے غم عشق کو بھی چھپا رکھا ہے۔

رند هزار شیوہ را طاعتِ حق گران نبود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

لغت: ''رند ہزار شیوہ'' = رند جس کی زندگی کے کئی ایک رنگ اور تیور ہوں۔ وسیع مشرب۔

ایک وسیع مشرب رند کے لیے خدا کی بندگی کوئی مشکل چیز نہ تھی، لیکن جو جبیں میرے آگے سجدہ کرتی ہے وہی کسی اور کے آگے بھی جھکے۔

شاعر نے ایسی جبیں کو جو کئی جگہ جھکے مشترک ناصیہ کہا ہے جو بہت خوبصورت ہے۔

سہل شمرد و سرسری، تا تو ز عجز نشمری
غالب اگر بداوری داد خود از فلک نخواست

لغت: ''شعر میں ''تا'' کا حرف، حرف تنبیہ ہے کہ دیکھنا، ہشیار۔ غالب نے اگر اپنا انصاف فلک سے طلب نہ کیا کہیں اسے اس کے عجز پر محمول نہ کر لینا۔ اس نے اس بات کو گھٹیا تصور کیا اور اپنی کسر شان سمجھا۔

❁❁❁

غزل نمبر (۱۶)

ما لاغریم گر کمر یار نازک است
فرقی است درمیانہ کہ بسیار نازک است

اگر کمر یار نازک ہے تو ہم لاغر ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ اس کی کمر بہت نازک ہے۔

دارم دلی ز آبلہ نازک نهاد تر
آهستہ پانهم کہ سر خار نازک است

میرا دل میرے پاؤں کے چھالے سے بھی زیادہ نازک ہے۔ میں سنبھل سنبھل کے قدم رکھتا ہوں کہ کانٹے کی نوک بڑی نازک ہے۔

چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ چھالے بہت نازک ہوتے ہیں۔ ذرا کانٹا

چھو جائے تو پھٹ جاتے ہیں، لیکن عاشق کا دل ان سے بھی نازک ہے۔ وہ رک رک کر قدم رکھتا ہے اس لیے نہیں کہ ڈرتا ہے کہیں کانٹا چبھنے سے چھالے پھٹ نہ جائیں بلکہ اسے نوک خار کا خیال ہے کہ اسے پاؤں سے ٹھیس نہ لگ جائے کیونکہ وہ بھی بہت نازک ہے۔

از جنبش نسیم فرو ریزدی زهم
ما را چو برگ گل در و دیوار نازک است

پھول کی پتی کی طرح ہمارے (گھر کے) در و دیوار نازک ہیں۔ ہلکی سی ہوا کی جنبش سے درہم برہم ہو کر گر پڑتے ہیں۔

با ناله ام زسنگ دلی هائی خود مناز
غافل قماش طاقت کهسار نازک است

لغت "قماش" = (لباس) ساز و سامان اور بے کار شے۔ اس اعتبار سے یہ لفظ یہاں بہت موزوں ہے۔ میری نالہ وزاری کو سن کر یہ سمجھ کہ یہ تیری سنگدلیوں کا اثر ہے اور اس پر فخر نہ کر۔ نادان! اس کہسار کی طاقت ہی حقیر سی ہے، یعنی معشوق کی سنگدلیوں کے پتھراؤ سے دل پر کیا چوٹ لگے گی اور کوئی کیا فریاد کرے گا، وہ پتھر تو بڑے نازک ہیں۔

زحمت کشید وآن مژه برگشت همچنان
ماسخت جان و لذت آزار نازک است

اُن پلکوں نے یونہی ابھر کر دیکھا اور پھر پلٹ گئیں۔ بیکار زحمت اٹھائی۔ ہم سخت جان واقع ہوئے ہیں اور معشوق کی دلآزاری کی لذت بہت نازک ہے۔

رسوائی مباد خود آرائی ترا
گل پر مزن که گوشهٔ دستار نازک است

زینت و آرائش کے لیے لوگ دستار پہ پھول لگا لیتے تھے۔ معشوق سے خطاب کر کے کہتا ہے:

کہیں تیری آرائش کا شوق ہی رسوا نہ ہو جائے۔ اتنے پھول گوشہ دستار پر نہ لگا کیونکہ وہ بہت نازک ہے۔

یعنی نمائش حد سے بڑھی تو رسوا ہو جاؤ گے اور برداشت نہ کر سکو گے۔

ترسم تپش زبند برون افگند مرا
تاب کمند کاکل خمار نازک است

معشوق کی زلف خمدار کی کمند کے پیچ و تاب بڑے نازک ہیں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے دل کی حرارت سے اس کمند کے بند پگھل نہ جائیں اور مجھے باہر نہ پھینک دیں۔

حسن معشوق کی گرفت بڑی نازک ہوتی ہے۔ عاشق کی بے تابیوں سے گھبرا کر کسی وقت بھی گرفت ڈھیلی پڑ سکتی ہے۔

از جلوه تا گداختن و رُو نساختن
آئینهٔ را به بین که چه مقدار نازک است

لغت: "روساختن" = رو کے ایک معنی شرم کے ہیں۔ روساختن، شرم کرنا۔

معشوق کے جلوے سے جلتا بھی نہیں اور پھر اسے اس بات سے حجاب بھی نہیں آتا۔ آئینے کو دیکھ کتنا نازک واقع ہوا ہے۔

می رنجد از تحمل ما بر جفائی خویش

ھا، شکوهٔ کہ خاطر دلدار نازک است

''ہم معشوق کے جور و جفا کو برداشت کر لیتے ہیں اور وہ ہمارے اس تحمل پر برہم ہوتا ہے۔اس کی جفا کا شکوہ کرو کہ اس کی طبیعت بڑی نازک واقع ہوئی ہے۔

عاشق ضبط سے کام لیتا ہے اور جفائے معشوق پر تحمل کرتا ہے مگر وہ اس پر بھی رنجیدہ ہوتا ہے لہذا فریاد لازم آتی ہے۔

از نا توانی جگر و معدہ باک نیست

غالب دل و دماغ تو بسیار نازک است

غالب اگر تیرا جگر اور معدہ کمزور ہے تو کوئی ڈر نہیں، تیرا دل و دماغ بہت نازک ہے (یہ نازکی بہت خوب ہے)

❀❀❀

غزل نمبر(۱۷)

اِمشب آتشینِ روی گرمِ ژندخوانی ھاست

کز لبش نوا ھر دم در شرر فشانی ھاست

لغت: ''ژند'' = آتش پرستوں کے پیغمبر زرتشت کی کتاب۔ ژند کی کتاب پر ذیلی حاشیے لکھے گئے، وہ کتاب پاژند کہلائی۔

''ژند'' لغوی طور پر ''پارہ'' ہے۔ چونکہ ژند پارہ پارہ، سورہ سورہ کی صورت میں تھی

اس لیے یہ نام پایا۔ پھر ژند کا مفہوم پارہ بزرگ و عظیم ہوا۔ چنانچہ ژند پیل یا ژندہ پیل بڑے ہاتھی کو کہتے ہیں۔

آج رات ایک ایسا آتش چہرہ معشوق ژندخوانی کر رہا ہے کہ اس کے لبوں سے جو نوا ابھرتی ہے ہر لحظہ شرر فشانی کر رہی ہے۔

تا در آب افتادہ، عکس قدِ دلجوئش

چشمہ ھمچو آئینہ فارغ از روانی ھاست

جب سے اس کے دلکش قد کا عکس پانی میں پڑا ہے، آئینے کی طرح چشمہ بھی اپنی روانیوں سے فارغ ہو گیا ہے۔ پانی میں اگر روانی نہ ہو تو وہ آئینے کی طرح ہوتا ہے۔ عکس محبوب سے صرف آئینہ ہی حیرت زدہ نہیں ہوا، بہتے ہوئے چشمے کا آب رواں تھم گیا ہے۔ شاعر نے ''دلکش'' کے لیے ''دل جو'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ''جو'' ندی کو بھی کہتے ہیں۔ جو سے رعایت لفظی پیدا ہو گئی ہے۔

در کشا کش ضعفم نگسلد روان از تن

اینکہ من نمی میرم، ھم ز ناتوانی ھاست

ضعف کی کشمکش میں الجھ کر میری جان تن سے نہیں نکلتی یہ جو میں نہیں مرتا، یہ بھی ناتوانیوں کے باعث ہے۔

از خمیدن پشتم، روی در قفا باشد

تا چھا درین پیری حسرت جوانی ھاست

میری پیٹھ کے جھکنے سے میری نظر پیچھے کو پڑتی ہے۔ اس بڑھاپے کے عالم میں جوانیوں کی کتنی حسرت ابھی ہے۔

بوڑھے آدمی کی پیٹھ جھکنے سے اس کا سر بھی جھک جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیچھے کو مڑکر جوانی کو دیکھ رہا ہے۔

کشتۂ دل خویشم کز ستمگران یکسر

دیده دلفریبی ها، گفت مهربانی هاست

میں اپنے دل کا مارا ہوا ہوں کہ اس نے ستمگر حسینوں کے ہاتھوں سر بسر دل فریبیاں دیکھی ہیں اور یہی کہتا رہا ہے کہ یہ مہربانیاں ہیں۔

سوی من نگه دارد چین فگنده در ابرو

با گران رکابی ها خوش سبک عنانی هاست

لغت: ''گراں رکابی'' = رکاب کا بھاری ہونا یعنی سست رفتاری۔ ''سبک عنانی'' = لگام کا ڈھیلا ہونا یعنی تیز رفتاری، گراں رکابی کی ضد۔

محبوب عاشق کی طرف دیکھتا بھی ہے اور ابروؤں پر بل ڈالے ہوئے ہے۔ چونکہ ابرو کی صورت رکاب کی سی ہے اس لیے اُن پر شکن پڑنے سے وہ گراں ہو گئے ہیں۔

یعنی معشوق ایک طرف تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری توجہ اور تیزی سے عاشق کی طرف مائل ہے لیکن ابرو کے شکن اس توجہ میں حائل ہو رہے ہیں۔

دائم از سر خاکم رخ نهفته بگذشتن

هان وهان! خدا دشمن! این چه بدگمانی هاست

میری قبر پر سے ہمیشہ منہ چھپا کے گزر جانا، ہاں اے خدا دشمن تو ہی بتادے کہ یہ بدگمانیوں کا کیا انداز ہے۔

شوخی اش در آئینه محو آن دهن دارد

چشم سحر پردازش، باب نکته دانی هاست

اس کی شوخی آئینے میں اسے دہن کے دیکھنے میں مصروف رکھتی ہے۔ اس کی چشم سحر طراز آنکھ کیا نکتہ دانیوں کا ایک باب ہے۔

با عدو عتابستی و زمنش حجاب استی

وه چه دلربائی ها، هی چه جان ستانی هاست

رقیب کے ساتھ عتاب کا رویہ ہے اور مجھ سے اسے حجاب ہے۔ دلربائی ہے تو عجیب اور جانستانی ہے تو عجیب۔ رقیب کے ساتھ غصے سے پیش آنا عاشق کے لیے دل فریب ہے اور عاشق سے حجاب کرنا ادائے جانستاں ہے۔ دونوں تیور عجیب ہیں۔

با چنین تهی دستی بهر چه بود هستی

کار ما ز سرمستی آستین فشانی هاست

ایسی تہی دستی کے عالم میں زندگی کا کیا فائدہ۔ ہماری زندگی کا مشغلہ تو اب یہی ہے کہ ہم اس سے دامن جھاڑتے رہیں۔

ای که اندرین وادی مژده از هما دادی

بر سرم ز آزادی سایه را گرانی هاست

اے خدا تو نے اس دینا (وادی) میں ہما (کے سایے) کا مژدہ سنایا۔ میں ان باتوں سے آزاد ہوں۔ میری اس آزادی سے میرے سر پر سایہ پڑنے سے گھبراتا ہے۔

ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیرون
باظهوری وصائب محو هم زبانی هاست

فکر سخن کی لذت غالب کو انجمن سے باہر لے گئی۔ وہ ظہوری اور صائب کی ہم زبانی میں محو ہے۔

غالب کو اپنے عہد کے سخنوروں سے ظہوری وصائب جیسے زیادہ مرغوب تھے جن کا وہ اپنے آپ کو پیرو کہتا تھا اور اسی بات پر نازاں تھا۔

❀❀❀

غزل نمبر(۱۸)

جیب مرا مدوز کہ بودش نہ ماندہ است
تارش زهم گسته وہ پودش نہ ماندہ است

میرا گریبان نہ سی کہ اس کا اب کوئی وجود باقی نہیں رہا۔ اس کا تانا بکھر چکا ہے اور بانا باقی نہیں رہا۔

سرگرمی خیال تو از نالہ باز داشت
دل پارہ آتش ایست کہ دودش نہ ماندہ است

تیرے تصور کی گرمی (محویت) نے مجھے فریاد کرنے سے روکے رکھا۔ دل وہ آگ کا ٹکڑا ہے کہ جس سے کوئی دھواں نہیں اٹھتا۔ فریاد کے اٹھنے کو دھواں اٹھنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

داد از تظلمی کہ بگوشت نمی رسد
آہ از توقعی کہ وجودش نہ ماندہ است

افسوس اس دکھ بھری فریاد پر جو تیرے کان تک نہیں پہنچتی۔ افسوس اس توقع پر کہ جس کا کوئی وجود باقی نہیں رہا۔

چون نقطہ اختر سیہ از سیر باز ماند
گوئی دگر هبوط وصعودش نہ ماندہ است

لغت: ''سیر'' = گردش، حرکت۔ ''هبوط وصعود'' = غروب وطلوع۔ گرنا اور ابھرنا۔

ہماری قسمت کا سیاہ ستارہ نقطے کی طرح ایک جگہ ٹھہر چکا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی غروب وطلوع باقی نہیں رہا۔

مکتوب ما بہ تار نگاہ تو عقدہ ایست
کز ہیچ رو امید کشودش نہ ماندہ است

ہمارا خط تیری نگاہ کے تار میں ایسی گانٹھ کی طرح ہے۔ جس کے کھلنے کی کسی صورت بھی کوئی امید نہیں۔

دل را بہ وعدۂ ستمی می توان فریفت
نازی کہ بر وفائی تو بودش نہ ماندہ است

اب تو دل کو تیرے وعدۂ ستم ہی سے بہلایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اسے جو تیری وفا پر ناز ہوتا تھا وہ باقی نہیں رہا۔

اُفتادگی نماز دل ناتوان ماست
درد سر قیام و تعودش نہ ماندہ است

انتہائی خستگی اور بے چارگی میں گرے ہوئے ہونا ہی ہمارے دل ناتواں کی نماز ہے۔
اب قیام وقعود کی کوئی دردسری باقی نہیں رہی۔

دل جلوہ می دھدھنر خود در انجمن
رحمی مگر بجان حسودش نہ ماندہ است

ہمارا دل محفل میں علانیہ (اپنے جذبۂ وفا کے) جوہر دکھاتا ہے۔ اور اسے حسد کرنے والے کی جان پر کوئی ترس نہیں آتا۔
عاشق اب اپنی وفا پر نازاں ہے اور کھلم کھلا اس کا اعلان بھی کرتا ہے۔ اس بات کا مطلق خیال نہیں کرتا کہ حاسد کو اس سے دکھ پہنچے گا۔

دل در غم تو مایہ بہ رھزن سپردہ است
کار از زیان گذشتہ و سودش نہ ماندہ است

ہمارے دل نے غم میں اپنی ساری بضاعت رہزن کو سونپ دی ہے۔ اب معاملہ فکر زیاں سے گزر چکا ہے اور نفع کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

غالب زبان بریدہ و آگندہ گوش نیست
اما دماغ گفت و شنودش نہ ماندہ است

لغت: ''زباں بریدہ'' = جس کی زبان کٹ گئی ہو۔
'' آگندہ گوش'' = جس کے کان بند ہو گئے ہوں۔ یہ دونوں ترکیبیں فاعلی معنے دیتی ہیں۔ ''دماغ'' = ذوق، کیفیت۔
غالب کی کوئی زبان تو نہیں کٹ گئی، اس کے کان تو بند نہیں ہوئے۔ ہاں اب کچھ کہنے سننے کا ذوق ہی جاتا رہا ہے۔ غالب کا اردو شعر دیکھئے:

ہے کچھ ایسی ہی بات کہ چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

❀❀❀

غزل نمبر (۱۹)

بلبل دلت بہ نالۂ خونین بہ بند نیست
آسودہ زی کی یار تو مشکل پسند نیست

اے بلبل! تیرا دل (ہماری طرح) خونیں فریادیں کرنے کا پابند نہیں۔ تجھے آسودگی سے رہنا چاہئے (اور اس بات کا شکر کرنا چاہئے) کہ تیرا محبوب (گل) مشکل پسند واقع نہیں ہوا (کہ وہ تجھ سے ہر لحظہ کوئی دشوار اور کٹھن کام کے سرانجام دینے کی توقع رکھے۔ تو کس لیے فریاد کر

رہی ہے۔ہم تو مجبور ہیں)۔

اندازہ گیر ذوق غم در مذاق من

تلخاب گریہ را نمک زھر خند نیست

آنسوؤں کا ذائقہ تلخ ہوتا ہے اس لیے شاعر نے تلخاب گریہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔آنسوؤں میں کچھ نمکینی بھی ہوتی ہے۔اس کے لیے نمک کا لفظ لایا ہے جو موزوں ہے۔"زہر خند" اوپری ہنسی کو کہتے ہیں،یعنی دل غمزدہ ہو اور لب مسکرا رہے ہوں،ایسی حالت کو زہر خند کہا جاتا ہے۔

میرے مذاق سے میرے ذوق غم کا اندازہ کرلے۔میرے تلخ آنسوؤں میں زہرخند کا نمک شامل نہیں۔

عاشق کا دل غم سے لبریز ہے اور اس کے چہرے پر جھوٹی ہنسی بھی نہیں آتی۔اور یہ حالت غم سے بھی آسودگی اور لذت اندوزی کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

عھد وفا ز سوئی تو نا استوار بود

بشکستی و ترا بہ شکستن گزند نیست

تیری طرف سے جو عہد وفا باندھا گیا تھا وہ کمزور سا تھا۔تو نے اس عہد کو توڑ دیا اور اس سے تجھے کیا تکلف ہوئی (دکھ تو ہمیں ہوا)۔

دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ عہد ہی بودا باندھا گیا تھا۔اس کے توڑنے میں کونسی تکلیف در کار تھی۔غالب کا یہ شعر دیکھیے۔

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا

کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

از دوست میل قرب بہ کشتن غنیمت است

گر تیغ در کمان بہ نشاط کمند نیست

تیغ قاتل کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔تیر کمان میں رکھ کر چلایا جاتا ہے۔کمند دور سے پھینک کر شکار کو اسیر کیا جاتا ہے۔بہرحال کسی کو مارنے کے لیے تیغ و تیر ضروری ہوتے ہیں،کمند نہیں۔اور یہ دونوں کمند سے بہتر ہوتے ہیں۔تیر و کمند کہ ان دونوں کا مزہ وہ نہیں ہوتا جو کمند سے کسی کو اسیر کرنے میں میسر آتا ہے۔پھر بھی جب معشوق،عاشق کے قتل کے لیے،عاشق کے قریب آنے کی خواہش ظاہر کرے تو اس کی خواہش قرب بڑی غنیمت بات ہے ورنہ وہ تو عاشق کو اسیر کمند عشق کرکے بے نیازی سے دور دور پھرتا ہے۔

بر یاد تو کدام پری خوان بخور سوخت

کو شرمسار دعوت نا سود مند نیست

بعض لوگ سحر سے پریوں کو بلاتے ہیں اور اس عمل میں جو کچھ کیا جاتا ہے اس میں ایک شے بخور (خوشبو) کا جلانا بھی ہے۔پری خوانی کی جو کوشش ناکام رہے گی وہ "دعوت ناسودمند" ہوگی۔شاعر کہتا ہے کہ کس پری خواں نے تیری یاد میں بخور کو جلایا کہ اسے پری کو دعوت دینے کی بے کار کوشش پر شرمساری نہیں

معشوق ایک پری ہے۔جو کوئی اسے آنے کی یا بلانے کی دعوت دیتا ہے،وہ غلطی پر ہے۔اس کی یہ دعوت،دعوت ناسودمند ہے کیونکہ معشوق یوں نہیں آتا۔مزہ یہ ہے کہ ایسے شخص کو اپنی اس دعوت ناسودمند پہ شرمساری نہیں ہوتی۔

ہم نے اس شعر میں "کو" کا لفظ رکھا ہے۔اس کی دوسری صورت "گو" ہے جسے بعض تازہ مطبوعہ نسخوں میں ترجیح دی گئی ہے۔ایسی صورت میں شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ کس پری خواں

نے تیری یاد میں نخور جلایا؟ کہہ دو کے ایسا شخص اپنی دعوت ناسودمند پہ شرمسار نہیں ہے۔

آن لابه های مهر فزا را محل نماند

بر خوان خود ان یکاد که مارا سپند نیست

لغت: ''سپند'' = وہ کالا دانہ جو نظر بد کو دفع کرنے کے لیے جلاتے ہیں (پنجابی، ہرمل)۔ سپند جلانا ایک طرح کی خوشامد (لابہ) ہوتی ہے جس میں مہر ومحبت کا جذبہ کارگر ہوتا ہے کہ مضرات دور ہو جائیں۔

''ان یکاد'' میں سورۂ قلم کی اس آیۂ پاک کی طرف اشارہ ہے جو نظر بد دور کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہے۔

ان یکاد الذین کفرو..........

اب مہر ومحبت پیدا کرنے والی خوشامدوں کا موقع (گنجائش) نہیں۔ اب تو ان یکاد پڑھ کہ ہمارے پاس (آگ کی روک تھام کے لیے) کوئی سپند نہیں (اب ہم آگ میں کود پڑنے اور جل جانے پر آمادہ ہیں)۔

بی خود بذیر سایهٔ طوبیٰ غنوده ایم

شبگیر رهروان تمنا بلند نیست

لغت: ''شبگیر'' = صبح سے پہلے وقت کو کہتے ہیں۔ یہ ایوار کی ضد ہے جو عصر یا دیگر کے لیے مستعمل ہے۔ شبگیر صبح کے سفر کے معنوں میں آتا ہے اور اس شور اور نعرے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو سفر کے وقت بلند ہوتا ہے۔ یہی چیز ایوار پر بھی عائد ہوتی ہے۔ بہر حال شبگیر کے شور کی بڑی خوبی اس کا بلند ہونا ہے۔ شاعر شعر میں اسی رعایت سے بلند کا لفظ لایا ہے۔

(ہم رہروان تمنا ہیں) رہروان تمنا کا نعرۂ سفر بلند نہیں ہوتا (خاموش ہوتا ہے) ہم تو سایۂ طوبیٰ

تلے بے خود پڑے اُونگھ رہے ہیں۔

عاشق دل ہی دل میں محبوب سے تمنائیں وابستہ کیے رہتے ہیں گویا رہروان تمنا کا سفر شوق خاموشی سے ہوتا ہے اور اس سفر میں نہ جانے وہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ایک عاشق ان تمناؤں میں کھویا ہوا ایسا ہے جیسے آسمان پر سایۂ طوبیٰ تلے آرام سے اُونگھ رہا ہو۔

هنگامه دلکش است بدبده چیست

اندیشه بی غش است پند نیست

دنیا کے ہنگامے اتنے دل کش ہیں پھر مجھے جنت کی خوشخبری کیوں دی جا رہی ہے۔

میرے خیالات بڑے صاف اور پاکیزہ ہیں، میں پند ونصیحت کا نیاز مند نہیں ہوں (یعنی نصیحت درکار نہیں)۔

می نوش و تکیه بر کرم کردگار کن

خط پیاله را رقم چون و چند نیست

لغت: '' خط پیالہ'' اسے خط ایاغ بھی کہتے ہیں۔ وہ خط جو جامِ میں کھینچے ہوتے ہیں اور ان کا مقصد شراب کی مقدار کو جانچنا ہوتا ہے تاکہ ہر میخوار کو اس کے ظرف کے مطابق پلائی جا سکے۔

شراب پی اور اللہ تعالیٰ کی بخشش پر بھروسا کر۔ خط پیالہ کوئی ایسی تحریر نہیں کہ جس کا مفہوم کیوں اور کتنی ہے۔

یعنی اگر خاص مقدار تک پی جائے تو قدرت معاف کر دے گی۔ تو جتنی چاہے پی لے، خدا بخشنے والا ہے۔

غالب من و خدا کہ سرانجام برشگال

غیر از شراب و انبہ و برفاب و قند نیست

غالب، خدا کا نام لے کر سچ کہتا ہوں کہ برسات کی آمد کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ شراب ہو، آم ہوں برف کا ٹھنڈا پانی ہو اور قند ہو۔

❁❁❁

غزل نمبر (۲۰)

منع ما از بادہ عرض احتسابی بیش نیست

محتسب! افشردۂ انگور آبی بیش نیست

لغت: ''احتساب'' = دار و گیر، حساب گیری۔

''محتسب'' = احتساب کرنے والا، کوتوال۔ ''افشردہ'' = رس۔

ہمیں شراب سے روکنا، سوائے اس کے کہ احتساب کا مظاہرہ کیا جائے اور کچھ نہیں۔

اے محتسب! آخر شراب (انگور کا رس) پانی سے زیادہ کوئی شے نہیں (یعنی پانی ہی تو ہے)۔

رنج و راحت برطرف، شاہد پرستاریم ما

دوزخ از سرگرمی نازش عتابی بیش نیست

رنج و راحت کا کیا ذکر، انھیں چھوڑو، ہم تو محبوب کے پرستار ہیں۔ دوزخ اس کے

(محبوب کے) ناز کی سرگرمی کا ایک پہلو ہے جسے عتاب کہا جاتا ہے۔

خارج از ہنگامہ سرتاسر بہ بیکاری گزشت

رشتۂ عمر خضر مد حسابی بیش نیست

دینا میں خضر کی زندگی جاوداں کا بڑا چرچا اور ہنگامہ ہے۔ شاعر کہتا ہے: ایک ہنگامے کے سوا خضر کی زندگی ساری کی ساری بے کاری میں گذری۔ عمر خضر کا سلسلہ ایک مد حساب سے زیادہ کچھ نہیں۔

قطرہ و موج و کف و گرداب جیحون است و بس

این من و مائی کہ می بالد حجابی بیش نیست

لغت: ''من و ما'' = میں اور ہم۔ من و مائی، میں ہوں ہم ہیں، دعویٰ کرنا۔

''جیحوں'' = مشرق ایران کے ایک دریا کا نام ہے۔ عام دریا اور سمندر کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے دجلہ۔ ''بالیدن'' پھولنا۔ فخر و ناز کرنا۔ اترانا۔

قطرہ، لہر، جھاگ بھنور یہ سب کے سب جیحوں ہی تو ہیں (اس سے الگ تو کچھ نہیں) یہ جو میں ہوں اور ہم ہیں کے دعوے تعلیاں ہو رہی ہیں، محض حجاب ہیں اور کچھ نہیں۔

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر

یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

خویش را صورت پرستان ہرزہ رسوا کردہ اند

جلوہ می نامند و در معنی نقابی بیش نیست

ظاہر پرستوں (صورت پرستاں) نے اپنے آپ کو بے فائدہ بدنام کر رکھا ہے ورنہ جسے وہ جلوہ کہتے ہیں دراصل (دو معنی) ایک نقاب سے زیادہ کچھ نہیں۔ (جو حسن ازلی کے چہرے پر پڑا ہوا ہے۔

شوخیِ واندیشۂ خویش است سرتاپائی ما
تار و پود ھستی ما پیچ و تابی بیش نیست

ہمارا وجود سرتاپا ہمارا ہی فکر اور اس کی شوخی ہے۔ ہماری ہستی کا تار و پود (تانابانا) پیچ وتاب کے سوا کچھ نہیں۔

انسان اپنی ہستی کی کنہ کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ ایک پیچ در پیچ معما ہے اور اسی میں انسان الجھا ہوا ہے۔ یہی اس کی ہستی ہے۔

زخم دل لب تشنۂ شور تبسم ھای تست
این نمکدان ھا بہ چشم ما سرابی بیش نیست

اصل میں ہمارا زخم دل تیرے تبسم کے نمک کا پیاسا ہے۔ باقی یہ جو دنیا میں ویسے نمکدان ہیں وہ ہماری نظر میں سراب (چھلاوے کی) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عام نمک سے عاشق کے دل کے زخم لذت اندوز نہیں ہو سکتے۔ یہ کام تو معشوق کے تبسم کی نمکینی ہی سرانجام دے سکتی ہے۔

نامہ بر از پیشگاہ ناز، مکتوب مرا
پاسخی آوردہ است اما جوابی بیش نیست

لغت: ''پاسخ'' = جواب (قدیم فارسی میں) ''پاسے سخون'' تھا یعنی وہ الفاظ جو کسی خط یا دفتری نوشتے میں لکھے جاتے تھے، جسے انگریزی میں ریمارکس کہتے ہیں۔ پاسے سخوں مخفف ہو کر پاسخ ہو گیا۔ سخن کا لفظ تین طرح آتا ہے: سُخُن، سَخُن، سُخَن۔

پاسخ کا لفظ پاسُخ بھی آتا ہے اور پاسخ بھی۔ اساتذہ نے دونوں کو جائز قرار دیا ہے۔

مرزا غالب نے پاسخ اور جواب میں فرق کیا ہے۔ پاسخ وہ جواب ہے جس پر مکتوب الیہ کچھ لکھے اور جواب، جواب صاف ہے۔

''پیشگاہ'' = صدر و صدر مجلس کو کہتے ہیں اور اس فرش کو بھی جو صدر کے آگے بچھا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں مرزا غالب نے پیشگاہ کا لفظ پر معنی انداز میں استعمال کیا ہے۔ بارگاہ ناز کہنے کی بجائے پیشگاہ ناز اس لیے کہا ہے کہ قاصد فرش پا انداز ہی سے عاشق کے خط کا جواب لے کر لوٹ آیا ہے۔

قاصد معشوق کی بارگاہ ناز سے ہمارے خط کا جواب لایا ہے لیکن وہ جواب سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ (یعنی جواب صاف ہے)۔

جلوہ کن، منت منہ، از ذرہ کمتر نیستم
حسن با این تابناکی آفتابی بیش نیست

کہتے ہیں کہ ذرے کا وجود آفتاب سے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ دھوپ ہی میں دکھائی دیتا ہے۔

پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

اپنا جلوہ دکھا، احسان نہ جتا، میں ذرے سے تو کم نہیں۔ حسن کتنا ہی تابناک ہو آخر آفتاب سے زیادہ تو نہیں۔

آفتاب اپنی روشنی سے ذرّوں کو زندہ کرتا ہے۔ اگر معشوق اپنا جلوہ دکھائے اور اس سے عاشق کی جان میں جان آئے تو کیا مضائقہ ہے۔

چند رنگین نکتۂ دلکش تکلف بر طرف
دیده ام دیوان غالب، انتخابی بیش نیست

یہ رنگین دلکش نکتے کب تک بیان ہوتے رہیں گے۔ تکلف برطرف، میں نے دیوان غالب کو دیکھا ہے، ایک انتخاب ہی تو ہے۔

غالب کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی نیا دلکش نکتہ تلاش کرنا کیا ضروری ہے۔ سارا دیوان ہی ایسے نکات سے بھرا پڑا ہے اور اس اعتبار سے یہ دیوان کیا ہے، دیوان کا بہترین انتخاب ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر(۲۱)

لذت عشقم ز فیض بی نوائی حاصل است
آن چنان تنگ است دست من که پنداری دل است

لغت: ''تنگ'' فارسی میں کئی ایک مفہوم دیتا ہے۔ دست تنگ: افلاس زدہ ہاتھ۔ ''دل تنگ'' = افسردہ، غمگین دل۔

شاعر نے تنگدستی یا بے نوائی اور تنگ دلی کی باہمی لفظی مناسبت سے شعر میں ایک نکتہ پیدا کیا ہے۔

میری لذت عشق، میری تنگدستی اور بے نوائی کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ میرا ہاتھ اتنا تنگ ہے کہ گویا دل ہے۔

هم بقدر جوشش دریا تنومند است موج
تیغ سیراب از روانی های خون بسمل است

سمندر کے زور تلاطم کے مطابق ہی لہر میں توانائی ہوتی ہے۔ قاتل کی تلوار، خون بسمل کی روانی ہی سے سیراب ہے۔ عاشق میں قتل ہونے کے جذبے ہی سے قاتل کی تلوار اپنی شان دکھاتی ہے۔

وای لب گر دل ز تاب تشنگی نگداز دم
میگساران مست و من مخمور و ساقی غافل است

میخوار مست ہیں، میں خمار زدہ ہوں، اور ساقی غافل ہے۔ ان حالات میں اگر میرا دل پیاس کی تاب لاتے لاتے گداز نہ ہو جائے تو میرے لبوں پر افسوس۔

در خم بند تغافل نالم از بیداد عمر
پردهٔ ساز فغانم پشت چشم قاتل است

تغافل سے مراد یہاں محبوب کا تغافل ہے، جسے دوسرے مصرعے میں قاتل سے یاد کیا گیا ہے۔ ''پردہ'' کا ایک مفہوم ''سر'' ہوتا ہے، یہاں اسی رعایت سے آیا ہے۔ اور دو معنی دے رہا ہے۔ پردۂ ساز فغانم یعنی میری فریاد کے ساز کے سر اور دوسرے میری فریاد کے ساز کا پردہ۔ ''پشت چشم قاتل'' = قاتل کے تغافل کو ظاہر کرتی ہے۔

میں محبوب کے تغافل کا اسیر ہوں اور زندگی کے دکھ اٹھائے جا رہا ہوں، اس فریاد کی تہ میں میرے قاتل (محبوب) کا تغافل ہے جو مجھے مار کر زندگی کے دکھوں سے نجات نہیں دلاتا۔

بسکه ضبط مشق غم فرسود اعضای مرا

راز دل از همنشینانم نهفتن مشکل است

غموں کو ضبط کرتے کرتے میرے جسم کے تمام اعضاء فرسودہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب میرے لیے ہمنشینوں سے رازِ دل چھپانا مشکل ہو گیا ہے۔

یعنی میری حالت صاف ظاہر کر رہی ہے کہ میں غمِ عشق کا مارا ہوا ہوں۔

شهریِ دل نیست گر حسرت، مرا اینجا از چه رو

چشم اهل دل زبان دان نگاه سائل است

لغت: ''شہری دل'' = دل کی مکیں۔ دل کے شہر میں رہنے والی۔ اگر حسرت دلوں کی مکیں نہیں ہے تو اہل دل کی آنکھیں کیوں کر حسرت زدہ دلوں (سائل) کی نگاہوں سے ان کے دلوں کا راز پا لیتے ہیں۔

ہر ایک دل میں کوئی نہ کوئی حسرت ہوتی ہے، چنانچہ ہر حسرت زدہ انسان کی نظریں دوسرے حسرت زدہ انسان کی نگاہوں سے سمجھ جاتی ہیں کہ یہ کوئی سائل ہے، دل میں کوئی آرزو لیے بیٹھا ہے۔

باهمه نزدیکی از وی کام دل نتوان گرفت

تشنهٔ ما بر کنار آب جو پا در گل است

لغت: ''پا در گل'' جس کے پاؤں دلدل میں پھنسے ہوں، مجازاً مجبور و لاچار۔

محبوب کے اتنے قریب ہو کے بھی اس سے دل کے ارمان نہیں نکلتے۔ ہم ایسے پیاسے کی طرح ہیں جس کے پاؤں ندی کے کنارے کی دلدل میں پھنس گئے ہیں اور وہ آگے بڑھ کر پانی نہیں پی سکتا۔

در نوردِ گفتگو از آگهی وا مانده ایم

پیچ و تاب ره نشان دوری سر منزل است

ہم بحثا بحثی میں پڑ کر حقیقت سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتے اور عاجز ہو کر رہ گئے ہیں۔ راستے کے پیچ و خم ہی منزل کی دوری کا نشان ہیں۔

جتنا راستہ پر پیچ ہوا تنا ہی منزل کا فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔ حقیقت کے بارے میں بحث و تمحیص، راستے کے پیچ و خم کی طرح ہوتی ہے جو ہمیں منزل آگاہی تک پہنچنے نہیں دیتی۔

عقل در اثبات وحدت خیره می گردد چرا

هر چه جز هستی است هیچ و هر چه جز حق باطل است

نہ جانے انسانی عقل، وحدت وجود کو تسلیم کرنے میں پریشان کیوں ہے۔ سیدھی بات ہے، جو کچھ ہستی مطلق کے علاوہ ہے، ہیچ ہے، اور جو کچھ حق کے علاوہ ہے، باطل ہے۔ وحدت الوجود کے عقیدے کے مطابق، کائنات کی ہر شے کا وجود، وجود حق ہی ہے۔ وہی ذات ہے، باقی کچھ نہیں۔

ما همان عین خودیم اما خود از وهم دوئی

در میان ما و غالب، ما و غالب حائل است

ہم سب ایک دوسرے کا عکس ہیں لیکن دوئی کے وہم میں ہر شخص اپنے کو دوسرے سے الگ سمجھتا ہے گویا ہم اور غالب کا تصور حائل ہو گیا ورنہ غالب ہم سے الگ نہیں اور ہم غالب سے الگ نہیں۔

❁❁❁

غزل نمبر(۲۲)

ہم وعدہ وہم منع، زبخشش چہ حساب است

جان نیست، مکرّر نتوان داد، شراب است

شراب (شراب طہور) کا وعدہ بھی ہے اور شراب سے منع بھی کیا جاتا ہے۔ آخر آپ کی بخششوں کا کیا حساب ہے۔ شراب کوئی جاں تو نہیں کہ دو بار نہیں دی جا سکتی، شراب ہی تو ہے۔

یعنی اگر آخرت میں شراب ملنی ہے تو آج یہاں کیوں ممنوع قرار دی گئی ہے۔

در مژده ز جوی عسل و کاخ زمرّد

چیزی کہ بدلبستگی ارزد مَی ناب است

جنت میں شہد کی نہر اور زمرد کے محلات کی خوشخبری میں سے جو چیز دل کو کھینچنے والی ہے، وہ شراب ناب ہے اور بس۔ غالب کا یہ اردو شعر دیکھیں۔

وہ شے کہ جس کے لیے ہو ہمیں بہشت عزیز

سوائے بادۂ گلفام و مشک بو کیا ہے

لهراسپ کجا رفتی و پرویز کجائی

آتشکده ویرانه و میخانه خراب است

لغت: ''لہراسپ'' = کیانی خاندان سے ایران کا ایک بادشاہ۔ کیکاؤس کا لڑکا اور گشتاسپ کا باپ۔

''پرویز'' ساسانی خاندانی سے ایران کا بادشاہ۔ خسرو پرویز، شیرین کا شوہر۔

لہراسپ تو کہاں چلا گیا؟ پرویز تو کہاں ہے؟ آتشکدہ ویران پڑا ہے اور میخانہ خراب اور خستہ حالت میں ہے:

شاعر نے لہراسپ کو آتشکدے سے اور خسرو پرویز کو میخانے سے نسبت رکھنے پر خطاب کیا ہے۔ لہراسپ زرتشتی ہونے کے باعث اور خسرو پرویز اپنے تعیش کے لیے مشہور ہے۔

از جلوه به هنگامه شکیبا نتوان شد

لب تشنۂ دیدار ترا خلد سراب است

جلوۂ محبوب کو چھوڑ کر جنت کی رونق میں کھو جانے سے تسکین نہیں ہو سکتی۔ تیرے دیدار کے پیاسے کے لیے خلد تو سراب (فریب نظر) ہے۔

با انهمه دشوار پسندی چه کند کس

تا پرده برانداخته، در بند حجاب است

خدا تعالیٰ کے بارے میں کہتا ہے: اپنی اتنی دشوار پسندیوں کے باوجود کوئی کیا کرے، جب سے اس شاہد ازلی نے پردہ اٹھایا، نظروں سے اوجھل ہے۔

حسن ازلی نے اپنا جلوہ دکھایا لیکن اس جلوے کے باوجود کوئی اس کو نہیں دیکھ سکتا،

وہ حجاب میں ہے۔

دوشینہ بہ مستی کہ مکیدست لبش را؟
کامروز بہ پیمانہ می در شکر آب است

پہلے مصرعے میں "لبش" کے لفظ ش کے ضمیر کا مرجع پیمانہ ہے۔ کل کس نے مستی کے عالم میں پیمانے کو چوسا ہے کہ اس سے آج شراب میں شیرینی آگئی۔ ظاہر ہے کہ شاعر کس کے لفظ میں محبوب کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جس کے شیریں لبوں نے پیمانے کو چوس کر شراب کے ذائقے کو شیریں بنا دیا۔

آن قلزم داغیم کہ بر ما ز جہنم
چندان کہ فتد صاعقہ باران در آب است

ہم محبت کے آتشیں داغوں کا وہ سمندر ہیں کہ ہم پر دوزخ سے جتنے برق کے شعلے گریں یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پانی پر بارش ہو رہی ہے۔

یعنی ہم دل جلوں پر جہنم کی آگ کا کیا اثر ہوگا۔ اس کے شعلے تو ہمارے لیے بارش کے قطرے ہیں جو ہمیں جلانے کی بجائے ہمیں ٹھنڈک پہنچائیں گے۔

سر گرمی ھنگامۂ طامات ندارم
فیضی کہ من از دل طلبم بوی کباب است

لغت: "طامات" = جمع طامہ (م مشدد کے ساتھ) فارسی والوں نے اسے تخفیف کے ساتھ طامہ بنا دیا۔ نام نہاد صوفیہ کی کشف و کرامات کے سلسلے میں پراگندہ اور مبالغہ آمیز باتیں۔

میرے دل میں پریشان اور مبالغہ آمیز باتوں سے حرارت پیدا نہیں ہوتی۔ میں تو

اپنے دل سے جو فیض حاصل کرتا ہوں وہ بوئے کباب ہے، یعنی میں دل جلا ہوں اور چاہتا ہوں کہ دل سے بوئے کباب آتی رہے کہ اس میں ایک لذت بھی ہے۔

تا غالب مسکین چہ تمتع برد از تو
برداشتہ آنچہ خود از چہرہ، نقاب است

مسکین غالب تیرے حسن کے جلوے سے کیا لذت اندوز ہو سکتا ہے۔ تو نے اپنے چہرے سے جو کچھ اتار پھینکا ہے، وہ بھی نقاب ہی بن گیا ہے۔

سارے مظاہر قدرت، حسن ازلی ہی کے مظاہر ہیں۔ وہ ان میں جلوہ گر ہے۔ اس نے اپنے چہرے سے نقاب اتار ڈالا ہے لیکن اس جلوہ گری کے باوجود نظر نہیں آتا گویا اس کا نقاب اتارنا بھی ایک طرح کا نقاب ہی ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۲۳)

بسکہ از تاب نگاہ تو ز آسودن رفت
بادہ چون رنگ خود از شیشہ بپالودن رفت

تیری نظر کی تابانیوں سے شراب تڑپ اٹھی اور اس کی آسودگی جاتی رہی۔ اپنے رنگ کی طرح وہ خود بھی صراحی میں صاف اور پاکیزہ ہوگئی۔

این سفال از کف خاک جگر گرم کہ بود؟
دست شستیم زصہبا کہ بہ پیمودن رفت

لغت:- ''سفال'' = جام سفالیں یعنی مٹی کا پیالہ مراد ہے۔

یہ جام سفالیں کس (عاشق) کے جگر گرم کف خاک سے بنا ہوا تھا کہ ہم نے جو شراب اس میں ڈالی، وہ اس نے جذب کر لی اور ہمیں اس شراب سے ہاتھ دھونا پڑا۔

خیز و در دامن باد سحر آویز بہ عذر

گر شبت تیرہ بداغ مژہ نکشودن رفت

اگر تو نے رات بھر اپنی پلکیں نہیں کھولیں اور تیری ساری سیاہ رات اسی دکھ میں گزر گئی تو اٹھ اور اسی بہانے سے بادِ سحر کے دامن ہی سے لپٹ جا۔

یعنی رات تو کٹ جیسی بھی کٹی، اب بادِ سحر کے دامن ہی سے لپٹ جا۔ یعنی رات تو کٹی جیسی بھی کٹی، اب بادِ سحری سے تو تمتع حاصل کر لے۔

ھر چہ از گریہ فشاندیم بہ نشمردن ریخت

ھر چہ از نالہ رساندیم بہ نشنودن رفت

ہم نے رونے میں آنکھوں سے جتنے آنسو بہائے وہ سب کے سب بے گنے ضائع ہو گئے اور دل کا جو دکھ درد فریاد کے ذریعے پہنچایا وہ نہ سننے کی نذر ہو گیا۔

یعنی نہ تو کسی نے ہماری اشک فشانی کی طرف توجہ کی اور نہ نالہ و فریاد کو سنا۔

ریگ در بادیۂ عشق رواں است ھنوز

تا چھا پای درین راہ بہ فرسودن رفت

بیابانِ عشق کی ریت ابھی تک اسی طرح گرمی اور تیز رفتاری سے رواں دواں ہے۔ اللہ

جانے کتنے پاؤں اس راہ میں گھستے گھستے ختم ہو گئے۔

ہزاروں بدنصیب رہروانِ عشق وحشت و جنوں کے عالم میں صحرا نوردی کرتے کرتے مر گئے لیکن بیابانِ عشق کا دم خم ابھی وہی ہے۔ اس کی ریت ویسی ہی گرم اور رواں ہے۔ اس میں فرق نہیں آیا۔

باخت از بسکہ زلیخا بہ تماشای تو رنگ

از حیا بر در زندان بہ گل اندودن رفت

زلیخا تیرے جلوے کو دیکھ کر اپنا رنگ کھو بیٹھی چنانچہ شرم سے قید خانے کے دروازے کی مٹی (کاہگل) سے لپائی کرنے کے لیے چلی گئی۔

غالب کے محبوب کا جلوہ دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا (زرد پڑ گیا) چنانچہ اس نے جہاں یوسف کے قید خانے میں سفیدی کروائی تھی وہاں اب مٹی کی لپائی کرنے لگی کہ اس کا رنگ زرد ہوتا ہے۔

بر تنک مایگی ام رحم کہ یک عمر گناہ

ھم بہ تاراج سبکدستی بخشودن رفت

لغت: ''تنک مایگی'' = تنگدستی۔ ''سبک دستی'' ہاتھوں کی چستی، مہارت، سبکدستی بخشودن، بڑی تیزی اور صفائی سے بخشنا۔ میری تنگدستی قابل رحم ہے کہ میرا سارا سرمایہ یہ گناہوں بھری زندگی تھی، وہ خدائے پاک کے ماہرانہ انداز بخشش نے لوٹ لی۔

مرزا غالب کا سرمایۂ حیات گناہ تھے، وہ اللہ کی بخشش کی نذر ہو گئے اور مرزا خالی ہاتھ رہ گئے۔ شاعر نے اس شعر میں اپنے گناہوں کا اعتراف اور اُن پر ناز کرنے اور پھر اپنے پروردگار

کی وسعت کرم کو نہایت فنکارانہ مہارت سے بیان کیا ہے۔ یہ شعر غالب کے نہایت بلیغ اشعار میں سے ہے۔

داغ تردستی اشکم کہ ز افسردن دل

ھرچہ در گریہ فزودیم در افزودن رفت

لغت: ''تردستی'' = چستی و چالاکی۔ ''داغ'' = جلنا۔

میں اپنے آنسوؤں کی چستی اور چالاکی سے جل کر داغ ہو گیا ہوں کہ دل کی افسردگی کے باعث رونے میں جتنا اضافہ کیا وہ اضافہ کرنے میں ضائع ہو گیا۔

شاعر نے آنسوؤں کے تیزی سے بہنے کو ان کی تردستی کا نام دیا ہے۔ عاشق کا دل افسردہ ہے اور افسردگی کے باعث آنسو بھی اس روانی سے بہتے ہیں۔ جب آنسوؤں میں اضافے کی کوشش کی گئی تو چند آنسو جو تھے وہ اس آنسو بڑھانے کی کوشش میں صرف ہو گئے۔

شست و شو مشغلۂ شوخی ابر کرم است

وژم آن خرقہ کہ با داغ نیالودن رفت

اللہ تعالیٰ کے ابر کرم کا ایک شوخ مشغلہ ہے کہ وہ گنہگاروں کے دامن سے گناہوں کے داغ دھوڈالتا ہے۔ ایسی صورت میں اس خرقے کی حالت کتنی افسوس ناک ہے کہ جس پر کوئی ایسا داغ نہ پڑا اور وہ خرقہ اس داغ سے آلودہ نہ ہونے کی کوشش ہی میں ختم ہو گیا۔

مدعی خواست رود بر اثر من غالب

ھرچہ زو بود بہ سودای چو من بودن رفت

لغت: ''مدعی'' = حریف، مقابل ''براثر کسی رفتن'' = کسی کی پیری یا نقل کرنا۔

میرے حریف نے چاہا کہ وہ میری پیروی کرے۔ جو کچھ اس کے پاس تھا وہ میرے جیسا بننے کی کوشش میں جاتا رہا۔

غالب کے حریف اس کے مقابل تو نہ ہو سکے لیکن کوشش کرتے کرتے جو کچھ پونجی اپنے پاس تھی وہ بھی گنوادی۔

غزل نمبر (۲۴)

نگہ بہ چشم نہان و بہ جبھہ چین پیداست

شگرفی تو ز انداز مھر و کین پیداست

لغت: ''شگرف'' = عجیب ''شگوفی'' = عجوبہ پن۔ ''جبھہ'' = پیشانی۔

تیری نگاہیں آنکھوں ہی میں رہ گئی ہیں لیکن پیشانی پر تیوری چڑھی ہوئی ہے۔ تیرا عجوبہ پن تیرے پیار اور تیرے غصے کے انداز سے معلوم ہو جاتا ہے۔

معشوق ایک طرف تو نظریں چھپا چھپا کے عاشق کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے جس سے پیار ٹپکتا ہے۔ دوسری طرف اس کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے ہیں جو غصے کی علامت ہے۔ معشوق کے دو قسم کے تیور جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس کی طبیعت کی عجیب افتاد کو ظاہر کرتے ہیں۔

نظارہ عرض جمالت ز نو بھار گرفت

شکوہ صاحب خرمن ز خوشہ چین پیداست

ہماری نظروں نے تیرے حسن و جمال کا اندازہ بہار سے کرلیا۔ خوشہ چیں سے خرمن کے (جہاں سے خوشہ چینی کی گئی ہے۔) مالک کی شان کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

بہار کیا ہے؟ حسن وشباب کا مجسمہ ہے۔ اسی سے معشوق کے حسن کا سراغ ملتا ہے۔ عاشق کی نظریں اُسی سے خوشہ چینی کرلیتی ہیں۔

رسید تیغ تو ام بر سر و ز سینہ گذشت

زهی شگفتگی دل کہ از جبین پیدا است

تیری تلوار تو میرے سر پر لگی لیکن یہ محسوس ہوا کہ سینے سے گذر گئی ہے۔ ہمارے دل کی شگفتگی کے کیا کہنے کہ اس کا اندازہ ہماری پیشانی سے ہورہا ہے۔

بجرم دیدۂ خون بار کشتہ ای ما را

ترا ز دامن و ما را ز آستین پیداست

تو نے ہمیں اس جرم میں مارڈالا کہ ہماری آنکھوں سے خون کے آنسو بہ رہے تھے۔ یہ بات دو چیزوں سے ظاہر ہوگئی۔ تمہارے دامن سے کہ اس پر ہمارے خون کے دھبے پڑے ہیں اور ہماری آستیں سے کہ جس سے ہم اپنے اشک خوں پونچھتے رہے۔

زهی لطافت پرواز سعی ابر بہار

کہ ہر چہ در دل باد است از زمین پیداست

ابر بہار کی حسین کوششوں کی لطافت اور پرداخت، سبحان اللہ! جو کچھ ہوا کے اندر (دل) میں ہے وہ زمین سے ظاہر ہورہا ہے۔

موسم بہار کے بادلوں سے مینہ برس رہا ہے، ہوا میں تازگی آگئی ہے اور اس سے زمین میں رنگارنگ پھول اُگ آئے ہیں اور اپنی رعنائیاں دکھا رہے ہیں۔

فتیلۂ رگ جان سر بسر گداختہ شد

ز پیچ و تاب نفس ھائی آتشین پیداست

لغت: ''نفس ہای آتشین'' = آتشیں آہیں اور فریادیں۔

ہماری آتشیں آہیں اور فریادیں صاف بتارہی ہیں کہ ہماری رگ جاں جو فتیلے (بتی) کی طرح ہے، جل جل کر گداز ہوگئی (اور وہیں سے یہ آگ ابھر رہی ہے) عاشق کی جان انہی فریادوں کی نذر ہوگئی۔

نفس گداختن جلوہ در ھوائی قدش

ز خوی فشانی آن روی نازنین پیدا ست

لغت: ''خوے'' = اس میں واو، واو معدولہ ہے یعنی بولی نہیں جاتی۔ خوی کو خی پڑھتے ہیں اس کے معنے پسینہ ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قد رعنا کی فضا میں جلوۂ حسن خود گداز ہوگیا ہے چنانچہ یہ بات معشوق کے نازنیں چہرے سے ظاہر ہورہی ہے کہ جس سے پسینہ ٹپک رہا ہے۔

عیار فطرت پشیمان ز ما خیزد

صفای بادہ ازین درد تہ نشین پیدا ست

لغت: ''عیار فطرت'' = فطرت کا خالص پن۔ ''درد'' = تلچھٹ، وہ میل جو تہ میں بیٹھ جاتا ہے۔

ہماری ہی وجہ سے متقدمین (ہم میں سے پہلے بزرگوں) کا معیارِ فطرت نمایاں ہوتا ہے۔ہم وہ دردِ تہ نشیں ہیں کہ جس سے شراب کی پاکیزگی کا سراغ ملتا ہے۔

مرزا غالب قدیم استادانِ فن کے مقابلے میں اپنے آپ کو حقیر سمجھتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ ہمارے بزرگ شرابِ ناب تھے ہم تلچھٹ ہی سہی، ہمیں ان سے یک گونہ نسبت ہے۔لوگوں کو یہ تو پتا چلتا ہے کہ ہم کن کے جانشین ہیں۔

زہی شکوہ تو کاندر طراز صورت تو

ز خود برآمدن صورت آفرین پیدا ست

تیرے حسن کی شان و شکوہ کے کیا کہنے! کہ تیری صورت کے سنوارنے میں، تیرا صورت آفریں (خالق) اپنے آپ سے باہر آگیا۔

یعنی تیری صورت سے تیری صورت کو پیدا کرنے والے کا سراغ ملتا ہے۔

نہاد نرم ز شیرینی سخن غالب

بسان موم ز اجزای انگبین پیداست

لغت: ''انگبیں'' = شہد۔

اے غالب! کلام کی شیرینی سے ہماری فطرت کی نرمی اور لطافت اسی طرح معلوم ہو جاتی ہے جس طرح موم کا سراغ شہد کے اجزا سے مل جاتا ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر (۴۵)

گر بار نیست سایہ خود از بید بودہ است

باری بگو کہ از تو چہ امید بودہ است

لغت: ''بار'' = پھل۔

کہتے ہیں کہ سرو کی طرح بید کے درخت کو پھل نہیں لگتا۔ معشوق سے کہتا ہے:

اگر بید پھل نہیں دیتا تو اس کا سایہ تو ہوتا ہے (انسان اسی سے فیض حاصل کرتا ہے) تمھی بتادو کہ ہمیں تم سے کیا امید ہے (نہ پھل ہے نہ سایہ)

شادم ز درد دل کہ بمغز شکیب ریخت

نومیدئی کہ راحت جاوید بودہ است

میں اپنے درد دل سے خوش ہوں کہ اس نے صبر و شکیب کے مغز میں وہ ناامیدی اور مایوسی پیدا کر دی ہے کہ وہ میرے لیے ہمیشہ رہنے والی راحت بن گئی ہے۔

انسان کو دکھ اس وقت ہوتا ہے جب وہ کوئی امید لگائے ہوئے ہو اور وہ امید پوری نہ ہو۔ جب مایوسی کا عالم طاری ہو جائے تو طبیعت کو ایک سکون حاصل ہو جاتا ہے۔

ظالم ہم از نہاد خود آزار می کشد

بر فرقِ ارّہ ارّہ تشدید بودہ است

لغت: ''نہاد'' = وجود۔ ''فرق'' = سر۔ ''ارہ'' = آرا۔

''تشدید'' = دو ایک جیسے حرفوں کو ملا کر پڑھنا تشدید کہلاتا ہے جیسے لفظ ''ارّہ'' میں

رکا حرف۔ تشدید کی نشانی "ـ" ہوتی ہے۔ جس میں آرے کی طرح دندانے ہیں۔ گویا ارے
کے سر پر ایک اور راہ ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ ظالم کو اپنے وجود ہی سے ظلم کی سزا مل جاتی ہے۔ دیکھ لو آرے
کے سر پر تشدید ہے (جو آرے کی طرح اس پر چل رہی ہے)

شبہا کند ز روی تو دریوزۂ ضیا

مہ کاسۂ گدائی خورشید بودہ است

چاند، راتوں کو تیرے چہرے سے کسبِ ضیا کرتا رہتا ہے۔ (تیرے چہرے سے روشنی
کی بھیک مانگتا ہے) یہ چاند کیا ہے۔ سورج سے روشنی مانگنے کا کاسہ ہے (کاسۂ گدائی)۔
معشوق کے روئے درخشاں کو سورج سے تشبیہ دی ہے۔ گویا چاند اس کے آگے ہیچ ہے۔

تلخ است تلخ رشک تمنای خویشتن

شادم کہ دل ز وصل تو نومید بودہ است

لغت: "نومید" = ناامید۔

عاشق کو اپنی تمنا پر بھی رشک آتا ہے اور رشک سے دکھ ہوتا ہے لیکن کہتا ہے کہ میں خوش
ہوں کہ میرا دل تیرے وصل سے ناامید ہو چکا ہے۔ اس کی تمنا جاتی رہی ہے اور اس کے ساتھ
ہی مجھے رشکِ تمنا کی تلخیوں سے نجات مل گئی ہے۔

در ماہ روزہ طرہ پریشان چہ می روی

مَی خور کہ در زمانہ شبِ عید بودہ است

لغت: "طرہ پریشان" = وہ شخص جس کے بال بکھرے ہوئے پریشان ہو۔ پریشان
حال۔ روزوں کے مہینے میں یہ پریشان حالی کیسی؟ شراب پی کہ دنیا میں ایک چیز شبِ عید بھی
ہوتی ہے۔

از رشک خوش نوائی ساز خیال من

مضراب نی بناخن ناہید بودہ است

لغت: "ناہید" = ایک سیارہ ہے، اسے اہل یونان رقص و نغمہ سے منسوب کرتے
ہیں۔ اسے زہرہ اور رقاصہ فلک بھی کہا جاتا ہے۔
"مضراب" = زخمہ۔ وہ چھلا جسے انگلی میں پہن کر ساز بجایا جاتا ہے۔ "نے" بانسری۔
میرے تخیل کے ساز سے وہ نغمے ابھرتے ہیں جن کے انداز خوش نوائی پر زہرہ کو بھی
رشک آتا ہے اور وہ اپنے ناخن میں مضراب نے پہن لیتی ہے۔
"مضراب نے" کے استعمال سے شاعر نے یہ لطیف اشارہ بھی کیا ہے کہ ناہید کی نوا
درد بھری ہوتی ہے۔

ہر گونہ حسرتی کہ ز ایام می کشیم

درد تہ پیالۂ امید بودہ است

لغت: "درد تہ" = وہ تلچھٹ یا میل جو پیالے یا صراحی کے نیچے بیٹھ جاتا ہے۔
زمانے کے ہاتھوں جو حسرت ہمارے دل میں رہ جاتی ہے، وہ ہمارے پیالۂ امید کی تلچھٹ
ہوتی ہے۔
انسان کی مایوسیاں، اس کی امیدوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جتنی امیدیں کم ہوں گی اتنی

ہی مایوسیوں کی درد کم ہوگی۔

حق را ز خلق جو کہ نو آموز دید را
آئینہ خانہ مکتب توحید بودہ است

لغت: ''نوآموز'' = وہ شخص جس نے کسی کام کے سیکھنے کی ابتدا کی ہو۔ مبتدی۔

مخلوق ہی میں خالق کو تلاش کر کیونکہ نیا نیا نظارہ کرنے والے کے لیے آئینہ خانہ ہی مکتب توحید ہوتا ہے۔

یہ کائنات ایک آئینہ خانہ ہے۔ جس میں ہستی مطلق کے ہزاروں لاکھوں عکس نظر آتے ہیں۔ توحید کے راز کے سمجھنے والے کے لیے اس میں بڑی آسانی ہے۔ وہ اس کثرت میں وحدت کے موجود ہونے کو پالیتا ہے۔ گویا یہ اس کے لیے مکتب توحید ہے۔

نادان حریف مستی غالب مشو کہ او
دردی کش پیالۂ جمشید بودہ است

لغت: ''جمشید'' ایران کا ایک پرشکوہ شہنشاہ جس کے نام پہ جام جم مشہور ہے۔ اس جام جمشید کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب اسے گھماتے تھے تو اس میں آنے والے واقعات کا عکس نظر آتا تھا۔

اے ناداں تو غالب کی مستی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ وہ تو جام جمشید کی درد تک کا پی جانے والا ہے۔ یعنی غالب کی مستی خم کے خم پینے سے ہوئی ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر(۲۶)

یار در عہد شبابم بہ کنار آمد و رفت
ہمچو عیدی کہ در ایام بہار آمد و رفت

میرا محبوب عہد شباب میں، میرے آغوش میں آیا اور چلا گیا، اس عید کی طرح کہ فصل بہار میں آئی اور چلی گئی۔

تا نفس باختۂ پیروی شیوۂ کیست
تند بادی کہ بہ تاراج غبار آمد و رفت

لغت: ''تند باد'' = تیز ہوا، آندھی (کا طوفان)۔

''نفس باختہ'' = جس کا سانس اکھڑا ہوا ہو، خصوصاً تیزی سے چلنے سے۔

''تا'' = یہ لفظ ایسا ہے کہ اس کا متبادل اُردو ترجمہ مشکل ہے۔

''تا'' کا یہاں استعمال روزمرہ کا ہے اور محض زور بیان کے لیے آیا ہے۔ یہ ہوا کا طوفان جو خس و خاک (غبار) کو اٹھا لے جانے کے لیے آیا اور چلا گیا، آخر کس کے انداز و ناز گی پیروی کی کوشش میں اپنے حواس کھوئے ہوئے ہے۔

تند باد کا استعارہ محبوب کے لیے آیا ہے، یعنی یہ آندھی کا طوفان، محبوب ہی کے انداز طبیعت کا مظہر ہے۔ یوں کہیے کہ وہ معشوق کیا ہے، ایک تند باد ہے جس کے طوفان میں ہزاروں چاہنے والے غبار کے طرح اڑ جاتے ہیں۔

سبحہ گردان اثرہای وجود است خیال

ہر چہ گل کرد تو گوئی بشمار آمد و رفت

لغت: ''سبحہ'' = تسبیح۔ ''سبحہ گرداں'' = تسبیح پھیرنے والا ''گل کردن'' = ظاہر ہونا۔

''اثر'' = ایک معنی نشان ہے، جمع آثار۔ اس شعر میں وہی قدیم مروجہ نظریہ وجود کائنات کا تذکرہ ہے کہ اس کائنات کا وجود خیالی ہے۔ کہتا ہے:

انسان کا وہم وخیال ہی وجود کائنات کے نشانوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح شمار کرتا چلا جا رہا ہے۔ جو شے سامنے آئی (گل کرد) اسے شمار کر لیا اور وہ غائب ہو گئی۔

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

طالع بسمل ماببین کہ کمان دار زپی

پارۂ بر اثر خون شکار آمد و رفت

ہمارے بسمل کا نصیب دیکھو کہ شکاری کماں اٹھائے ہوئے پیچھے سے شکار کے خون کے نشان زمیں پر پڑے دیکھ کر اس کی طرف آیا اور پھر لوٹ گیا۔

یہاں طالع کا لفظ طنزاً آیا ہے، یعنی بدنصیبی۔

عاشق، محبوب کا زخم خوردہ ہے لیکن محبوب کو اس کی پروانہیں۔ عاشق بدنصیب کی حالت اس بسمل کی طرح ہے کہ شکاری اس کے خون کے نشان کے سراغ پر اس کی طرف تیر کمان اٹھائے ہوئے آئے اور پھر دیکھے کہ شکار تو وہی ہے، وہیں اس کو چھوڑ جائے۔

شادی وغم ہمہ سرگشتہ تر از یک دگر اند

روز روشن بہ وداع شب تار آمد و رفت

خوشی ہو یا غم سب ایک دوسرے سے بڑھ کر آوارہ مزاج ہیں۔ روز روشن کو دیکھو، سیاہ رات کو رخصت کرنے کے لیے آیا اور چلا گیا۔

ہرزہ مشتاب و پی جادہ شناسان بردار

ای کہ در راہ سخن چون تو ہزار آمد و رفت

یوں ہی تیز رفتاری نہ دکھا، رستے سے واقف لوگوں کے نقش قدم پر چل۔ تجھ سے پہلے اس راہ سخن میں تیرے جیسے ہزاروں آئے اور چلے گئے۔

برق تمثال سراپای تو می خواست کشید

طرز رفتار ترا آئنہ دار آمد و رفت

لغت: ''آئینہ دار'' = سنگھار کرتے وقت جو عورت سامنے آئینہ لے کے بیٹھتی تھی، آئینہ دار کہلاتی تھی۔ مجازاً آئینہ دار اسے کہتے ہیں جو کسی دوسرے کا نمونہ پیش کرے۔

برق نے تیرے سراپا کی تصویر کھینچنا چاہی، وہ صرف تیری رفتار کی صورت (کا نمونہ) پیش کر سکی اور چلی گئی۔ گویا معشوق کی رفتار چشمک برق ہے کہ آنکھوں کے سامنے آتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ عاشق، دیدار کے پیاسے، ترستے رہ جاتے ہیں۔

غالب:

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا

ہلہ غافل ز بہاران چہ طمع داشتہ

گیر کامسال بہ رنگینی یار آمد و رفت

لغت: ''ہلہ'' = حرفِ تنبیہ۔

اے غافل بہاروں سے تجھے کیا توقع ہے۔ یہ سمجھ لے کہ اس سال وہ حسن یار کی رنگینیوں کے انداز میں آئی تھی اور چلی گئی۔

به فریب اثر جلوهٔ قاتل صد بار

جان به پروانگی شمع مزار آمد و رفت

عاشق کے مزار پر شمع جل رہی ہے۔ تصور ہوتا ہے کہ یہ جلوۂ قاتل ہے۔ عاشق جو اس قاتل کے ہاتھوں قتل ہوا ہے، بار بار دھوکا کھاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ شمع نہیں جلوۂ قاتل ہے۔ اس کی روح قبر سے کئی بار باہر نکل کر آئی اور پروانہ وار اس شمع پر قربان ہو کر چلی گئی۔

❀❀❀

غزل نمبر (۲۷)

اختری خوش تر ازینم بجهان می بایست

خرد پیر مرا بخت جوان می بایست

لغت: ''انسانی قسمتوں کو چونکہ ستاروں سے وابستہ کیا جاتا ہے اس لیے شعر میں ''اختر'' کا لفظ ستارۂ قسمت ہی کا مفہوم دے رہا ہے۔ میرا ستارۂ قسمت اس دنیا میں اس سے بہتر ہونا چاہئے تھا۔ اے عقل پیر (تو تو مجھے مل گئی) میرا نصیب تو جواں ہونا چاہئے۔

به زمینی که بآهنگ غزل نشینم

خاک گل بو و هوا مشک فشان می بایست

جس سرزمین میں غزل گوئی کے لیے آمادہ ہوتا ہوں، وہاں کی خاک پھولوں کی طرح معطر اور ہوا مشک فشاں ہونی چاہئے۔

برنتابم به سبو باده ز دور آوردن

خانهٔ من بسر کوی مغان می بایست

میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے لیے شراب کسی دور جگہ سے آئے۔ میرا گھر تو کوئے مغاں کی گلی میں ہونا چاہیے۔

به گرایش خوشم، اما به نمائش خوارم

پرسشی چند زیارم به زبان می بایست

لغت: ''گرائیدن'' = مائل ہونا۔ اسی سے گرائش حاصل مصدر ہے اور میلان و رغبت کا مفہوم دیتا ہے۔

کہتا ہے کہ میں محبوب کی ظاہرا رغبت سے خوش ہوں، لیکن چونکہ اس میں نمائش کا پہلو ہے اور یہ محض دکھاوے کے لیے ہے۔ اس لیے میں اسے اپنے لیے ذلت خیال کرتا ہوں۔ کبھی تو وہ اپنی زبان سے میرا حال احوال پوچھے۔

تاب محرم نکند خسته دلی در ره شوق

روی گرمی ز رفیقاں بمیان می بایست

شوق کی راہ میں کوئی خستہ دل انسان، میری بے تابی محبت کی تاب نہیں لاسکتا۔ ایسے سفر میں تو گرم رو رفیق ہمراہ ہونے چاہئیں جن کے چہروں سے محبت کی گرم جوشی ٹپکتی ہو۔ (تاکہ ہم پورے ذوق و شوق سے قدم اُٹھائیں)۔

نرسد نامہ در اندیشہ سبب ھاست بسی
پرس وجوی زعزیزان بگمان می بایست

محبوب کا خط نہیں آتا۔ اس سلسلے میں میرے ذہن میں بہت سے گمان ابھرتے ہیں۔ (کہ یہ سبب ہوگا، وہ سبب ہوگا) چنانچہ اس گمان کی حالت میں ہمارے عزیزوں سے کچھ پوچھ گچھ ہونی چاہئے۔

ھر زہ دل بر در و دیوار نھادن نتواں
سویم از روزنہ چشمی نگران می بایست

محبوب کے در و دیوار پر یونہی بے فائدہ نظریں جمائے بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں۔ چاہئے کہ دیوار کے روزن سے کوئی ہمیں جھانک بھی رہا ہو۔

یعنی محبوب ذرا سے التفات سے تو کام لے۔

ساز ھستی کنم و دل بہ فسوسم گیرد
ھم در اندیشہ خدنگم بہ نشان می بایست

لغت ''فسوس'' = افسوس کا مخفف ہے۔

''دل بہ فسوسم گیرد'' میرے دل کو افسوس ہوتا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ زندگی کا سامان

کرتا ہوں اور خود ہی دل گرفتہ ہو کر رہ جاتا ہوں۔ آخر میرے تصور میں کوئی مقصود ہونا چاہئے کوئی ایسا تیر تو ہو جو نشانے پہ بیٹھنے والا ہو، یونہی بلا مقصد غلط امیدوں کے گھروندے بنانے سے کیا فائدہ۔

یا تمنای من از خلد برین نہ گزشتی
یا خود امید گھی در خور آن می بایست

یا تو میری تمنا خلد بریں سے آگے نہ جاتی یا پھر اس بلند تمنا کے مناسب کوئی بلند امید گاہ ہونی چاہئے تھی۔

انسان کی منتہائے نظر جنت ہے۔ مرزا غالب کی بلند نظر اس سے آگے پڑتی ہے اور آگے کوئی مقام نہیں۔ اب یا تو یہ وسیع ظرف عطا نہ کرتا جس کی نظر میں خلد نہیں جچتا یا اس بلند نظری کے مناسب کوئی خلد سے بڑھ کر مقام ہونا چاہئے جس پر انسان نظر جمائے۔

غالب:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

کم نظر لوگ خلد و طوبیٰ ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس شعر کو دیکھیے، یہ پہلے آ چکا ہے:

بی خود بزیر سایہ طوبیٰ غنودہ اند
شبگیر رھروان تمنا بلند نیست

تا تنک مایہ بہ دریوزہ خود آرا نشود
نرخ پیرایۂ گفتار گران می بایست

لغت: ''پیرایہ'' = آرائش و زینت، حسن انداز۔

آراستگی کلام کا نرخ ذرا گراں ہونا چاہیے تاکہ کم مایہ لوگ اسے لے کر (اس کی بھیک مانگ کر) اپنے آپ کو اس سے سنوار نہ لیں۔

کلام اتنا بلند ہونا چاہیے کہ دوسرے کم مایہ لوگ اس کی نقل کر کے اس پر فخر نہ کر سکیں۔

قدر انفاس گرم در نظر استی غالب
در غم دھر دریغم بہ فغان می بایست

لغت: "انفاس" = سانس "گر" = اگر۔ "م" جو گر کے بعد ہے وہ نظر کے ساتھ ہے اور اضافی ہے یعنی نظرمن۔ "قدر" = قدر و قیمت۔ "قدر انفاس" = انسانی سانس کی قدر و اہمیت۔

غالب اگر میری نظر میں ان سانسوں کی کوئی قدر و قیمت ہے تو میں جو دنیا کے غم میں پڑ کر ان سانسوں سے فریاد کرتا رہا ہوں اس پر افسوس کرنا چاہیے۔ ان قیمتی سانسوں کو غم دنیا میں صرف کرنا افسوسناک امر ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۲۸)

از فرنگ آمدہ در شہر فراوان شدہ است
جرعہ را دین عوض آریدی ارزان شدہ است

لغت: "فرنگ" = اصل میں فرنک تھا اور فرانس کے لیے آتا تھا۔ فارسی میں کاف فارسی یعنی گ کے ساتھ آتا ہے۔ لغت عام میں یورپ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ شراب کا تذکرہ ہے، کہتا ہے:

یہ فرنگ سے آئی اور شہر میں کثرت سے ملتی ہے۔ اس کے ایک جرعے کے لیے دین لے آؤ کہ سستی ہوگئی ہے۔ شعر میں گہرا طنز ہے یعنی تہذیب فرنگ بغیر دین بیچے حاصل نہیں ہو سکتی۔

چشم بد دور چہ خوش تپم امشب کہ بروز
نفس سوختہ در سینہ پریشان شدہ است

اللہ نظر بد سے بچائے، میں آج رات اس مزے سے جل رہا ہوں کہ دن کے وقت میرے سینے میں جلا ہوا سانس پریشان ہو رہا ہے۔ (کہ وہ جلنے کی لذت کہاں گئی)

در دلش جوئی و در دیر و حرم نشناسی
تاچہ روداد کہ در زاویہ پنہان شدہ است

تو اسے دل میں ڈھونڈ رہا ہے اور دیر و حرم میں اسے نہیں پہچانتا، آخر کیا بات ہوگئی کہ وہ ایک گوشے میں آ کے چھپ گیا ہے۔

خدا ہر جگہ موجود ہے۔ دیر ہو کہ حرم سب جگہ وہی جلوہ گر ہے۔ پھر اس کو محض دل میں محصور کر لینا کیسا؟

لب گزد بیخود و با خود شکر آبی دارد
تاچہ گفت است کہ از گفتہ پشیمان شدہ است

محبوب بیخودی کے عالم میں اپنے لب کاٹ رہا ہے۔ در آں حالیکہ اس کے پاس آب شیریں ہے۔ (شیریں لب) اس نے کیا کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے کہے پر پشیمان ہو رہا ہے۔

داغم از مور و نظر بازی شوقش بہ شکر

کش بود پویہ بدان پای کہ مژگان شدہ است

لغت: ''پویہ'' = تیز تیز چلنا۔

چیونٹی میٹھی چیز (شکر) کی طرف بڑے شوق سے لپکتی ہے شاعر نے اس کی نازک ٹانگوں کو مژگان کہا ہے گویا وہ اپنی محبوب چیز یعنی شکر کی طرف آنکھوں کے بل چلتی ہے۔ چنانچہ اسے چیونٹی کا یہ ذوق وشوق دیکھ کر رشک آتا ہے۔

مرزا غالب نے شوق کے ساتھ نظر بازی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ دو اعتبار سے، ایک تو یہ کہ وہ کتنی دور سے شکر کو دیکھ لیتی ہے اور دوسرے یہ کہ آنکھوں کے بل چل کر ادھر کو جاتی ہے۔

گفتم البتہ زمن شاد بمردن گردی

گفت دشوار کہ مردن بتو آسان شدہ است

لغت: ''البتہ'' = فارسی میں تاکید کے لیے آتا ہے۔

میں نے محبوب سے کہا یقیناً تو میرے مرجانے سے خوش ہوگا۔ اس نے جواب دیا، نہیں، میرا خوش ہونا دشوار ہے اس لیے کہ تو آسانی سے مر رہا ہے (میں تو تجھے تڑپتا ہوا دیکھنا پسند کرتا ہوں) دوسرے مصرعے کا ایک اور معنوی پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب نے کہا کہ یہ بات مشکل ہے کہ مرنا تیرے لیے اتنا آسان ہوگیا ہے۔

درد روغن بچراغ و کدر می بہ ایاغ

تا خود از شب چہ بجا ماند کہ مہمان شدہ است

رات بھر محفل میں چراغ جلتا رہا، تیل ختم ہوگیا، صرف تھوڑا سا میل رہ گیا ہے اور پیالے میں صرف تھوڑی سی تلچھٹ باقی ہے۔ اب رات کے ساز و سامان میں سے باقی رہ گیا گیا ہے کہ وہ محبوب بن کر آگیا ہے۔

''تا خود از شب چہ ماند'' کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اب رات بھی گزرنے والی ہے، اب وہ آیا تو کیا آیا۔

شاهد و می زمیان رفتہ و شادم بہ سخن

کشتہ ام بید درین باغ کہ ویران شدہ است

معشوق اور شراب دونوں نہیں رہے اور میں شعر وسخن سے خوش ہوں۔ میں نے بید بویا ہے اور ایک ایسے باغ میں بویا ہے جو ویران ہو چکا ہے، یعنی میں ایسے دور میں مشقِ سخن کر رہا ہوں جو زوال زدہ ہے۔

شہرتم گر بہ مثل مائدہ گردد، بینی

کہ بر آن مائدہ خورشید نمکدان شدہ است

اگر میری شہرت، مثال کے طور پر، دسترخوان کی صورت اختیار کر لے تو اس دستران پر خورشید کی حیثیت ایک نمکداں کی ہوگی۔

یعنی میری شخصیت کی عظمت کے آگے کائنات کی بڑی سے بڑی شے کیا حیثیت رکھتی ہے۔

غالب آزردہ سروشی است کہ از مستی قرب

ھم بدان وحی کہ آوردہ غزل خوان شدہ است

لغت: ''سروش'' = فرشتۂ غیبی اصل میں اس فرشتے کو کہتے تھے جو ایران کے قدیم پیغمبر زرتشت کے پاس وحی لے کر آتا تھے۔ جبریل۔

غالب وہ آزردہ حال فرشتہ ہے کہ اس قرب مقام سے اتنا بدمست ہوگیا ہے کہ جو وحی وہ لے کر آیا تھا اسی کو غزل خوانی کا رنگ دے دیا۔

گویا مرزا غالب کی شاعری بمنزلہ وحی کے ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اس شعر میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ مرزا غالب کے لیے شاعری اور غزل گوئی اس کی اصل شخصیت کی عظمت کے آگے حقیر ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر(۲۹)

فغان کہ برق عتاب تو آنچنانم سوخت

کہ راز در دل و مغز اندر استخوانم سوخت

الامان! تیری برق عتاب نے مجھے اس طرح جلا دیا کہ دل کا راز دل میں جل کر رہ گیا اور میری ہڈیوں کا مغز تک جل گیا۔

محبوب کے غصے کی آگ نے تن بدن کو جلا دیا۔

شنیدہ کہ بآتش نہ سوخت ابراهیم

بہ بین کہ بی شرر و شعلہ می توانم سوخت

تو نے سنا ہے کہ حضرت ابراہیم آگ میں نہیں جلے تھے۔ مجھے دیکھ کہ میں بغیر شعلہ کے جل سکتا ہوں۔ (یا مجھے بغیر شرر اور شعلے کے جلایا جا سکتا ہے)۔

محبت کی آگ میں چنگاریاں اور شعلے نہیں ہوتے لیکن عاشقوں کو جلا دیتی ہے۔

شرار آتش زردشت در نهادم بود

کہ هم بہ داغ مغان شیوه دلبرانم سوخت

لغت: ''زردشت کے پیروکار آتش پرست ہوتے ہیں۔ ان کے معبدوں میں ہمیشہ آگ جلتی رہتی ہے۔ مغاں (مغ کی جمع) آتش پرستوں کے لیے آتا ہے چونکہ ان کے یہاں شراب پینا جائز تھا اس لیے مغاں کا لفظ مے سازوں اور مے خواروں کے لیے استعمال ہونے لگا اور فارسی اور اردو شاعری میں ایک علامت بن گیا۔ ''پیر مغاں'' پیر میخانہ بھی ہے اور پیر طریقت بھی۔

''نہاد'' = طینت، فطرت ''مغاں شیوہ دلبراں'' ایسے محبوب جن کا شیوہ مغاں کا سا ہے۔ کافرانہ ناز و ادا رکھنے والا۔

زرتشت کی آگ کی چنگاریاں میری طینت میں بھی تھیں۔ یہی وجہ ہے میں مغاں شیوہ دلبروں کے داغ محبت ہی سے جل گیا۔

آگ میری طینت میں تھی، ذرا سے داغ نے جلا ڈالا۔

عیار جلوهٔ نازش گرفتن ارزانی

هزار بار بہ تقریب امتحانم سوخت

لغت: ''ارزانی'' = گرانی کی ضد تھا، پھر اس کے معنی ارزاں یا کم بہا کے ہو گئے
''عیار'' جانچنا اندازہ کرنا۔ جانچ اور پرکھ عیار گرفتن پرکھنا۔

میں نے محبوب کے جلوۂ ناز کو معمولی سمجھا تھا چنانچہ میں اس امتحان میں ہزار بار جل گیا۔ محبوب کے جلووں کی تاب لانا کوئی آسان کام نہیں، جو سامنے آتا ہے جل جاتا ہے۔

مرا دمیدن گل در گمان فگند امروز
کہ باز بر سر شاخ گل آشیانم سوخت

آج جب سرخ سرخ پھول کھلے تو مجھے ایسا گمان ہوا کہ شاخ گل پہ میرا آشیانہ جل رہا ہے۔ سرخ پھولوں کو جلتے ہوئے آشیانے سے تشبیہ دی ہے۔

ز گلفروش نالم کز اهل بازار است
تپاک گرمی رفتار باغبانم سوخت

لغت: ''تپاک'' = بخار (گرمجوشی)

میں گلفروش سے نالاں نہیں ہوں کہ وہ اہل بازار ہے (اس کا کیا شکوہ)۔ مجھے تو باغبان کی گرمی رفتار کی تپش نے جلا دیا ہے۔

چہ مایہ گرم برون آمدی زخلوت غیر
کہ شکوہ در دل و پیغارہ بر زبانم سوخت

تو رقیب کی خلوت سے یوں گرمجوشی کے عالم میں باہر آیا کہ میری شکایتیں میرے دل میں اور طعنے زباں پر آ کر جل گئے (یعنی سبھی دب کر رہ گئے)۔

چو وا رسید فلک کآب در متاعم نیست
ز جوش گرمی بازار من دکانم سوخت

جب آسمان کو اس راز کا پتا چلا کہ میری متاع دکان میں پانی نہیں ہے تو اس نے میرے بازار کی گرمی کی تیزی سے میری دکان کو جلا دیا۔

مرزا غالب کے متاعِ سخن کی گرم بازاری (شہرت) تھی۔ آسمان کو یہ بات گوارا نہ ہوئی چنانچہ ان کی گرم بازاری ہی ان کی تباہی کا سبب بن گئی۔ ان کے پاس اس آگ کو بجھانے کا کوئی سامان نہ تھا۔

نفس گداختگی های شوق را نازم
چہ شمعها بہ سرا پردۂ بیانم سوخت

شوق کی آگ نے میرے سانس کو بھی گداز کر دیا ہے اور میں اس گداز نفس پر ناز کرتا ہوں کہ اس نے میرے بیان کے پردوں میں کیسی کیسی شمعیں روشن کر رکھی ہیں۔

دل گداختہ اور نفس گداختن ہونا بڑی بات ہے لیکن اگر یہ نصیب ہو جائے تو شمع سخن چمک اٹھتی ہے:

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

نوید آمدنت رشک از قفا دارد
شگفتہ روئی گلهای بوستانم سوخت

لغت: ''قفا'' = پیچھے۔ ''نوید'' = خوش خبری۔

تیرے آنے کی خوشخبری میں ایک رشک کا پہلو بھی ہے۔ تیرے آنے سے باغ کے پھول شگفتہ ہوگئے ہیں اور میں ان کی شگفتگی دیکھ کر (رشک سے) جل گیا ہوں۔

کسی درین کف خاکسترم مباد انباز
چہ شد گر آتش همسایہ خانمانم سوخت

لغت: ''انباز'' = شریک، ساتھی یہ ہم بازی بدلی ہوئی صورت ہے۔ دو دوست جو ایک دوسرے کے ساتھ کھیلے ہوں، ہمباز کہلاتے ہیں۔ ''خانماں'' خانہ وساماں کا مخفف۔ گھر اور گھر کا ساز وسامان، گھر بار۔

اگر ہمسائے کی آگ نے میرا گھر بار جلا ڈالا تو کیا ہوا۔ اللہ کرے اب اس مٹھی بھر راکھ میں (جو باقی رہ گئی ہے) میں! کوئی شریک نہ ہو۔

یہ شعر مرزا غالب کے ان شعروں کی آئینہ داری کرتا ہے:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہمزباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

مگر پیام عتابی رسیدہ است بہ من
شکستہ رنگی یاران رازدانم سوخت

لغت: ''شکستہ رنگی'' = اڑے ہوئے رنگ کی حالت۔

شاید (میرے دوست کی طرف سے) کوئی عتاب آمیز پیام آیا ہے۔ میرے راز داں دوستوں کے چہروں کے رنگ اڑے ہوئے ہیں اور ان کی اس حالت نے مار ڈالا ہے۔

محبوب کی طرف سے کوئی ایسا مایوس کن پیغام ہے جو عاشق کے راز داں دوستوں کو معلوم ہے اور وہ پریشاں ہیں۔ ان کی پریشاں حالی سے عاشق راز کو پا گیا ہے اور آزردہ ہے۔

خبر دهید بہ قاتل کہ هجر می کشدم
ز ماهتاب چہ منت برم کتانم سوخت

لغت: ''کتان'' = ایک کپڑا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ چاندنی میں پھٹ جاتا ہے۔
میرے قاتل کو کہہ دو کہ تو اب میرے قتل کی زحمت گوارا نہ کر، ہجر ہی مجھے مار رہا ہے۔
اب چاندنی کے احسان اٹھانے کی کیا حاجت، میرا کتان ہی جل چکا ہے۔

سخن چہ عطر شرر بر دماغ زد غالب
کہ تاب عطسہ اندیشہ مغز جانم سوخت

لغت: ''عطسہ'' = چھینک۔ ''تاب'' گرمی ''سخن'' شعر، شاعری۔
تیز خوشبو سونگھنے سے چھینک آ جاتی ہے۔
شاعر کہتا ہے: غالب فن شعر (سخن) نے میرے دماغ میں کیسا آتشیں عطر ڈال دیا ہے کہ میرے تخیل کو چھینکیں آنے لگی ہیں اور ان چھینکوں کی تاب نے میرے مغز جاں کو جلا دیا ہے۔ یعنی شعر نے میرے تخیل میں ہنگامہ پیدا کیا ہوا ہے اور اس ہنگامے کی گرمی سے جل رہا ہوں۔

❀❀❀

غزل نمبر(۳۰)

گفتم بروز گار سخنور چومن بسی است

گفتند اندرین کہ تو گفتی سخن بسی است

میں نے کہا، زمانے میں میرے جیسے بہت سے سخنور ہیں۔ کہنے لگے، یہ جو کچھ تو نے کہا، اس کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

شاعر نے تو بڑے انکسار سے کہا کہ مجھے اپنے پہ کوئی خاص گھمنڈ نہیں، میرے جیسے اور بھی بہت سے شاعر دنیا میں ہیں مگر جواب بڑا پہلو دار ہے۔ ایک پہلو تو یہی ہے کہ تو شاعر بھی ہے کہ نہیں اور اگر ہے تو پھر کیا اور تجھ جیسے اور بھی ہیں تو ہوں گے۔

یہ شعر مرزا غالب کی شوخ کلام کی ایک مثال ہے۔

معنی، غریب مدعی و خانہ زاد ماست

ھر جا عقیق نادر و اندر یمن بسی است

لغت: ''مدعی'' = دعویٰ کرنے والا، حریف مقابل۔ اس کے معنے رقیب کے بھی ہوتے ہیں۔

''خانہ زاد'' = جو گھر میں پیدا ہوا ہو، گھر کا غلام، گھر کی لونڈی۔

''معنی'' = نکتہ آفرینی، شعر گوئی، نغز گوئی۔

شعر میں نکتہ آفرینی، ہمارے حریف کے لیے ایک اجنبی کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ ہمارے گھر کی لونڈی ہے۔ عقیق ہر جگہ نادر اور نایاب ہے لیکن یمن میں کثرت سے ملتا ہے۔

یعنی ہماری ذات معنی آفرینی میں یکتا ہے اور عقیق سخن پیدا کرنے میں یمن کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا مقابل ہمارا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔

مشکیں غزالہ ھا کہ نہ بینی بہ ھیچ دشت

در مرغزار ھای ختا و ختن بسی است

مشک پیدا کرنے والی ہرنیاں جو تجھے کسی جنگل میں نظر نہ آئیں گی، ختا اور ختن کے میدانوں اور چراگاہوں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

در صفحہ نبودم ھمہٴ آنچہ در دل است

در بزم کمتر است گل و در چمن بسی است

جو کچھ ہمارے دل میں ہے وہ سب صفحہ قرطاس پہ نہیں آ سکتا۔ محفلوں میں پھول تھوڑے ہوتے ہیں، چمن ان کا اصلی مقام ہے۔ وہاں ان کی کثرت دیکھیے۔

لیلیٰ بدشت قیس رسید است ناگھان

در کاروان جمازہٴ محمل فگن بسی است

لیلیٰ دشت قیس (مجنوں) میں اتفاقاً آ پہنچی ہے۔ ورنہ تو قافلے میں محمل کو گرا دینے والی اونٹنیاں بہت ہیں۔

بعض اونٹنیاں یا سواری کے جانور، تیز چل کر، یا بگڑ کر محمل کو گرا دیتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ قافلے میں منہ زور اونٹنیاں بہت تھیں۔ اب لیلیٰ جو دشت قیس میں آ پہنچی ہے تو اسے قیس ہی کا جذب عشق کہنا چاہیے۔

باید به غم نخوردن عاشق معاف داشت

آن را که دل ربودن و نشناختن بسی است

لغت: ''غم نخوردن'' = عاشق کا غم نہ کھانا، اس کی پروانہ کرنا۔ ''معاف داشتن'' = در گزر کرنا، معاف کر دینا۔

اس شخص کو جس میں لوگوں کے دل چھیننے اور پھر انھیں درخور اعتنا ہی نہ سمجھنے کی عادت کوٹ کوٹ کر بھری ہے، اگر وہ عاشق کا غم نہیں کھاتا تو اسے معاف کر دینا چاہیے (بے نیاز انسان ہے)۔

زور شراب جلوۂ بت کم شمردہ ایم

اما نظر به حوصلۂ برهمن بسی است

لغت: ''کم شمردن'' معمولی خیال کرنا۔

ہم اس بات کی طرف دھیان نہیں دیتے کہ صنم کے جلوے کی شراب کتنی پرزور اور مست کر دینے والی ہے۔ ہماری نظر برہمن پر پڑتی ہے کہ اس کا کتنا بڑا حوصلہ ہے کہ بتوں میں گھرا ہوا ہے اور ان کے جلوؤں کے تاب لائے جا رہا ہے۔ عشق کے سارے حوصلے معشوق کے مسحور کن حسن کی کرامات ہیں۔

گر در هوای قرب تو بستیم دل، مرنج

خود ناکشوده جای درآن انجمن بسی است

لغت: دستور ہوتا ہے کہ جب کوئی مہمان کسی محفل میں آتا ہے تو اُس کے لیے پہلے سے جو لوگ آ کے بیٹھے ہوتے ہیں، وہ خود سکڑ کے اُس کے لیے جگہ کھول دیتے ہیں سوائے اس

شخص کے لیے جو ناخواندہ مہمان ہو یا اہل نہ ہو۔ ایسا شخص ''ناکشودہ جا'' ہوتا ہے۔

کہتا ہے کہ ہم نے اگر تیرے قریب آنے کی آرزو کی ہے تو تو کیوں خفا ہو رہا ہے۔ ہم جیسے تو تیری محفل میں بہت سے ہیں جن کے لیے وہاں گنجائش نہیں۔ ایک میں بھی ہو گیا تو پھر کیا۔

تاثیر آه و ناله مسلّم ولی مترس

مارا هنوز عربده با خویشتن بسی است

لغت: ''عربدہ'' = اُلجھنا۔ جنگ کرنا۔

یہ مان لیا کہ آہ و نالہ میں اثر ہوتا ہے لیکن تو کیوں ڈرتا ہے۔ ابھی تو ہم اپنے آپ سے الجھے ہوئے ہیں، اسی سے عہدہ برآ نہیں ہوئے۔ گویا ابھی ہماری فریادیں تو ہمارے اپنے دکھڑوں کے باعث ہیں۔ ان سے فارغ ہوں گے تو تم سے بھی نبٹ لیں گے۔

غالب نخوردہ چرخ فریب از هزار بار

گفتم به روزگار سخنور چومن بسی است

اے غالب میں نے ہزار بار کہا کہ زمانے میں میرے جیسے بہت سے سخنور ہیں۔ لیکن آسماں میرے فریب میں نہ آیا۔ آسماں کا اہل کمال پر ستم ڈھانا، مشہور ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مجھ پر اگر اس لیے ستم ڈھایا جا رہا ہے کہ میں سخنور ہوں تو دنیا میں اور بھی تو سخنور ہیں، ادھر یہ آفت کیوں نازل نہیں ہوتی۔

❁❁❁

غزل نمبر(۳۱)

چو صبحِ منِ ز سیاهی بشام مانند است
چگوئی ام که زشب چند رفت یا چند است

جب میری صبح بھی، سیاہ ہونے کے باعث شام کی طرح ہے تو پھر تو مجھ سے یہ کیوں پوچھتا ہے کہ رات کتنی گزر چکی ہے اور کتنی باقی ہے۔
جب صبح بھی تاریک ہی ہو تو پھر رات گزرنے کا کیا سوال۔

به رنج از پی راحت نگاهداشته اند
زحکمت است که پای شکسته در بند است

دکھ راحت ہی کے لیے برداشت کیے جاتے ہیں۔ دیکھو ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو جو پٹی سے باندھا جاتا ہے (اور اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس میں (یہی) حکمت پوشیدہ ہے۔

دراز دستی من چاکی از فگند چه عیب
ز پیش، دلق ورع، هزار پیوند است

لغت: "دلق" = گدڑی۔ "ورع" = زہد و پرہیزگاری "زپیش" = پہلے ہی سے۔
دلق یا گدڑی، ایسا لباس ہے کہ وہ جہاں سے پھٹتا ہے اس میں ایک پیوند لگا دیتے ہیں گویا وہ مسلسل چاک و پیوند ہوتی ہے۔
زہد و پرہیزگاری کی گدڑی میں تو پہلے ہی سے کئی پیوند لگے ہوئے ہیں۔ اگر میری

درازدستی نے اس میں کوئی ایک اور چاک کا اضافہ کر دیا تو اس میں کیا عیب ہے۔
گویا دلق ورع لباس ہی ایسا ہے کہ اسے چاک کیا جا ہیے

نه گفتهٔ که به تلخی بساز و پند پذیر
برو که بادهٔ ما تلخ تر ازین پند است

تو نے خود ہی نہیں کہا کہ تلخی اور سختی برداشت کر لے اور نصیحت کو قبول کر لے۔ جا، کہ ہماری شراب (تلخ) نصیحت سے زیادہ تلخ ہے۔ اگر تلخی ہی گوارا کرنی ہے تو تلخی شراب کیوں نہ گوارا کی جائے۔

وجود اُو همه حسن است و هستی ام همه عشق
به بخت دشمن و اقبال دوست سوگند است

دشمن و دوست دونوں کے بخت و اقبال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے محبوب کی ذات سرتاپا حسن ہے اور میری ہستی سراسر عشق ہے۔

نگاه مهر به دل سرنداده چشمه نوش
هنوز عیش باندازهٔ شکر خند است

ابھی محبوب کی نگاہ محبت سے (لذتوں کا) میٹھا چشمہ بہہ کر ہمارے دل میں نہیں گرا۔
ابھی تو ہماری لذت خوشی (عیش) اس کی میٹھی سی ہنسی کے اثر تک محدود ہے۔
ابھی تو محبوب نے ادا سے مسکرا کر ہمیں دیکھا ہے۔ ابھی اس کی محبت آمیز نظریں ہمارے دل میں نہیں اتریں۔

ز بیم آن کہ مباد ا بہ میرم از شادی

نگوید ار چہ بمرگ من آرزومند است

اگر چہ میرا محبوب میری موت کا آرزومند ہے تاہم منہ سے کہتا نہیں۔ ڈرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ میں یہ بات سن کر خوشی سے جان نہ دے دوں۔

شمارِ کجروی دوست در نظر دارم

درین نورد ندانم کہ آسمان چند است

آسمان کجرو ہوتا ہے کہ وہ انسانی خواہشات کے خلاف گردش کرتا ہے۔ معشوق کجرو ہے کہ وہ عاشق کی تمنا کے برعکس چلتا ہے۔ مرزا غالب کہتے ہیں:

میں تو صرف دوست کی کجرویاں گن رہا ہوں اور اسی میں مصروف ہوں ۔ مجھے معلوم نہیں اس لپیٹ میں، آسمان کا کتنا ہاتھ ہے۔

مرزا غالب اپنی مصائب میں جو بے شمار ہیں، صرف محبوب کے جور وستم کا شمار کر رہے ہیں۔ نہ جانے آسماں کی کتنی دشمنیاں اس سلسلے میں شامل ہیں۔

اگر نہ بھر من از بھر خود عزیزم دار

کہ بندہ خوبی اُو خوبی خداوند است

اگر میرے لیے نہیں تو اپنے لیے ہی مجھ پر مہربان ہو (اور میری ذاتی خوبیوں پر نظر ڈال) کیونکہ اگر غلام میں کوئی خوبی ہو تو وہ آقا ہی کی خوبی شمار ہوتی ہے۔

نہ آن بود کہ وفا خواهد از جهان غالب

بدین کہ پرسد و گویند هست، خورسند است

غالب دنیا سے کوئی زیادہ وفا کا خواہش مند نہیں۔ فقط اتنا چاہتا ہے کہ محبوب (میرا حال) پوچھے تو لوگ یہ کہ دیں ہاں زندہ (ہست) ہے۔ غالب اسی میں خوش ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر(۳۲)

ساخت زراستی بہ غیر، ترکِ فسون گری گرفت

زہرہ بطالعِ عدو، شیوهٔ مشتری گرفت

لغت: ''فسون گری'' = کسی پر جادو کرنا، مسحور کرنا۔ ''ترک گرفتن'' = کسی کام کو چھوڑ دینا۔

''غیر'' = مراد رقیب۔ ''عدو'' = اسی مفہوم میں آیا ہے۔

''زہرہ و مشتری'' = دو مبارک ستارے۔ جب یہ سیارے ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں تو اس وقت بڑا مبارک خیال کیا جاتا ہے اسے قران السعدین کہا جاتا ہے۔

محبوب نے بڑے صدق دل سے رقیب سے موافقت کر لی اور ظاہرا ناز و ادا سے اسے مسحور کرنا چھوڑ دیا۔ یوں کہنا چاہئے کہ زہرہ نے ہمارے رقیب کے نصیبے میں مشتری کا کردار ادا کیا۔

یعنی یہ رقیب کی خوش نصیبی کی علامت ہے کہ محبوب بڑی سچائی کے ساتھ اظہار محبت کرنے لگا ہے۔

شہ بہ گدا کجا رسد، زانکہ چو فتنہ روی داد

خاتم دست دیو برد، کشورِ دل پری گرفت

بادشاہ گدا تک کیسے پہنچ سکتا ہے، اس لیے کہ جب کوئی فتنہ بپا ہوتا ہے تو شاہی ہاتھ کی انگوٹھی، دیو چھین کر لے جاتا ہے اور دل کی سلطنت پر پری قبضہ کر لیتی ہے۔

حضرت سلیمان کی انگوٹھی (خاتم جم) دیو نے چرالی تھی اور ان کے دل پر ملکۂ سبا کی شہرت حسن کا اثر ہوا تھا۔

ترک مرا زگیرو دار شغل غرض بود نہ سود
فربہ اگر نہ یافت صید، خردہ بہ لاغری گرفت

لغت: ''ترک'' = مراد محبوب ہے۔
''گیر و دار'' = پکڑ دھکڑ محاسبہ کرنا۔ ''خردہ گرفتن'' = نقص نکالنا۔ چھوٹے چھوٹے عیب نکالنا گیرودار ہے۔

ہمارے (جابر) محبوب کی غرض و غایت محض ایک مشغلہ ہے کوئی فائدہ مقصود نہیں۔
(وہ ایک ایسا شکاری ہے) کہ اگر اس کے ہاتھ میں کوئی موٹا شکار نہ آئے (دبلا ہو) تو وہ اس کے دبلے پن پر نکتہ چینی کرتا ہے۔

دبلے پن پہ حرف گیری کرنے کے لیے خردہ گیری کے الفاظ استعمال کرنا بے حد موزوں ہے۔

آمد و ازرہ غرور بوسہ بہ خلوتم نداد
رفت و در انجمن زغیر مزد نواگری گرفت

وہ آیا اور عالم غرور میں ہماری خلوت کو بوسہ تک نہ دیا۔ (ادھر یہ حالت ہے) کہ بھری محفل میں چلا گیا، نواگری کی اور اپنی نواگری کا صلہ رقیب سے قبول کر لیا۔ یعنی عاشق کی ایک با

عزت دعوت کو ٹھکرا دیا اور رقیب کی خاطر ایک بے وقار ماحول میں چلا گیا۔

ای کہ دلت زغصہ سوخت، شکوہ نہ درخور وفاست
ور سزد آنکہ سر کنی گیر کہ سرسری گرفت

لغت: ''غصہ'' = فارسی میں انتہائے غم واندوہ کے لیے آتا ہے۔ ''سر کردن'' = اظہار کرنا۔
''سرسری گرفتن'' کسی بات کو بالکل سرسری سمجھنا، درخور اعتنا ہی نہ سمجھنا۔

اگر چہ تیرا دل غم سے نڈھال ہو گیا ہے پھر بھی شکوہ کرنا وفا کے شایان شان نہیں اور اگر اس کے اظہار کرنے کے لیے (تجھے محسوس ہو کہ) مناسب موقع ہاتھ آیا ہے تو یہ سمجھ لے معشوق نے اسے (دل سے نہیں) محض ایک بے معنی سی بات سمجھ کے سنا اور ٹال دیا۔

جادہ شناس کوی خصم بودم و دوست راہ جوی
منکر ذوق ھم رھی خردہ بہ رھبری گرفت

لغت: ''جادہ شناس'' = راستے سے واقف۔ ''خصم'' = دشمن، رقیب۔
''راہ جلوے'' = جسے رستے کی تلاش ہو۔ ''ہمرہی'' = ہمراہ ہونا ساتھ۔

میں رقیب (خصم) کے کوچے کے راستے سے آشنا تھا اور محبوب (دوست) کو اس راستے کی تلاش تھی۔ لیکن وہ کسی کے ساتھ چلنے کی لذت سے منکر تھا، اس نے میری رہنمائی پر سخت اعتراض کیا۔

مستی مرغ صبحدم بر رخ گل، بوی تست
ھرزہ زشرمِ باغباں، جبھہ گل تری گرفت

لغت: ''جبہہ'' = پیشانی۔ ''برزہ'' = بے فائدہ۔ ''تری گرفتن'' = تر ہونا (پھول کے شبنم آلودہ ہونے کی طرف اشارہ ہے)

پھول کے روبرو مرغ سحری پر جو مستی طاری تھی وہ تیری (محبوب) یاد میں تھی۔ (پھول یہ سمجھا کہ یہ مستی اس کی وجہ سے ہے۔) چنانچہ وہ شرما گیا کہ باغبان کیا کہے گا اور اس خیال سے اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔

شاعر نے ایک شبنم زدہ پھول پر صبح کے وقت بلبل کے چہچہانے کی ایک حسین توجیہ پیش کی ہے۔

رای زدم کہ بار غم ھم کہ رقم ز دل رود
نامہ چون بستمش بہ بال، مرغ سبک پری گرفت

سدھائے ہوئے پرندوں کے پروں میں خط باندھ کر پیغام بھیجے جاتے ہیں جنھیں مرغان نامہ بر کہا جاتا ہے۔ ''رقم'' = تحریر، مضمون نامہ۔ ''سبک پری'' = ہلکا اُڑنا۔

میرا خیال تھا کہ خط میں اپنا حال لکھ کر میرے غم کا بوجھ دل سے دور ہو جائے گا (چنانچہ ایسا ہی ہوا) جونہی میں نے خط پرندے کے پروں میں باندھا وہ ہوا میں تیرنے لگا۔

غالب اگر بہ بزم شعر دیر رسید دور نیست
کش بفراق حسرتی دل ز سخنوری گرفت

لغت: ''دل از چیزے گرفتن = کسی چیز سے بے زار ہو جانا۔

''حسرتی'' = شیفتہ۔ نواب مصطفی خان شیفتہ فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔

وہ مرزا غالب کے بڑے گہرے دوست تھے اور ان سے مشورۂ سخن بھی کرتے تھے۔

ان کی وفات سے مرزا صاحب کو بڑا قلق ہوا تھا۔ اس شعر میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

اگر غالب بزم شعر میں دیر سے پہنچا تو کوئی عجیب بات نہیں۔ اس کا دل حسرتی کے فراق (کے غم) میں شعر و شاعری سے اچاٹ ہو گیا ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۳۳)

دل بردن از ین شیوہ عیان است و عیان نیست
دانی کہ مرا بر تو گمان است و گمان نیست

میرے دل کو اس ناز و انداز سے چھین لینا عیاں ہے اور عیاں نہیں بھی ہے۔ تو جانتا ہے کہ مجھے تجھ پر اس بات کا شبہ ہے اور یہ شبہ نہیں بھی ہو سکتا۔

در عرض غمت پیکر اندیشہ لالم
پا تا سرم انداز بیان است و بیان نیست

لغت: ''اندیشہ'' = فکر و خیال، مجازاً بیم و ہراس۔ ''عرض'' = پیش کرنا' ظاہر کرنا۔

''لال'' = گنگ اردو میں بھی انہی معنوں میں آتا ہے، مثلاً زبان لال۔

تیرے غم کو ظاہر کرنے میں ایک خاموش مجسمہ خیال ہوں۔ میں سر سے پاؤں تک انداز بیان ہوں اور بیان کہیں ہے نہیں۔

یعنی ظاہری صورت سے میرے دل کا حال صاف صاف بیان ہو رہا ہے اگر چہ اس

بیان کی صورت بیان کی سی نہیں ہے:

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

فرمان تو بر جان من و کار من از تو

بی پردہ بہ ھر پردہ روان است و روان نیست

لغت: ''روان'' = جاری یہ لفظ اس شعر میں دو چیزوں کے لیے آیا ہے۔ ''فرماں جاری شدن'' یعنی فرماں کا جاری ہونا یا صادر ہونا اور ''کار رواں شدن'' یعنی کام کارواں ہونا جو کام کے رکنے یا نہ ہونے کی ضد ہے۔

''بے پردہ'' = علانیہ۔ ظاہری طور پر۔ ''بہ ہر پردہ'' = ہر باطنی اور خفیہ انداز میں۔

دوسرے مصرعے میں ''روان است'' فرمان کے لیے اور ''روان نیست'' کار (کام) کے لیے آیا ہے یعنی فرمان جاری و ساری ہے اور ظاہر میں اور پوشیدہ طور پر جاری و ساری ہے۔ لیکن تیرے ہاتھوں میرا کام رواں نہیں ہوتا، یعنی حسن کے فرمان تو مجھ پہ نازل ہو رہے ہیں اور میں سرتاپا امتثال امر بنا ہوا ہوں لیکن حسن ہماری کسی ایک خواہش کو پورا نہیں کر رہا۔

اس شعر کا خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو زیادہ موزوں ہوگا۔

نازم بہ فریبی کہ دھی اھل نظر را

کر بوسہ پیامی بہ دھان است و دھان نیست

شعرا جس طرح محبوب کی کمر کو اتنا نازک دکھاتے ہیں کہ گویا اس کا کوئی وجود ہی نہیں اسی طرح معشوق کے دہن تنگ کو بھی یوں ہی دکھاتے ہیں۔ مرزا غالب نے اس نازک بیانی سے عجب کام لیا ہے۔ کہتے ہیں:

تو اہل نظر کو جو فریب دے رہا ہے میں اس کی داد دیتا ہوں۔ تیرے دہن سے ان کو پیام بوسہ تو ملتا ہے لیکن دہن کا وجود نہیں۔

شاعر کے مدنظر معشوق کے دہن تنگ کی کشش کو دکھانا ہے جسے دیکھ کر بے ساختہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔

داغیم ز گلشن کہ بھار است و بقا نیست

شادیم بہ گلخن کہ خزان است خزان نیست

لغت: ''گلخن'' = آتشدان، بھٹی۔ اصل میں گل اور خن کا مرکب ہے۔ گل، ترکی میں خاکستر ہے اور خن، خانہ کا مخفف ہے۔ گلخن یعنی خاکستر خانہ۔

ہم اس گلشن سے جل گئے کہ جو سرتاپا بہار تو ہے لیکن اس میں بقا نہیں اور گلخن سے خوش ہیں کہ بظاہر خزاں ہے لیکن خزاں بھی نہیں، یعنی اس کی خزاں نہیں ہوتی۔ وہ ایک حالت پہ رہتا ہے۔

سرمایۂ ھر قطرہ کہ گم گشت بہ دریا

سودی است کہ مانا بہ زیان است و زیان نیست

لغت: ''مانا'' = ملتا جلتا، مانا میں الف آخر فاعلی ہے، ملنے جلنے والا جیسے دانا کا الف آخر یعنی جاننے والا۔

ہر اس قطرے کا سرمایہ جو سمندر میں گم ہو گیا، ایک سود (نفع) ہے جو بظاہر زیاں نظر آتا ہے لیکن زیاں نہیں ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

قطرہ سمندر میں غرق ہو کر بظاہر اپنا وجود کھو دیتا ہے لیکن حقیقت میں وہ قطرے سے سمندر بن جاتا ہے۔

درھر مژہ برھم زدن این خلق جدید است

نظارہ سگالد کہ ھمان است و ھمان نیست

ہر بار آنکھ کے جھپکنے میں یہ کائنات نئی ہوتی ہے۔ ہماری نظریں سمجھتی ہیں کہ یہ کائنات وہی ہے لیکن وہی نہیں ہوتی۔

اس شعر میں مرزا غالب نے ایک نہایت ہی دقیق نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے۔ انسان اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ مشاہدے اور تجربے سے بدلتا رہتا ہے۔ اور اس بدلنے پر جب وہ کائنات کو دیکھتا ہے تو وہ بظاہر وہی نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں وہ نہیں ہوتی۔

ایک معمولی سی مثال سے قیاس کر لیجئے۔ فرض کیا ہم نے ایک چیز کو پہلی دفعہ دیکھا، اس کے بعد ہم نے آنکھ جھپکائی اور پھر اس پر نظر پڑی۔ اب کے وہ چیز وہ نہیں ہے جو ایک لحظہ پہلے ہم نے دیکھی۔ اب کے اس کے ادراک میں یہ تجربہ بھی شامل ہو گیا ہے کہ یہ وہ چیز ہے جسے ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ اسی طرح وہ ہر بار دیکھنے پر بدلتی چلی جائے گی۔ پھر کائنات خود بھی تغیر پذیر ہے اگرچہ وہ تغیر نمایاں طور پر نظر نہیں آتا۔

درشاخ بود موج گل از جوش بھاران

چون بادہ بہ مینا کہ نھان است و نھان نیست

بہار آتی ہے تو شاخوں پہ پھول نکل آتے ہیں لیکن پھول بننے سے پہلے ان کا نمو شاخوں میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ وہ نظر نہیں آتا لیکن دیکھیں تو نظر بھی آتا ہے شاعر کہتا ہے:

جوشِ بہار سے موجِ گل شاخ میں موجود ہوتی ہے، اس شراب کی طرح کہ جو شیشۂ

ے میں چھپی بھی ہوتی ہے اور چھپی ہوئی نہیں بھی ہوتی۔

ناکس ز تنومندی ظاھر نشود کس

چون سنگ سرہ گران است و گران نیست

ایک ناکس (گھٹیا) انسان ظاہرا تنومندی سے کس (عظیم) نہیں بن سکتا، اس راستے کے پتھر کی طرح کہ بھاری تو ہوتا ہے لیکن گراں نہیں ہوتا (یعنی اس کی قدر و اہمیت کچھ نہیں ہوتی)۔

انسان کو اس کی ظاہرا نمود و نمائش، بڑا انسان نہیں بناتی۔ بڑا انسان بننے کے لیے اعلیٰ کردار اور بلند شخصیت درکار ہوتی ہے۔

پھلو بشگافید و بہ بینید دلم را

تا چند بگویم کہ چسان است و چسان نیست

میرے پہلو کو چیر ڈالو اور میرے دل کو دیکھ لو۔ میں کب تک کہتا رہوں گا کہ میرا دل کیسا ہے کیسا نہیں ہے۔

غالب ھلہ نظارگی خویش توان بود

زین پردہ برون آ کہ چنان است و چنان نیست

لغت: ''نظارگی'' = نظارہ سے اسم فاعلی ہے جیسے پردگی۔ نظارگی نظارہ کرنے والا اور پردگی پردہ کرنے والا، پردے میں بیٹھنے والا۔ ان کی ''ی'' فاعلی کہلاتی ہے۔

غالب! اپنا نظارہ آپ کیا جا سکتا ہے۔ اس پردے سے باہر آ جا کہ ایسا ہے، ایسا نہیں ہے۔

انسان اپنی ذات کی کنہ کے بارے میں قیاس کرتا رہتا ہے لیکن یہ نکتہ قیاس آرائیوں

اور حکمت طرازیوں اور دلائل سے حل نہیں ہوتا۔ ایسا کرنے سے انسان گویا پردے میں پڑا رہتا ہے۔ البتہ اگر انسان چاہے تو اپنے آپ سے باہر آ کر اپنا نظارہ میسر آ سکتا ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر (۳۴)

دل برد و حق آن است کہ دلبر نتوان گفت
بیداد توان دید و ستمگر نتوان گفت

وہ دل چھین کے لے گیا لیکن حق بات تو یہ ہے کہ اسے دلبر (دل چھیننے والا) کہہ بھی نہیں سکتے (کیونکہ اس کا کوئی ظاہری ثبوت بھی نہیں) اس کے جور و ستم (بیداد) تو دیکھ سکتے ہیں (نظر آتے ہیں) لیکن اسے ستمگر نہیں کہا جا سکتا (کیونکہ محبت میں ستم نہیں ہوتا)۔

در رزم گہ اش ناچخ و خنجر نتوان برد
در بزم گہ اش بادہ و ساغر نتوان گفت

لغت: ''ناچخ'' = تبر، چھوٹی کلہاڑی، جسے تبرزین بھی کہتے تھے کیونکہ اس گھوڑے کی زین کے ساتھ لٹکا کے رکھتے تھے۔ آلات جنگ میں سے ایک۔

اس کی رزمگاہ میں (جہاں حسن، عشق سے برسرِ پیکار ہوتا ہے) تبر اور خنجر سے کام نہیں چلتا، کیونکہ وہاں تو غمزہ و عشوہ کے وار ہوتے ہیں۔ اس کی بزم گہ میں (جہاں محبت کی گرمجوشیوں کا نشہ ہوتا ہے) شراب اور جام کا نام نہیں لیا جاتا (وہاں تو جام و مے کے بغیر ہی سرور طاری ہوتا ہے)

غالب:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

رخشندگی ساعد و گردن نتوان جست
زی بندگی یارہ و پرگر نتوان گفت

لغت: ''ساعد'' = کلائی۔ یارہ'' = چوڑی یا بازو بند۔
پرگر = گلوبند یا ہار (ایران کے پرانے بادشاہ گلے میں قیمتی پتھروں سے جڑا ہوا گلوبند پہنتے تھے)۔

کلائی اور گردن کی چمک کا اندازہ نہیں ہو سکتا، اور بازو بند اور گلوبند کی زیبائی بیان نہیں ہو سکتی۔

پیوستہ دھد بادہ و ساقی نتوان خواند
ہموارہ تراشد بت، آذر نتوان گفت

ہمیشہ شراب پلاتا ہے اور اسے ساقی بھی کہہ نہیں سکتے۔
ہمیشہ بت تراشتا ہے اور اسے آذر بھی نہیں کہا جا سکتا۔
محبوب کا حسن، کیف آور ہے جسے دیکھ کر سب مست ہوتے ہیں اور اس کا ہر جلوہ گویا ایک نیابت ہے جسے وہ تراش کر چاہنے والوں کے سامنے لاتا ہے۔

از حوصلہ یاری مطلب صاعقہ تیز است
پروانہ شو اینجا ز سمندر نتوان گفت

لغت: ''سمندر'' = ایک کیڑا جو آگ ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ اور وہیں نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس پروانہ ہے جو شعلہ دیکھتے ہی اس پر لپکتا ہے اور جان دے دیتا ہے۔

معشوق کا جلوۂ حسن برقِ تپاں کی طرح ہے جس سے بچنے کا کسی کو حوصلہ نہیں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ برق تیز ہے، حوصلے کا سہارا نہ ڈھونڈ یہاں تو پروانہ بن کر جان قربان کی جا سکتی ہے، سمندر نہیں بنا جا سکتا۔

هنگامہ سر آمد، چہ زنی دم ز تظلّم
گر خود ستمی رفت بہ محشر نتوان گفت

محبت ایک ہنگامہ ہے، بپا ہوا اور ختم ہو گیا۔ اب اُس کے جور و ستم کے ہاتھ دادرسی کے لیے فریاد کیسی؟ اگر واقعتاً کوئی ستم ہوا بھی ہو تو یہ وہ ستم ہے جسے محشر میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

درگرم روی سایہ و سرچشمہ نہ جوئیم
با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتوان گفت

۔ مولانا حالی فرماتے ہیں۔

''ہم کو آگے جانے کی جلدی ہے۔ ہم سایہ اور سرچشمہ یعنی طوبیٰ اور کوثر پر آرام نہیں لے سکتے۔''

مسافر چلتے چلتے جب تھک جاتے ہیں تو کسی سایہ دار درخت یا چشمے کے کنارے دم لیتے ہیں اور پانی پی کر پیاس بجھاتے ہیں۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ ہم وہ تیز رفتار مسافر ہیں کہ طوبیٰ اور کوثر پہ نہیں ٹھہرتے۔ منزل پہ پہنچنے کا شوق ہمیں کشاں کشاں لیے جا رہا ہے۔ جو ان دونوں سے کہیں آگے ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاشکے مکان اپنا

آن راز کہ در سینہ نهان است نہ وعظ است
بر دار توان گفت بہ منبر نتوان گفت

وہ راز جو ہمارے سینے میں پوشیدہ ہے، وعظ نہیں ہے۔ یہ دار ہی پہ چڑھ کر سنایا جا سکتا ہے، منبر پہ نہیں کہا جا سکتا۔

یہ راز، حق کا راز ہے جس کا اظہار آسان نہیں۔ منصور نے حق بات کہی، تو دار پہ چڑھنا پڑا۔ صائب کہتا ہے:

گفتار راست باعث آزار می شود
چو حرف بلند دار می شود

کاری عجب افتاد بدین شیفتہ ما را
مومن نبود غالب و کافر نتوان گفت

ایک عجیب مجنوں سے ہمارا واسطہ آ پڑا ہے۔ غالب مومن نہیں مگر اسے کافر بھی نہیں کہا جا سکتا۔

غالب کی ظاہری زندگی، مومن کی سی نہیں تھی لیکن اس کے اشعار سے جو بالخصوص خدا کو خطاب کر کے کہے گئے ہیں، اس کے ایمان اور خلوص کا پتا چلتا ہے اور یوں بھی کسی کافر کو کو کافر نہیں کہا جا سکتا۔

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بار ہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

❁❁❁

غزل نمبر(۳۵)

آتشکدۂ خوئی تو نازم کہ ز طرفش
رُفتم شرر و داغ، گل و لالہ فرو ریخت

لغت: ''رُفتن'' = جھاڑنا، جھاڑ پونچھ کرنا۔ ''رُفتم'' = میں نے جھاڑا۔

معشوق کی گرم طبیعت کو آتشکدہ سے تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ آتشکدہ خو میں اضافت، اضافت تشبیہی ہے۔ مراد وہ خو جو آتشکدہ کی طرح ہو۔ مجھے تیری گرم مزاجی پر جو آتشکدہ کی طرح ہے، بہت ناز ہے کیونکہ جب کبھی بھی کسی طرف سے اس کی چنگاریوں اور داغوں کو جھاڑا اُس میں سے گلاب اور لالے کے پھول گرے۔

یعنی محبوب کی گرم مزاجی ایسی لطف انگیز ہے جیسے پھول جھڑ رہے ہوں۔

بر سادہ دلانت بہ وفا جلوہ ھمی داد
بیداد تو آب ازرخ دلاّلہ فرو ریخت

لغت: ''سادہ دلان'' = سادہ لوح عاشق۔

''دلالہ'' = کسی معاملے میں دلیل پیش کرنے والی۔ یہاں وہ عورت مراد ہے جو معشوق کی اچھی صفات بیان کرنے والی ہو۔ تعریف کرنے والی۔

دلالہ، تیرے سادہ دل عاشقوں کے سامنے تیری خوئے وفا بیان کر رہی تھی۔ تیری بیداد نے دلالہ کی آبرو کھو دی۔ ''آب ازرخ دلالہ فرو ریخت'' کا ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ شرمندہ ہوئی اور اس کے چہرے پر پسینہ آ گیا۔

گفتم ز کہ پرسم خبر عمر گذشتہ
ساقی بہ قدح بادۂ دہ سالہ فرو ریخت

میں سوچ رہا تھا کہ اپنی عمر گزشتہ کے بارے میں کس سے پوچھوں، ساقی نے پیالے میں دس سالہ شراب ڈال دی۔

شراب دس سال پرانی اسی وقت ہوتی ہے جب دس سال تک اسے کوئی نہ پیے۔ ساقی کا دہ سالہ شراب جام میں ڈالنے کا یہی اشارہ ہے کہ یہ جو شراب دس سال پرانی ہو گئی اور تم نے اتنا عرصہ نہیں 'پی' یہی حصہ تیری زندگی کا گزر گیا یعنی ضائع ہو گیا۔

بی سعی نگہ مستی آن چشم فسون گر
خونم بہ سیہ مستی دنبالہ فرو ریخت

لغت: ''دنبالہ'' = سرمے کی وہ لکیر جو آنکھ سے باہر کھینچی ہوتی ہے۔

''چشم فسوں گر'' = جادو بھری آنکھ۔

آنکھیں مست ہوں تو نگاہیں گویا کام نہیں کرتیں۔ اسی لیے شاعر نے ''بے سعی نگہ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یعنی بغیر نگاہوں کی کوشش کے۔

معشوق کی آنکھیں مست ہیں اور مستی کے عالم میں نگاہیں کام نہیں کر رہیں، لیکن سرمے کی لکیر اس سے زیادہ مست ہے۔ (سیہ مست)۔ اس دنبالے کی سیہ مستی نے میرا خون بہا دیا۔ یعنی میں مست آنکھوں پہ قربان ہونے سے پہلے دنبالہ پہ مر مٹا۔

مشاطہ بہ آرائش آن حسن خدا داد
گل در چمن و قند بہ بنگالہ فرو ریخت

لغت: ''حسن خداداد'' = فطرتی رعنائی جسے ظاہرا آرائش وزینت کی حاجت نہ ہو۔

مشاطہ'' = زینت اور آرائش والی عورت مشاطہ نے تیرے حسن خداداد کی آرائش کے وقت پھولوں کو چمن میں اور شیرینی (قند) کو بنگال میں پھینک دیا۔ حسن خداداد کو ان چیزوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔

با موج خرامش سخن از بادہ مگوئید
کآب رخ این جوہر سیالہ فرو ریخت

لغت: ''جوہر سیالہ'' = بہہ جانے والا جوہر یعنی شراب۔

معشوق کے خرام میں ایک مستی ہے۔ جس طرح شراب میں تیزی سے لہریں ابھرتی ہیں، اسی طرح معشوق کے خرام میں بھی گویا لہریں نمودار ہوتی ہیں۔ اسی لیے موج خرام کے الفاظ آئے ہیں۔ کہتا ہے کہ معشوق کے موج خرام کے سامنے شراب کی بات نہ کرو کیونکہ موج خرام کے روبرو اس جوہر سیالہ کی آبرو جاتی رہی ہے، یعنی شراب بے وقار ہو کر رہ گئی ہے۔

چون انجم و خورشید ز برق دم گرم
شیرازۂ جمعیت تبخالہ فرو ریخت

لغت: ''تبخالہ'' = وہ گرمی دانے جو بخار کی حدت سے لبوں پر نمودار ہو جاتے ہیں۔

میری آتش آہوں (دم) سے ستاروں اور سورج کی طرح، گرمی دانوں کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا ہے۔

رشکِ خط روی تو گر افشرد بدین رنگ
بنی کہ مہ از دائرہ ہالہ فرو ریخت

لغت: ''خط'' = چہرے پر سبزے کا نمودار ہونا۔ ''افشردن'' = نچوڑنا۔ ''بدیں رنگ'' = اس انداز

سے، اس طرح سے۔

سبزہ خط کے نمودار ہونے سے رخ معشوق کا حسن دب کر رہ گیا ہے۔ چہرے کے گرد خط یوں نظر آتا ہے جیسے چاند کے گرد ہالہ ہو۔

کہتا ہے کہ تیرے سبزۂ خط کے رشک کا اگر یہی عالم رہا تو چاند ہالے کے دائرے سے نیچے آ گرے گا۔

وزدیدہ سر اہل سخن از بیم تو غالب
گوئی رگ ابر قلمت ژالہ فرو ریخت

اے غالب تیرے خوف سے اہل سخن اپنے سر چھپائے پھرتے ہیں۔ گویا تیرے ابر قلم کی رگوں سے اولے برس رہے ہیں۔ یعنی رشحات قلم الفاظ نہیں اولے ہیں۔

غزل نمبر (۳۶)

خواست کز ما رنجد و تقریب رنجیدن نداشت
جرم غیر از دوست پرسیدیم و پرسیدن نداشت

اس نے چاہا کہ ہم سے بگڑ جائے اور بگڑنے کا کوئی موقع محل نہ تھا۔ ہم نے دوست سے رقیب کا جرم پوچھا اور پوچھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔

آمد و از تنگی جا جبھہ پر چین کرد و رفت

برخود از ذوق قدوم دوست بالیدن نداشت

لغت: ''برخود بالیدن'' کسی بات پہ فخر سے پھولنا۔ ''قدوم دوست'' = دوست کی آمد۔

میرا محبوب محفل میں آیا، جگہ کی تنگی کو دیکھا، تیوری چڑھائی اور چلا گیا۔ بات یہ تھی کہ وہ اپنے دوست کے آنے کی خوشی میں پھولنا چاہتا تھا اور اس پھولنے کی وہاں گنجائش نہ تھی۔

درحقیقت محبوب بزم میں آیا اور دیکھا کہ وہاں اس کا دوست موجود نہیں، چلا گیا۔

شد فگار از نازکی چندان کہ رفتارش نماند

نازنین پایش بکوی غیر بوسیدن نداشت

نازکی سے اس کے پاؤں اتنے زخمی ہو گئے کہ وہ چلنے سے رہ گیا کوچہ رقیب میں اس کے نازنین پاؤں کو اس زمین کے چومنے کا موقع نہ مل سکا۔

گل فراوان بود و می پر زور، دوشم بر بساط

خود بخود پیمانہ می گردید و گردیدن نداشت

لغت: ''گردیدن'' = دور میں آنا۔ گھومنا = اس کا دوسرا مفہوم ایک حالت سے دوسری حالت میں آجانا، تیسرا مفہوم ہے پلٹ کے آنا۔ پیمانہ می گردید'' کے معنی ہیں کہ پیمانہ گردش میں تھا اور'' گردیدن نداشت'' کا مطلب ہے الٹا پھر کے نہیں آتا تھا۔

کل رات میری خلوت سرا میں فرش پر پھول کثرت سے بکھرے ہوئے تھے۔ اور شراب اتنی تیز و تند تھی کہ جام خود بخود گردش میں آگیا تھا، مسلسل چلا جا رہا تھا۔ اور پلٹ کے نہیں آتا تھا۔

دیر خواندی سوی خویش و زود فہمیدم دریغ

بیش ازین پایم ز گرد راہ پیچیدن نداشت

تو نے مجھے بڑی دیر کے بعد بلایا اور میں تیرے مقصد کو پا گیا۔ افسوس (تیری راہ میں چلتے چلتے اتنا خستہ و درماندہ ہو گیا ہوں) کہ اس سے زیادہ غبار راہ میں پیچ و تاب کھانے کی میری ٹانگوں میں سکت باقی نہیں۔

معشوق کی ستم ظریفی دیکھیے کہ عاشق کی طرف اس وقت توجہ کی جب وہ اس توجہ سے بہرہ ور ہونے کے قابل نہ رہا تھا:

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جوش حسرت بر سر خاکم ز بس جا تنگ کرد

ہمچو نبض مردہ دود شمع جنبیدن نداشت

لغت: ''نبض مردہ'' جو نبض چلنے سے رہ گئی ہو۔

میری قبر پر حسرتوں کا اتنا ہجوم ہے کہ جگہ تنگ ہو گئی ہے یہاں تک کہ شمع مزار کا دھواں بھی ہل نہیں سکتا، ''نبض مردہ'' بن کر رہ گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہماری قبر پر شمع بھی نہیں جلتی، حسرت برس رہی ہے۔

شمع کے تھمے ہوئے دھوئیں کو نبض مردہ سے تشبیہ دینا حسرت ناک منظر پیش کرتا ہے۔

گر منافق وصل ناخوش ور موافق ہجر تلخ

دیدہ داغم کرد روئی دوستان دیدن نداشت

اگر دوست منافق ہے تو اس کا ملاپ دکھ دے گا اگر وہ موافق ہے تو اس کی جدائی سے

صدمہ ہوگا۔ اس احساس نے میری آنکھوں کو جلا دیا اور دوستوں کے دیکھنے سے رہ گیا۔ مولانا حالی اس شعر کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

یعنی دوستوں کا منہ دیکھنا اور ان سے تعارف کرنا نہیں چاہئے تھا کیونکہ جو منافق ہیں ان کا ملنا ناگوار ہے اور جو موافق ہیں ان کی جدائی تلخ ہے۔

برد آدم از امانت هر چه گردون برنتافت

ریخت مَی بر خاک چون در جام گنجیدن نداشت

انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار امانت سونپا گیا اور اس نے اس بار امانت کو اٹھالیا۔ اس بات کی وضاحت قرآن پاک میں موجود ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

انا عرضنا الامانة علی السموٰت والارض و الجبال فابین ان تحملنا واشفقن منها و حملها الانسان، انه کان ظلوماً جهولاً:

ہم نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے بار امانت پیش کیا، لیکن انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے اس کو اٹھالیا۔ وہ یقیناً بہت ظلم کرنے والا اور بے خبر تھا (نتائج سے)۔

قرآن نے انسان کو اس بار امانت کے اٹھانے پر کہا کہ انسان نے بہت بھاری فرض اپنے ذمے لے لیا۔ مرزا غالب نے اس پر ایک اور ہی زاویے سے نگاہ ڈالی ہے اور انسان کی بوالعجبی پر ایک لطیف طنز کی ہے۔ کہتا ہے:

امانت کے سلسلے میں آسمان جس چیز کی تاب نہ لا سکا وہ آدم نے لے لی۔ جام میں جو شراب سما نہ سکی وہ خاک پر گر گئی۔ اصل عطیات الٰہی تو آسمان زمین اور پہاڑ لے گئے، امانت ایک بچی کھچی شے انسان کے ہاتھ لگ گئی، اسی سے پھولا نہیں سماتا۔

گر نیَم آزاد خود را در تعلق باختم

سود زیر کوه دامانی که بر چیندن نداشت

لغت: ''دامن بر چیدن'' دامن اٹھالینا۔ (دامن جھاڑ کر) کسی شے سے **قطع تعلق** کر لینا۔ کسی بھاری پتھر کے نیچے دامن کا آجانا، مجبوری کے عالم کو ظاہر کرتا ہے۔

''سود زیر کوہ'' چٹان یا پتھر کے نیچے رہ کر گھس گیا یعنی وہیں کا ہو رہا۔ ''در تعلق باختم'' = میں تعلقات (دنیوی) میں الجھ گیا۔

میں آزاد نہ تھا۔ (مجبور تھا) اس لیے چار و ناچار علائق دنیا میں پھنس گیا۔ جو دامن اٹھایا نہ گیا وہ پتھر کے نیچے آکر پھنس گیا۔ یعنی انسان فطرۃً مجبور ہے اور اس کا دنیا کے علائق میں پھنسنا ایک فطری بات ہے ورنہ وہ اپنا دامن جھاڑ کر الگ نہ ہو جاتا۔

مرزا غالب نے عشق اور عشق کے جذبۂ وفا کی ایسی ہی توجیہ کر کے اس پر ایک طنز کی ہے:

مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت

دست تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

عاشق مجبور ہے اور دعویٰ یہ کر رہا ہے کہ دیکھو میں کیسا اسیر الفت ہوں کہ اس سے آزاد نہیں ہونا چاہتا حالانکہ جسے وہ پختہ پیمان وفا کہتا ہے وہ اس ہاتھ کی طرح ہے جو بھاری پتھر کے نیچے دبا ہے اور نکالا نہیں جا سکتا، ورنہ عاشق نکال کر الگ ہو جاتا۔

نامرادی بود نوعی آبرو غالب، دریغ

در هلاکِ خویش کوشیدیم و کوشیدن نداشت

ہم نے اپنی ہلاکت کی مقدور بھر کوشش کی، ناکام رہے۔ افسوس اسی ناکامی اور نامرادی ہی کو اپنی آبرو کہنا پڑا۔

❀❀❀

غزل نمبر (۳۷)

بہ بین کہ در گل و مل جلوہ گر برای تو کیست
مپوش چشم ز حق طالب رضای تو کیست

دیکھ کہ گل و مے تیرے لیے کون اپنی جلوہ گری دکھا رہا ہے۔ حق سے آنکھیں نہ پھیر، دیکھ کہ کون تیری رضامندی کا طالب ہے، یعنی کون تیری مرضی کے اشاروں پہ چلنے کا منتظر ہے۔

کائنات کا ہر ذرہ انسان کو دعوت نظارہ دے رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ یہ سب اسی ذات کی جلوہ گری ہے جسے انسان تلاش کر رہا ہے۔

چہ نا کسی کہ ز دردِ فراق می نالی
نمی رسی کہ درین پردہ ھمنوای تو کیست

لغت: ''پردہ'' کے ایک معنی ''سرّ'' کے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں پردہ، حجاب اور سرّ دونوں کے رعایت سے آیا ہے۔

''رسیدن'' = پہنچنا، کسی معاملے کی تہ کو پالینا۔

تو کیسا نااہل ہے کہ فراق کے دکھوں فریاد کر رہا ہے۔ اس بات کو نہیں سمجھتا کہ اس پردے میں تیرا ہمنوا کون ہے۔

انسان حق کی تلاش میں پریشان ہے اور اسے نہ پا کر جدائی کے ہاتھوں فریاد کرتا ہے۔ اس راز کو نہیں جانتا کہ اس عالم جدائی میں وہی اس کا ہمنوا ہے۔

کلید بستگی تست غم، بجوش ای دل
تو گر چنین نگدازی، گرہ کشای تو کیست

لغت: ''بستگی'' = بند ہونا، طبیعت کی گھٹن۔

''گرہ کشاے'' = گرہ کو کھولنے والا۔ گھٹن کو دور کرنے والا کہتا ہے کہ تیری طبیعت کی گھٹن کو دور کرنے کی کنجی غم ہے یعنی غم ہی تیری افسردگی کا مداوا ہے۔ اے دل غم کا طوفان بپا کر۔ اگر تو غم سے گداز نہیں ہوگا تو پھر کون سی شے تیری گرہ کشائی کرے گی۔

شکایتی نفروشی و عشوۂ نخری
تو آشنا کہٗ خواجہ و آشنای تو کیست

لغت: ''شکایت فروختن'' لغوی طور پر شکایت فروشی کرنا یعنی بہت زیادہ شکوہ شکایت کرنا۔

''عشوہ خریدن = لغوی طور پر ناز و ادا خریدنا یعنی ناز و ادا کی داد دینا۔

نہ تیرے لب پر کسی محبوب کے جور و ستم کے خلاف فریاد ہے اور نہ ہی تو کسی کے ناز و ادا کا چاہنے والا ہے۔ پھر بتا تو سہی، تو کس کا آشنا ہے اور کون تیرا آشنا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے:

اپنا کسی کو کر لو یا ہو رہو کسی کے

ترا کہ موجہ گل تا کمر بود دریاب
کہ غرق خون بہ در بوستانسرای تو کیست

تو کہ کمر تک پھولوں میں لپٹا ہوا ہے۔ یہ تو معلوم کر کہ تیرے باغ کے دروازے پر کون خون میں غرق ہے۔

محبوب رنگ و بو میں کھیل رہا ہے۔ اُسے یہ معلوم نہیں کہ اُس کا عاشق کس طرح خون میں تڑپ رہا ہے۔

بلا بہ صورت زلف تو رو بہا آورد
بہ بند خصمی دھریم، مبتلای تو کیست

لغت: ''رو بہا'' = دولہا جب پہلی دفعہ دلہن کی صورت دیکھتا ہے تو کوئی تحفہ دیتا ہے وہ رو بہا ہے رونمائی۔ ''خصمی'' = دشمنی

دنیا کی مصیبتیں تری زلف کی صورت دیکھنے کی رونمائی ہے۔ ہم تو زمانے کی دشمنی میں پھنسے ہوئے ہیں، تیرا اسیر کون ہے۔

ہمیں تو محبت نے دنیا کی مصیبتوں میں پھنسا دیا۔ کون ایسا خوش نصیب ہے جسے صرف محبوب ہی کا غم ہوگا۔

تراست جلوہ فراوان درین بساط، ولی
حریف بادۂ میخوارہ آزمای تو کیست

لغت: ''بادۂ میخوارہ آزما'' ۔ وہ شراب جو میخوار کی مے نوشی کو آزمائے۔ تند و تیز شراب جسے پی کر بڑے بڑے مے نوش مست ہو جاتے ہیں۔ محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے:

محفل میں تیرے جلوؤں کی فراوانی تو ہے لیکن ان جلوؤں کی تیز و تند شراب کو برداشت کرنے والا کون ہے، یعنی کوئی نہیں۔ کیست کا استفہام انکاری ہے۔

ز وارثان شہیدان ھراس، یعنی چہ
قوی است دست قضا کشتۂ ادای تو کیست

لغت: ''کسی کو مار دیا جائے تو مرنے والے کے وراث قاتل سے قصاص لیتے ہیں۔ شہیدان محبت کے وارثوں سے ڈر کیسا، یہ سارا کرشمہ تو قضا کے ہاتھوں کا ہے جس سے وہ شہید ہوئے ہیں، تیری ادا کا شہید کون ہے۔

محبت میں جان دینا بھی قضا ہی کا کام ہے۔

بہ انتظار تو در پاس وقت خویشتنیم
فریب خوردۂ نیرنگ وعدہ ھای تو کیست

لغت: ''نیرنگ وعدہ'' = وعدوں کا عجیب و غریب انداز جس سے انسان فریب کھا جاتا ہے۔

ہمیں تیرے انتظار میں دراصل اپنے ہی وقت کا پاس ہے۔ تیرے وعدوں کے طلسماتی انداز سے فریب کھانے والا کون ہے۔ یعنی ہم تیرے وعدوں سے فریب کھا کے تیرا انتظار نہیں کرتے بلکہ ہمیں انتظار کرنے میں لطف آتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے وقت کی خوش نصیبی ہے۔

کوئی اور ہوگا جو تیرے وعدے کے فریب میں آ جائے۔

ز لالِ لطف تو سیرابی ھوسناکان
یکی بہ بین کہ جگر تشنہ جفائی تو کیست

لغت: ''زلال'' = آبِ لذیذ و شیریں۔

تیری مہربانیوں اور نوازشوں کا پانی اہل ہوس کو تو سیراب کرتا ہے، کبھی اس بات کا بھی احساس کر کہ تیری جفاؤں کا پیاسا کون ہے؟ اہل ہوس تیرے لطف و عنایت سے خوش

ہوں تو ہوں، ہمیں تیری جفاؤں میں مزہ ملتا ہے۔

ترا ز اهل هوس هریکی بجای من است
تو وخدای تو، شاهم، مرا بجای تو کیست

تیری نظر میں تو میں اہل ہوس کی طرح ایک ہوں۔ یعنی تو بھی مجھے انہی کے زمرے میں شمار کرتا ہے۔ تجھے خدا قسم اے میرے شاہ حسن، میرے لیے تیرے سوا کون ہے یعنی میری نظر میں تو تو ہی تو ہے۔

فرشته ! معنی "من ربک" نمی فهمم
بمن بگوی که غالب بگو خدای تو کیست

قبر میں آکر سوال کرنے والے فرشتے سے خطاب کر کے کہتا ہے:
میں "من ربک" = کے معنی نہیں سمجھتا۔ مجھ سے تو تو یہ کہہ غالب بتا تیرا خدا کون ہے۔

"من ربک" عربی ہے اور خدای تو کیست" فارسی۔ دونوں کا ایک مفہوم ہے، یعنی تیرا خدا کون ہے۔؟ یہ شعر ؛ غالب کی شوخی طبیعت کو ظاہر کرتا ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر (۳۸)

بوادی که در آن خضر را عصا خفتست
بسینه می سپرم ره اگرچه پا خفتست

لغت: "خضر" = ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بھولے بھٹکوں کو راہ دکھاتے ہیں۔ فارسی اور اردو ادب میں خضر کا لفظ رہنمائی اور رہبری کی علامت بن گیا ہے۔

"پا خفتن" = پاؤں کا سو جانا۔

"خضر را عصا خفتست" = "خضر کا عصا سو گیا ہے" = میں یعنی خضر بھی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ ان الفاظ میں را اضافی ہے یعنی اضافت کے معنی دیتا ہے۔ خضر را عصا سے مراد عصائے خضر ہے۔

اُس وادی میں جہاں خضر بھی عاجز ہو کر رہ گیا ہے، میں راستے کو سینے کے بل طے کرتا ہوں اگرچہ میرے پاؤں سو گئے ہیں۔ سفر شوق خضر کے بس کا روگ نہیں۔ اس سفر کو عاشق ہی طے کرتے ہیں۔

بدین نیاز که باتست، نازمی رسدم
گدا به سایهٔ دیور پادشا خفتست

اس نیازمندی پر جو مجھے تجھ سے ہے، میں ناز کرتا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ ایک گدا ہے جو بادشاہ کے محل کی دیوار کے سائے تلے سو رہا ہے۔

گدا حقیر انسان ہے لیکن سایۂ دیوار بادشاہ میں (بادشاہ کے دیوار کے سایہ میں) سونا اس کے لیے باعث فخر ہے معشوق سے نیازمندی کا اظہار عاشق کے لیے ناز ہے۔

به صبح حشر چنین خسته روسیه خیزد

که در شکایت درد و غم دوا خفتست

لغت: "اس شعر میں "خفتست" کا لفظ بڑا پہلودار ہے۔ اس کے معنے ایک تو "سویا ہوا ہے" = اور پھر لفظ حشر کے اعتبار سے اس کا دوسرا مفہوم "تہ خاک سونا" ہے۔

جو شخص زندگی بھر درد و رنج کی شکایت کرتا رہا اور پھر اس درد کو دور کرنے لیے دوا تلاش کرتا رہا اور آخر اسی دھن میں مرگیا۔ ایسا خستہ حال قیامت کے دن، روسیاہ اٹھے گا۔

سچے عاشق تو درد محبت کو سینے سے لگا لیتے ہیں اور انھیں چارۂ درد کا فکر نہیں ہوتا۔ انہیں اس درد سے راحت ملتی ہے۔ جو شخص یہ نہیں کر سکتا اور درد کے ہاتھوں فریاد کرتا ہے اور مداوائے درد تلاش کرتا ہے اور اسی فکر میں مر جاتا ہے، اس کی عاقبت خراب ہوگی۔

خروش حلقۂ رندان ز نازنین پسری است

که سر به زانوی زاهد به بوریا خفتست

• زاہد لوگ اکثر رندوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ خود ان کی یہ حالت ہے کہ ایک خوبصورت نازنیں لونڈا ایک زاہد کے زانو پر سر رکھے سویا ہوا ہے۔ رندوں کو اس بات کا پتا چل جاتا ہے اور وہ شور مچا رہے ہیں کہ دیکھو کیا ہو رہا ہے۔

هوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز

گسسته لنگر کشتی و ناخدا خفتست

ہوا مخالف ہے، رات تاریک ہے اور سمندر میں لہروں کا طوفان بپا ہے
کشتی کا لنگر ٹوٹ گیا ہے اور ناخدا سویا ہوا ہے

اس شعر کو پڑھتے ہی خیال حافظ کے اس شعر کی طرف جاتا ہے:

شب تاریک و بیم موج و گردابی چنین حائل

کجا دانند حال ما سبک ساران ساحلها

دونوں شعروں میں سیاہ رات اور سمندر، طوفان اور کشتی کا نقشہ ہے جن سے مسافروں کی خستہ حالت کا پتا چلتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ حافظ کے یہاں تصویر نامکمل ہے اور مرزا غالب کے یہاں مکمل ہے۔ مسافروں کی حالت کا ذکر نہ کرنے کے باوجود ان کی بے چارگی اور خستہ حالی کی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

غمت بشهر شبیخوں زنان به بنگه خلق

عسس بخانه وشه در حرم سرا خفتست

لغت: "عسس" = کوتوال۔

کوتوال اپنے گھر میں اور بادشاہ اپنی حرم سرا میں سویا ہوا ہے، اور ادھر تیرا غم ہے کہ (کھلے بندوں) راتوں کو لوگوں کے ٹھکانوں پر ڈاکے ڈال رہا ہے۔

یعنی محبت کی غارت گری کا یہ عالم ہے کہ غم محبوب لوگوں کے دلوں میں سمایا ہے اور وہ راتوں کو سو نہیں سکتے اور اس ظلم کی روک تھام اور دادرسی کرنے والے دونوں سو رہے ہوتے ہیں۔

دلم به سبحه و سجاده و ردا، لرزد

که دزد مرحله بیدار و پارسا خفتست

میرا دل تسبیح، مصلے اور چادر تینوں کی حالت زار دیکھ کر لرز رہا ہے۔ عجیب عالم ہے کہ رہزن جاگ رہا ہے اور پارسا، جس کا کام راتوں کو جاگ کر عبادت کرنا ہے، غافل سویا ہوا ہے۔

اس شعر میں بھی مرزا غالب کی شوخیٔ طبیعت نمایاں ہے۔

سورا زی شب و بیداری من اینهمه نیست
ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفتست

فراق کی طویل راتوں کی درازی اور میری بیداری تو کوئی ایسی بات نہیں۔ میرے نصیبے کا پتا لو کہ وہ کتنی گہری نیند سویا ہوا ہے، یعنی فراق زدہ انسانوں کا راتوں کو جاگنا ہی بتاتا ہے کہ ان کے نصیب سوئے ہوئے ہیں۔

به بین ز دور و مجو قرب شه که منظر را
دریچه باز و به دروازه اژدها خفتست

لغت: "منظر" دیوار کے باہر (خاص کر اوپر کی منزل میں) ایک چھجا نما جگہ جس کی تین کھڑکیاں ہوتی ہیں تاکہ وہاں سے سامنے اور دائیں کی چیزیں نظر کے سامنے آجائیں۔

کہتا ہے کہ بادشاہ کے قریب ہونے کی خواہش نہ کر، بس دور ہی سے نظارہ کر۔ دیکھ کہ منظر کے دریچے تو کھلے ہیں لیکن محل کے دروازے پہ اژدہا سویا ہوا ہے۔ منظر دعوت نظارہ دے رہا ہے۔ لیکن اس منظر سے کسی کو قربِ شاہ کے حصول کی جرأت نہو۔ یہ غلط ہے کیونکہ دروازے پہ ایسا پاسبان ہے جو اژدہا کی طرح راستہ روکے ہوئے ہے۔

شہ سے شاہِ حسن بھی مراد ہو سکتی ہے اور دوسرے بادشاہ بھی۔

براه، خفتنِ من، هر که بنگرد داند
که میر قافله در کاروان سرا خفتست

میں راستے میں سویا پڑا ہوں، میری اس حالت کو جو کوئی بھی دیکھتا ہے سمجھ جاتا ہے کہ اس قافلے کا سردار، کارواں سرا میں سویا ہوا ہے۔

جب میر قافلہ کی یہ حالت ہو تو قافلے کے لوگوں کا کیا حشر ہوگا۔

دگر ز ایمنی راه و قرب کعبه چه حظ
مرا که ناقه ز رفتار ماند و پا خفتست

مجھے راستے کے پرامن ہونے اور کعبے کے قریب ہونے سے کیا خوشی ہوگی۔ میری اونٹنی تو تھک کر چور ہوگئی ہے اور میرے اپنے پاؤں سو گئے ہیں۔ یعنی مجھ میں خود چلنے کی سکت نہیں۔

منزل تک رسائی، منزل کے قریب ہونے سے نہیں بلکہ رہرووں کی ہمت سے ہوتی ہے۔

بخواب چون خودم آسوده دل مدان غالب
که خسته غرقه بخون خفته است تا خفتست

اے غالب! مجھے سوئے دیکھ کر اپنی طرح آسودہ دل نہ سمجھ، کہ خستہ دل انسان سویا ہوا بھی ہو تو ایسے جیسے کوئی خون میں ڈوبا ہوا سو رہا ہے۔

دلفگاروں کی نیندیں بھی بیداری کی طرح تلخ ہوتی ہیں۔

❀❀❀

غزل نمبر(۳۹)

کشتہ را رشک کشتۂ دگر است
من و زخمی بر دل از جگر است

یوں تو دل اور جگر دونوں محبت کے مارے ہوئے ہیں، لیکن زخم محبت کے علاوہ، زخم رشک بھی کھائے ہوئے ہیں۔ میرے دل کو دیکھو کہ اس پر جگر نے زخم لگایا ہے اور وہ یہی زخم رشک ہے۔ مراد یہ ہے کہ دل اور جگر دونوں کشتۂ محبت ہیں اور پھر دونوں ایک دوسرے کے شہید رشک بھی ہیں:

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے ہوئے ہیں

زند اجزای روزگار زہم
روز و شب در قفای یکدگر است

لغت: ''اجزاے روزگار زہم زند'' = زمانے کے اجزا ایک دوسرے سے الگ ہوجائیں گے بکھر جائیں گے۔ زمانہ درہم برہم ہوجائے گا۔

''در قفا است'' پیچھے لگا ہوا۔ تاک میں ہے۔

رات دن، ایک دوسرے کے تعاقب میں ہیں زمانے کے اجزا بکھر کر رہیں گے۔

مستی انداز لغزشی دارد
حیف پائی کہ آفتش ز سر است

مستی میں لغزش کا سا انداز ہوتا ہے۔ افسوس اس پاؤں پر جس پر سر سے آفتیں نازل

ہوتی ہیں۔

مستی سر میں ہوتی ہے اور بقول شاعر مستی کیا ہے۔ ایک طرح کی لغزش ہے۔ ایسی حالت میں پاؤں کا کیا حشر ہوگا، وہ کتنی لغزشیں کھائے گا۔

نالہ را مالدار کرد اثر
دل سختش، دکان شیشہ گر است

ہماری فریاد کو، اس کی اثر انگیزی نے مالدار بنا دیا۔ محبوب کا دل سخت جو پتھر کی طرح تھا اب نرم ہو کر شیشے کی طرح ہو گیا ہے۔ اس کا ہر ٹکڑا ایک شیشہ بن گیا ہے اور وہ دل نہیں، گویا شیشہ گر کی دکان معلوم ہوتا ہے۔

ایک پتھر، شیشہ بن جائے تو اس کی قیمت خود بخود بڑھ گئی۔ یہی مالداری کی نشانی ہے۔

دوستان دشمن اند، ورنہ مدام
تیغ او تیز و خون ما ہدر است

لغت: ''ہدر'' = رائگاں۔ ''خون ہدر'' = وہ خون جس کا کوئی قصاص نہ ہو اور رائگاں جائے۔

ہمارے دوست ہی ہمارے دشمن ہیں (جو ایسا ہونے نہیں دیتے) ورنہ محبوب کی تلوار تیز ہے اور ہمارے خون کا کوئی قصاص نہیں۔

پردۂ عیب جو دریدۂ او
نوک کلکم ز دشنہ تیز تر است

لغت: ''عجیب جو'' = عیب نکالنے والا۔ ''کلک'' = قلم۔ میرے قلم کی نوک خنجر سے

زیادہ تیز ہے۔اس نے عیب جو (مخالف) کا پردہ پھاڑ ڈالا ہے۔

عقل و دین بردہ، دل و جان نیز
آنچہ از ما نہ بردۂ خبر است

تو نے (محبت میں) ہم سے عقل و دین بھی چھین لیے اور دل و جاں بھی۔ہاں ایک چیز تو ہم سے نہیں چھین سکا اور وہ خبر ہے یعنی اس بات کا راز کسی کو معلوم نہیں ہوا۔یہ راز صرف ہم جانتے ہیں۔کسی اور کو اس کی خبر نہیں۔

شہ حریر و گدا پلاس برید
آنچہ من قطع کردہ ام نظر است

بادشاہ نے ریشم کو پھاڑ ڈالا اور گدا نے بوریائی لباس۔جو میں نے قطع کیا ہے وہ نظر ہے، یعنی بڑا چھوٹا انسان سبھی چیزوں سے قطع تعلق کرتے ہیں۔میرے پاس سوائے نظر کے تھا ہی کیا۔میں نے اسی سے قطع تعلق کر لیا۔

گویا ہر شے سے قطع نظر کر لی۔یہ بڑا قطع تعلق ہے۔

منت از دل نمی توان برداشت
شکر ایزد کہ نالہ بی اثر است

لغت: ''منت'' = احسان۔

دل کا احسان نہیں اٹھایا جاتا۔اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا نالہ بے اثر ہے۔جگروہ اثر انگیز ہوتا تو دل کا احسان ہم پر ہوتا۔

مراد یہ ہے کہ عاشق دل سے فریاد نہیں کرتا، اسی لیے فریاد بے اثر رہتی ہے۔یہ بات عاشق کی بے نیازی کو ظاہر کرتی ہے جو اسے ہر طرح کے جور و ستم سہنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

قفس و دام را گناہی نیست
ریختن در نہاد بال و پر است

لغت: ''ریختن'' = گرنا۔''ریختن بال و پر'' بال و پر کا گر جانا۔''نہاد'' = فطرت، طینت۔

قفس ہو یا جال، جب پرندہ اس میں گرفتار ہوتا ہے تو اپنی رہائی اور آزادی کے لیے انتہائی کوشش کرتا ہے اور اس مسلسل کوشش میں اس کے بال و پر جھڑ جاتے ہیں۔

کہتا ہے، قفس و دام کا اس میں کیا قصور، بال و پر کا جھڑ جانا، ان کی سرشت میں ہے۔قفس و دام نہ ہوں گے تو ویسے ہی جھڑ جائیں گے۔

ریزد آن برگ و این گل افشاند
ھم خزان، ھم بھار در گذر است

لغت: ''در گزر است'' گذشتنی اور رفتنی ہے۔خزاں ہو کہ بہار دونوں گزر جانے والی ہیں۔خزاں میں پتے جھڑتے ہیں اور بہار میں پھول۔

کم خود گیر بیش شو غالب
قطرہ از ترک خویشتن گھر است

فارسی میں ایک محاورہ ہے ''کم چیزے گرفتن''، یعنی کسی چیز کو حقیر سمجھ کر تج دینا۔''کم

خودگیر" = یعنی اپنے آپ کو تج دے۔ ترکِ خودی کرنا۔

اے غالب اپنے آپ کو کم شمار کر (ترکِ خودی کر) اور زیادہ ہو جا (قدر و قیمت میں اضافہ کر) قطرہ جب اپنی ہستی کو ترک کرتا ہے تو موتی بن جاتا ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر (۴۰)

ھند را رند سخن پیشۂ گمنامی ھست

اندرین دیرِ کہن میکدہ آشامی ھست

لغت: "دیر" معبدِ ترسایاں۔ آتش پرستوں کی عبادت گاہ۔ چونکہ آتش پرستوں کے ہاں شراب حلال تھی اس رعایت سے "دیرِ کہن" کے لفظ یہاں میکدے کا مفہوم دے رہے ہیں۔ اور پھر ہند کے لفظ کی مناسبت سے بتخانہ بھی مقصود ہے، جو حرم کی ضد ہے۔

ہند میں ایک رند ہے جس کا پیشہ شاعری ہے مگر وہ گمنام پڑا ہے۔ اس میکدے میں ایک میکدہ نوش بیٹھا ہے۔

غالب کی شاعری کی عظمت کو اس کے ہم عصروں نے نہ پہچانا، وہ گمنام رہا۔ وہ شراب پیتا تھا مگر بقدرِ ظرف میسر نہ آئی۔

خسروی بادہ درین دور گرمی خواھی

پیش ما آی کہ تو جرعہ از جامی ھست

لغت: "خسروی بادہ" = بادۂ خسروی (خسرو پرویز سے منسوب) جو شراب نوشی اور عیش پرستی کے لیے مشہور تھا۔

"تہ جرعہ" = وہ قطرۂ شراب جو جام میں رہ جاتا ہے۔

اگر تو اس دور میں بادۂ خسروی کا خواہاں ہے تو ہمارے پاس آ کیونکہ یہاں ہمارے جام کی تہہ میں کچھ صرے باقی پڑے ہوئے ہیں۔

مرزا غالب اپنے دور کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دور میں عیش و نشاط کا سماں کہاں میسر ہے، ہاں اگر کوئی کیفیت نظر آتی ہے تو ہمارے جیسے رندان درویش منش لوگوں کی صحبت میں جہاں چند قطرے ہی سہی لیکن وہ چند قطرے جامِ خسروی سے زیادہ پرارزش ہیں۔

نامہ از سوزِ درونم، بہ رقم سوختہ شد

قاصد اردم زند از حوصلہ، پیغامی ھست

(میں نے خط لکھنا شروع کیا) خط میرے سوزِ پنہاں سے لکھتے لکھتے جل گیا۔ اب اگر قاصد حوصلے کا دعوےٰ کرے تو ایک پیغام (زبانی) ہے۔

یعنی جو کچھ عاشق کہنا چاہتا ہے وہ احاطۂ تحریر میں نہیں آ سکتا۔ ہاں اگر قاصد میں سننے اور سنانے کی تاب ہو تو زبانی پیغام بھیجا جا سکتا ہے۔

چغد و آزادیِ جاوید، ھما را نازم

کش بھر سو کششی از شکنِ دامی ھست

اُلو کو کون جال میں پھنسانے کی کوشش کرے گا، وہ تو ان مخمصوں سے آزاد ہے۔ ہاں، ہما پر مجھے ناز ہے کہ اسے حلقۂ دام میں گرفتار کرنے کے لیے ہر طرف سے کشش کا سلسلہ جاری ہے۔ چغد قسم کے لوگ دنیا میں بےفکر جیتے ہیں، دنیا کے خرخشے تو اہلِ کمال ہی کا حصہ ہیں۔

گفتہ اند از تو کہ بر سادہ دلان بخشائی

پختہ کاری است کہ مارا طمع خامی ھست

لغت: ''طمع خام ایسی خواہش جس کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہ ہو۔ ایسی خواہش رکھنے والے بالعموم بڑے سادہ لوح انسان ہوتے ہیں۔ پختہ کاری'' = طمع خام کی ضد۔ تجربہ کاری۔

یہ عاشق کے پختہ کار ہونے کی دلیل ہے کہ وہ طمع خام لیے بیٹھا ہے کیونکہ اس نے سن رکھا ہے کہ محبوب ایسے سادہ دل لوگوں کو معاف کر دیتا ہے۔ محبوب سے مراد محبوب حقیقی بھی ہوسکتا ہے۔ نظیری اسی قسم کی سادہ دلی کا تذکرہ یوں کرتا ہے۔

مرا بہ سادہ دلی ھای من توان بخشید

خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم

گہ رخ آرائی وگہ زلف سیہ تاب دھی

یاد ناری کہ مرا تیرہ سر انجام ھست

لغت: ''تاب دادن'' = بل دینا، تاب دہی'' اسی سے صیغہ واحد مخاطب ہے۔

''یاد ناری'' = یاد ناری کا مخفف، یعنی تو یاد نہیں رکھتا'' ''تیرہ سرانجام'' = یعنی انجام سیہ۔

کبھی تو اپنا چہرہ آراستہ کرتا ہے، کبھی اپنی زلفوں میں پیچ وخم ڈالتا ہے۔ تو یہ بھول جاتا ہے کہ میرا انجام بہت سیہ ہے۔

''میرا انجام سیاہ ہے'' سے دو مفہوم لیے جاسکتے ہیں، ایک تو یہ کہ تو چہرے کو آراستہ کرے یا زلفوں میں خم ڈالے، انجام کار میرا حال برا ہے۔ دوسرا یہ کہ مجھ سیہ بخت کے لیے زلف سیہ ہی کے بل موزوں ہے۔

بی تو گر زیستہ ام سختی این درد بسنج

بگذر از مرگ کہ وابستۂ ھنگامی ھست

اگر تیرے بغیر زندہ رہا ہوں تو تجھے یہ اندازہ لگانا چاہیے کہ میں نے یہ دکھ کیسے برداشت کیا ہوگا۔ موت کو چھوڑ دے، موت کا معاملہ تو ایک لمحے کی بات ہے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں:

موت کے لیے ایک وقت معین ہے، اس سے قطع نظر کر اور یہ خیال مت کر کہ اب تک مرا کیوں نہیں بلکہ یہ دیکھ کہ اب تک زندہ کیوں کر رہا اور کیوں کر جدائی کے رنج اور تکلیف کو برداشت کیا۔

کیست در کعبہ کہ رطلی ز نبیذم بخشد

ور گروگان طلبد، جامۂ احرامی ھست

لغت: ''رطل'' = پیمانہ شراب۔

''نبیذ'' = کھجور اور جو سے تیار کی ہوئی شراب۔ بعض فقہا کے نزدیک اس کا پینا جائز تھا۔

''گروگان'' = وہ چیز جو گرو رکھی جائے۔

''جامہ احرام'' = وہ بن سلا کپڑا جو مناسک حج کے ختم ہونے تک حاجی پہنے رہتے ہیں۔

کعبے میں کوئی ایسا شخص ہے جو مجھے نبیذ کا ایک پیالہ دے دے۔ اگر وہ شخص مجھ سے گرو کے طور پر کوئی چیز طلب کرے تو جامہ احرام حاضر ہے۔

می صافی ز فرنگ آید و شاھد ز تتار

ما ندانیم کہ بغدادی و بسطامی ھست

بغداد اور بسطام کے شہر ہیں، ہم نہیں جانتے، ہوں گے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ شراب صاف فرنگ سے آتی ہے اور معشوق تتار سے۔

بر دل نازک دلدار گرانی مکناد

خواهش ما که جگر گوشهٔ ابرامی هست

لغت: ''گرانی مکناد'' = گرانی کردن (گراں گزرنا)، کہیں گران نہ گزرے۔ ''مکناد'' میں الف دعائیہ ہے۔

''ابرام'' = انتہائی اصرار۔

اللہ کرے کہ ہماری خواہش، جو ہماری اصرار کرنے والی طبیعت کا جگر گوشہ ہے یعنی ہمیں بڑی عزیز ہے، ہمارے محبوب کے نازک دل پر گراں نہ گزرے۔

عاشق کی پیہم خواہشوں سے محبوب کے نازک دل کا گھبرا جانا لازمی ہے۔

شعر غالب نبود وحی و نگوئیم، ولی

تو و یزدان، نتوان گفت که الهامی هست

غالب کے شعر وحی نہیں ہیں اور ہم یہ کہتے بھی نہیں، لیکن تجھے اللہ کی قسم کیا یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ الہام ہے۔

غزل نمبر (۴۱)

لعل تو خستہ اثر التماس کیست

بخت من از تو شکوه گزار سپاس کیست

لغت: ''لعل'' = لب سرخ۔ ''سپاس'' = شکریہ

رقیب، معشوق سے برسوں کے لیے پیہم التماس کرتا ہے، اور آخر اس کا اثر معشوق پر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اثر اس کے سرخ لبوں کی خستگی سے ظاہر ہے۔ رقیب معشوق کا سپاس گزار ہے۔ ادھر عاشق بد بخت ہے جو اپنی بدبختی کا رونا روتا ہے اور در پردہ، رقیب کے ''سپاس'' یا شکریہ کی شکایت کر رہا ہے۔

گیرم ز داغ عشق تو طرفی نہ بست دل

اینم نہ بس بود کہ جگر روشناس کیست

لغت: ''طرف بستن'' = فائدہ اٹھانا۔

صائب کہتا ہے:

از سلسلہ زلف کسی طرف نہ بستہ است

عمرست کہ من ربط باین سلسلہ دارم

میں نے مان لیا کہ ترے داغ عشق سے میرے دل کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا کیا میرے لیے یہی کافی نہیں کہ ''جگر کس کا روشناس ہے'' یعنی معشوق میرے جگر سے آشنا ہے اور یہی ربط میرے لیے کافی ہے۔

مراد یہ ہے کہ دل کو تو وفا کا کوئی صلہ نہ ملا، البتہ جگر پر داغ لیے بیٹھے ہیں۔

لرزم بکوئی غیر ز بی تابی نسیم
کاندر امید واری بوی لباس کیست

لغت: ''غیر'' = مراد رقیب۔

میں کوچۂ رقیب میں نسیم کے بے تابانہ چلنے سے لرز رہا ہوں کہ یہ کس کی بوی لباس سے سرفراز ہونے کی امید میں سرگرداں ہے۔

عاشق کوچۂ رقیب میں ہوا کے مستانہ وار چلنے سے اندازہ لگاتا ہے کہ ہو نہ ہو نسیم کی یہ بے تابی معشوق کے لباس کی خوشبو کی تلاش کی وجہ سے ہے جو اس وقت رقیب کے ہاں موجود ہے۔

با اُو بہ ساز وصلی و با من بہ عزم قتل
آہ از امید غیر کہ ہم چشم یاس کیست

ضمیر ''اُو'' کا اشارہ رقیب کی طرف ہے۔

محبوب رقیب سے وصل کی ساز باز کر رہا ہے اور میرے قتل کی تدبیر سوچ رہا ہے۔

رقیب پر امید ہے اور میں یاس کا مارا ہوں۔ رقیب کی امید اور میری یاس دونوں ہم چشم ہیں یعنی حریف ہیں اس بارے میں مجھے رقیب کی حالت امید پر افسوس آ رہا ہے کہ میری یاس کی حریف ہے۔

از بی کسان شهرم و از ناکسان دهر
گر کشتہ سر، تو سلامت، هراس کیست

میں تو شہر کے بے کسوں میں سے ہوں اور دنیا کے حقیر انسانوں میں شمار ہوتا ہوں اگر

تو نے مجھے مار ڈالا ہے تو تیرا سر سلامت رہے۔ تجھے کس کا ڈر ہے، ایک لاوارث اور بے مایہ انسان کے خون کی کسی کو کیا پروا ہو سکتی ہے۔

از پرنیان بہ عربدہ راضی نمی شود
خار رہ تو چشم بہ راہ پلاس کیست

لغت: ''پرنیاں'' = ریشم و حریر۔ ''پلاس'' ٹاٹ۔

تیری راہ کا کانٹا ریشم سے الجھنے پر راضی نہیں ہوتا۔ یہ کس کے ٹاٹ کی تاک میں ہے۔

معشوق کی راہ کا کانٹا بھی عاشق کے ٹاٹ کے کپڑوں کے درپے ہے۔

لطفت بہ شکوہ از ہوس بی شمار من
شوقم بہ نالہ از ستم بی قیاس کیست

تیرے لطف و عنایت کا جذبہ میری بے شمار خواہشات کا شاکی ہے۔ میرا شوق کس کے بے حساب جور و ستم سے نالاں ہے؟

معشوق کو عاشق کی تمناؤں کا گلہ ہے، وہ ان سب کو پورا نہیں کر سکتا اور عاشق معشوق کے بے حساب جور و ستم سے فریاد کر رہا ہے۔ دونوں برابر کی چوٹ ہیں۔

گیرم کہ رسم عشق من آوردہ ام بہ دهر
ظلم، آفریدۂ دل حق ناشناس کیست

میں نے تسلیم کر لیا ہے کہ میں نے ہی دنیا میں رسم عشق کی بنیاد ڈالی ہے۔ آخر یہ جور

وستم کس کے دل حق ناشناس کا پیدا کردہ ہے۔

یہاں کیست کا استفہام معشوق کے لیے ہے۔

صحن چمن نمونہ بزم فراغ تو

باد سحر علاقہ ربط حواس کیست

صحن چمن کیا ہے؟ تیرے سکون وراحت کا ایک نمونہ ہے۔ یہ بادِ سحری جو یوں (باغ میں) خراماں خراماں چل رہی ہے، اس کا تعلق کس کے باربط حواس کے ساتھ ہے۔

باغ محبوب کے سکون قلب وفراغت ذہن کا منظر پیش کر رہا ہے۔ باغ میں بادِ سحری کی خوش خرامی، اس منظر میں رقیب کی طرح سکون کے ساتھ گھومنے کو ظاہر کر رہی ہے۔

چنانچہ کیست کا استفہام، غیر رقیب کی طرف ہے۔ اسی کے حواس بجا ہیں۔ عاشق بے چارہ تو پریشان ہے۔

غالب، بت مرا نگہ ناز، قحط نیست

تا بامنش مضائقہ چندین، بپاس کیست

اے غالب میرے محبوب کے پاس نگاہ ناز کی کمی نہیں ہے۔ پھر میرے ساتھ اس نگاہ ناز کو جو اتنی تنگی اور مضائقہ سے استعمال کیا جاتا ہے یہ کس کے پاس خاطر ہے؟ مراد رقیب کی خاطر۔

❀❀❀

غزل نمبر(۴۴)

آنکہ بی پردہ بہ صدر داغ نمایانم سوخت

دیدہ پوشید و گمان کرد کہ پنہانم سوخت

جس نے علی الاعلان سینکڑوں نمایاں داغ لگا کر مجھے جلایا، اُس نے (میرے جلنے سے) چشم پوشی کی اور خیال کر لیا کہ چپکے چپکے جلایا ہے یعنی کسی کو اس بات کا پتا نہیں چلا۔ کیا ستم ظریفی ہے

نہ بدر جستہ شرار نہ بجا ماندہ رماد

سوختم لیک نہ دانم بچہ عنوانم سوخت

لغت: ''سوختن'' = جلنا، لازم اور متعدی، دونوں کا مفہوم دیتا ہے چنانچہ اس شعر میں سوختم لازم ہے اور سوخت متعدی ہے۔

میں جل تو گیا لیکن مجھے معلوم نہیں، اُس نے مجھے کس طرح جلا دیا کہ نہ کوئی چنگاری ہی نظر آئی، نہ ہی راکھ باقی رہی۔

عبدالرحیم خانخاناں کا شعر ہے:

مرا فروخت محبت ولی ندانستم

کہ مشتری چہ کس است و بہائی من چند است

سینہ از اشک جدا دیدہ جدا می سوزد

این رگ ابر شرر بار پریشانم سوخت

شاعر نے آنسوؤں کے تار کو "رگِ ابرِ شرربار" کہا ہے یعنی یہ آگ برسانے والا بادل ہے۔ کہتا ہے:

کہ ان آتشیں آنسوؤں نے مجھے اتنا پریشان کر کے جلایا ہے کہ سینہ الگ جل رہا ہے اور آنکھیں الگ۔

آنسوؤں نے آنکھوں کو تو جلانا ہی تھا، سینے کو بھی جہاں سے یہ آگ ابھر رہی ہے، جلا دیا ہے۔

حاجت افتادہ بروزم ز سیاهی به چراغ

دل به بی رونقیِ مهرِ درخشانم سوخت

میرا دل مہرِ درخشاں کی بے رونقی سے جل گیا، اتنی تاریکی تھی کہ دن کے وقت مجھے چراغ جلانا پڑا۔

ایک لطیف پہلو اس شعر کا یہ ہے کہ جو چراغ جلایا گیا، وہ یہی دل تھا جو مہرِ درخشاں کی بے رونقی پہ جل اٹھا تھا۔

دل جلوں کو دن بھی تاریک نظر آتا ہے۔ وہ سورج کو بے رونق دیکھ کر جل جاتے ہیں۔ یہی جلنا ہی گویا چراغ جلانا ہے کہ دن ذرا روشن ہو جائے۔

سودم از ارزشم افزون بود، آن خار و خسم

کز پی پشه توان در چمنستانم سوخت

لغت: "ارزش" = قیمت۔ "سود" = نفع۔ "خار و خس" کوڑا کرکٹ۔

میری قیمت سے میرا نفع زیادہ ہے، میں وہ خار و خس ہوں کہ مجھے ایک مچھر کے لیے چمن میں جلایا جا سکتا ہے۔

کانٹوں اور تنکوں کی باغ میں کچھ قدر و قیمت نہیں ہوتی، ہاں انھیں جلا کر مچھروں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ یہی فائدہ کافی ہے۔

کافرِ عشقم و دوزخ نه بود در خورِ من

غیرتِ گرمیِ هنگامهٔ صنعانم سوخت

لغت: "صنعان" = یمن میں ایک شہر جہاں کے شیخ صنعاں مشہور ہیں۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ وہ خدا رسیدہ بزرگ تھے لیکن ایک دخترِ ترسا پر عاشق ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت غوث الاعظم کی بددعا کا نتیجہ تھا۔ آخر بخشش ہو گئی۔

شاعر کہتا ہے:

میں کافرِ عشق ہوں، دوزخ میرے لیے مناسب جگہ نہیں۔ مجھے شیخ صنعان کی عاشقانہ سرگرمیوں پر رشک آتا ہے۔ اور اس رشک کی آگ نے مجھے جلا دیا ہے۔

پایم از گرمیِ رفتار نمی سوخت براه

در قدم سوختنِ خارِ بیابانم سوخت

میرے پاؤں میری گرمیِ رفتار سے نہیں جلے۔ میرے قدموں کے نیچے جو کانٹے آئے ان کے جلنے نے مجھے جلا دیا۔

❀❀❀

غزل نمبر (۴۳)

دربذل لآلی و رقم دست کریم است

نی نی نی، کلکم رگِ مژگان یتیم است

لغت: ''لآلی'' = لؤلؤ کی جمع، موتی۔ بذل لآلی = موتی لٹانا۔ بخشش کرنا۔ موتی لٹانے میں میرا ورق، ایک سخی کے ہاتھ کی طرح ہے۔ نہیں نہیں، میرے قلم (کلک) کی نے، ایک یتیم کی مژگاں ہیں جن سے ہمیشہ آنسو بہتے ہیں۔

گویا شاعر کے اشعار گوہر ہائے آبدار کی طرح ہیں لیکن وہ دراصل اشکہائے گرم ہیں جو اس کے سینے سے ابھرے ہیں۔

رشحِ کفِ جم می چکد از مغزِ سفالم

سیرابیِ نطقم اثرِ فیضِ حکیم است

لغت: ''سفال'' = ٹھیکری، مراد جام سفالیں۔

رشح = قطرہ قطرہ ٹپکنا۔ قطرہ۔

میرے جام سفالیں سے جو قطرہ ٹپکتے ہیں وہ گویا دست جمشید سے ٹپکتے ہوئے قطرے ہیں۔ میرے نطق کی سیرابی فیض خداوندی کا اثر ہے، یعنی میری شاعری عطیہ ایزدی ہے۔

از آتش لهر اسپ نشان می دهد امروز

سوزی که به خاکم ز تو در عظم رمیم است

لغت: ''آتش لہراسپ'' = آتشکدہ لہراسپ۔ ''عظم رمیم'' = گلی سڑی ہڈیاں۔

کہتا ہے کہ تیری محبت نے میرے جسم مردہ کی ہڈیوں میں آگ بھڑکائی ہوئی ہے۔ وہ لہراسپ کا آتشکدہ معلوم ہوتی ہے۔

از حرف من اندیشه گلستانِ خلیل است

از روی تو آئینه کفِ دست کلیم است

میرے اشعار (حرف) سے میرے افکار گلستانِ خلیل بن گئے ہیں۔ تیرے چہرے کے عکس سے آئینہ کلیم کی ہتھیلی نظر آتا ہے یعنی میرے اشعار تخیل کو گلستان خلیل کی طرح شگفتہ کرتے ہیں اور محبوب کے عکس سے آئینہ ید بیضا بن جاتا ہے۔

''گلستان خلیل'' اور ''کف دست کلیم'' سے شعر میں صنعت تلمیح آگئی ہے۔

چشم و نگهت گردش جامی ز نبید است

کلک و ورقم تاب سهیلی بر ادیم است

لغت: ''ادیم'' = چمڑا۔ ''سہیل'' = ایک ستارہ۔

عرب میں ایک جگہ طائف ہے جہاں کا چمڑا بہت مشہور ہے کہ اس میں بجائے بدبو خوشبو پائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سہیل ستارے کی چمک پڑنے سے اس میں یہ صفت پائی جاتی ہے۔

مولانا جامی، رسول پاک کی نعت و مناجات میں رسول پاک سے کہتے ہیں:

ادیم طائفی نعلین پا کن

شراک از رشتہ جان ہای ما کن

(ادیم طائف کی نعلین زیب پا کرلے اور ہماری رگ جاں کو نعلین کا تسمہ بنالے)۔

تیری آنکھیں اور نگاہیں ایسی ہیں جیسے جام شراب گردش میں ہو۔ میرے قلم اور

کاغذ، ایسے ہیں جیسے سہیل کی روشنی ادیم پر پڑ رہی ہو۔

در جستن مانند تو نظارہ زبون است

در زادن ھمتای من اندیشہ عقیم است

لغت: ''عقیم'' = بانجھ عورت۔ '' مانند'' = مثیل۔ نظیر۔ ''ہمتا'' = برابر کا شریک۔

تیرا نظیر ڈھونڈنے میں نظریں عاجز ہو کر رہ جاتی ہیں اور میرا ہمسر پیدا ہونے کے بارے میں تصور بانجھ ہو کر رہ جاتا ہے۔

یعنی محبوب کے حسن کا کوئی ثانی نہیں اور میرے جیسا عاشق اور شاعر بھی پیدا نہ ہوگا۔

ذوق طلبت، جنبش اجزای بھار است

شور نفسم، رعشۂ اعضای نسیم است

تیری طلب و تلاش میں وہ لذت ہے جیسے اجزاے بہار حرکت میں آ گئے ہوں اور میرے سانس کا شور ایسا ہے جیسے نسیم کے اعضا میں تھرتھری پیدا ہو گئی ہو۔

اس غزل کے دوسرے اشعار کی طرح اس شعر میں بھی دو مصرعوں کے الفاظ کا اتار چڑھاؤ اور اندرونی ترنم پایا جاتا ہے۔ اس شعر میں صنعت موجود ہے یعنی پہلے مصرعے میں جو الفاظ آئے ہیں وہ دوسرے مصرعے کے الفاظ کے ساتھ علی الترتیب ہم وزن ہیں۔ ذوق طلب کے لیے جنبش اجزاے بہار کا استعارہ اور شور نفس کے لیے رعشہ اعضاے نسیم کا استعارہ بے حد خوبصورت ہیں۔

در نطق مسیحا دم، از خصم چہ باک است

در ناز خود می رمی، از غیر چہ بیم است

میری قوت گویائی میں مسیحا کے سانس کا سا اعجاز ہے، مجھے دشمن کا کیا خوف۔ تو ناز میں اپنے سے بھی کھو جاتا ہے، تجھے رقیب کا کیا ڈر۔

شعر میں ''ز خود می رمی'' کے لفظی معنے ''اپنے آپ سے بھاگنا'' ہے، اس کا اردو ترجمہ بے خودی ہی ہے۔ یعنی معشوق اپنے ناز کے عالم میں بے خود اور سرشار رہتا ہے۔ انسے رقیب کی طرف توجہ کرنے کی بھی فرصت نہیں۔

بی پردہ ستم کن، رخت از بادہ دو رنگ است

بی صرفہ بنالم، دلم از غصہ دو نیم است

محبوب کا چہرہ شراب سے دو رنگ ہے، یعنی چہرے کی سرخی سے ظاہر نہیں ہوتا کہ نشے کا اثر ہے یا غصے کا۔ دو رنگی سے مقصود یہ ہے کہ چہرے کی سرخی میں نشے اور غصے کی آمیزش ہے۔

کہتا ہے کہ کھل کے ستم کر، تیرے چہرے میں نشے سے دو رنگی آ گئی ہے (ہمیں ستم اٹھانے میں مزہ نہیں آتا۔ پتا نہیں چلتا کہ تو نشے میں ایسا کر رہا ہے یا واقعی ستم ڈھانا چاہتا ہے)۔ میں بے فائدہ فریاد کر رہا ہوں، میرا دل غم سے دو نیم ہو رہا ہے۔ دو نیم دل سے فریاد کیا نکلے گی۔ پورا دل ہو تو کوئی بات بھی ہے، اس لیے بے صرفہ کا لفظ لایا ہے۔

بختم نہ دھد کامِ دلِ غم زدہ غالب

گوئی لب یار است کہ در بوسہ لئیم است

لغت: ''کام دل دادن'' = دل کی خواہش پوری کرنا۔ ''لئیم'' = کنجوس۔

غالب! میری بدنصیبی میرے غمزدہ دل کی تمنائیں پوری ہونے نہیں دیتی، گویا میرا بخت، لب یار ہے کہ بوسہ دینے میں کنجوس ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر (۴۴)

در بند تو چشم از دو جہاں دوختہٴ ہست

ہشدار کہ شہبازِ تو آموختہٴ ہست

لغت: ''چشم از دو جہاں دوختن'' = دونوں جہاں سے آنکھیں بند کر لینا۔

''چشم از دو جہاں دوختہ'' = دونوں جہاں سے بے پروا۔

''شہباز آموختہ'' = سدھایا ہوا شہباز۔

شکاری شہباز کی دونوں آنکھوں پہ پٹیاں بندھی ہوتی ہیں، گویا اس کی آنکھیں دونوں جہاں سے بند ہو جاتی ہیں (سوائے وقت شکار) شہباز کے دونوں پاؤں ڈوری سے بندھے ہوتے ہیں، اسی لیے شاعر بند کا لفظ لایا ہے۔

کہتا ہے: تیری قید محبت میں ایک ایسی ہستی ہے جس نے دونوں دنیاؤں سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں لیکن ہوشیار! کہ یہ شہباز سدھایا ہوا ہے۔

شہباز دنیا جہاں سے غافل ہو تو، شکار سے غافل نہیں ہوتا۔ اسی طرح عاشق، دونوں جہاں سے بے نیاز رہ سکتا ہے لیکن معشوق سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، وہ اس کی زد میں آ کے رہے گا۔

افغان مرا بی ہستی ساختہٴ نیست

در زمزمہ بوی جگر سوختہٴ ہست

لغت: ''افغاں'' = فغاں۔ بے ہشی ساختہ'' = بناوٹی بیہوشی۔ ''زمزمہ'' = وہ بھجن جو آتش پرست عبادت کے وقت اپنے معبدوں میں، مدھم سروں میں گاتے تھے۔ نغمہ۔

میری دبی دبی سی فریاد، مصنوعی نہیں ہے۔ اس زمزمے میں (میرے) جگر سوختہ کی بو

شامل ہے۔

شعر میں نکتہ یہ بھی ہے۔ آتش پرست زمزمہ گاتے وقت بخور بھی جلاتے تھے۔ اسی رعایت سے شاعر نے بوئے جگر سوختہ کہا ہے۔

در دیدہ ز رخ پردہ بر انداختہٴ نیست

در سینہ دو صد عربدہ اندوختہٴ ہست

نظروں کے سامنے کوئی ایسا معشوق نہیں جس نے چہرے سے پردہ اٹھا لیا ہو، ایسا معشوق ہے جو سینے میں ہمارے خلاف لڑائی کے سینکڑوں ہنگامے سمیٹے ہوئے ہے۔

ز آنسوی بمیدان وفا تاختہٴ نیست

زین سو ہوس جانسپری توختہٴ ہست

لغت: ''تاختن'' = بھاگ دوڑ کرنا اور تاخت و تاز کرنے والا۔

''توختن'' = حاصل کرنا اور دینا۔ ''توختہ'' = جمع کیا ہوا اور ادا کیا ہوا، دونوں۔ یہ لفظ اضداد میں سے ہے، یعنی اس کے معنی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اس طرف سے میدان وفا میں تگ و تاز کرنے والا کوئی نہیں اس طرف جانسپاری کی ہوس جمع کیے بیٹھے ہیں۔

یعنی ادھر معشوق میں کوئی جذبہ وفا نہیں کہ وہ میدان وفا میں اتر آئے اور لوگوں کے دلوں کو تاخت و تاراج کرے۔

ادھر عاشق کے دل میں بے پناہ جاں نثاری کا جذبہ ہے۔

در راہ ثوابش قدِ افراختہٴ نیست

در بزم عتابش رخ افروختہٴ ہست

لغت: "ثواب" = نیک عمل یا صلۂ نیک عمل۔

"عتاب" = ثواب کا الٹ، براصلہ۔

یہاں ثواب و عتاب دونوں ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ اس کے لطف و عنایت سے کسی کی اتنی نوازش نہیں ہوتی کہ وہ اپنا قد بلند کر سکے اور اس کی بزم عتاب میں غصے سے بھڑکا ہوا چہرہ موجود ہے۔

یعنی معشوق کسی کو لطف و محبت سے نہیں نوازتا، ہاں عتاب سے ضرور پیش آتا ہے۔

در تاب مرو، غالب اگر بیہدہ گردد

در کوی تو گوئی سگ پا سوختہٴ ہست

اگر غالب بیہودہ ہو جائے تو غصے میں نہ آنا، یہ سمجھ لینا کوچے میں کوئی پاؤں جلا کتا آ گیا ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر (۴۵)

با من کہ عاشقم سخن از ننگ و نام چیست

در امر خاص حجت دستور عام چیست

میں عاشق ہوں، میرے ساتھ ننگ و ناموس کی بات کرنا کیسا؟ یہ ایک خاص معاملہ

ہے اس معاملے کو عام دستور کے معیار سے نہیں پرکھا جا سکتا۔

مستم ز خونِ دل کہ دو چشم ازان پُر است

گوئی مخور شراب و نہ بینی بہ جام چیست

میں اپنا خون دل پی کر مست ہو گیا ہوں اور اسی خون دل کی سرخی میری آنکھوں میں بھری ہوئی ہے۔ تو (یہ سمجھ کے میں شراب کے کہ نشے میں ہوں) کہتا ہے شراب نہ پی اور یہ نہیں دیکھتا کہ میرے جام میں کیا ہے (شراب نہیں ہے، خون دل ہے)۔

با دوست ہر کہ بادہ بہ خلوت خورد مدام

داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست

جو شخص ہمیشہ اپنے دوست کے ساتھ خلوت میں بیٹھ کے شراب پیتا ہے، جانتا ہے کہ حور کیا ہے، کوثر کس شے کا نام ہے اور دار السلام کسے کہتے ہیں۔

شاعر نے دوست کو حور، شراب کو کوثر اور خلوت کو جنت کہا ہے۔ مدام کا لفظ یہاں بہت موزوں ہے کہ اس کا ایک مفہوم شراب (مدام) ہے اور دوسرا (مُدام) ہمیشہ۔ چونکہ جنت کی لذتیں ہمیشہ رہنے والی ہیں اس لیے یہ لفظ بڑا پر معنی ہے۔

دلخستہٴ غمیم و بود می دوای ما

با خستگان حدیث حلال و حرام چیست

ہم غم کے مارے ہوئے ہیں، شراب ہی ہمارا علاج ہے۔ شراب کے حرام و حلال ہونے کے بارے میں دکھی لوگوں سے باتیں کرنا بے کار ہے۔

جو چیز دوا کے طور پر پی جائے اس کا حلال و حرام ہونا خارج از بحث ہوتا ہے:

مَی است چارۂ غم، ہوشمند را چہ خبر

در روز تیرہ از شب تارم نہ ماند بیم

چون صبح نیست خود چہ شناسم کہ شام چیست

میرا دن اتنا سیاہ ہے کہ سیاہ رات کا خوف ہی نہ رہا۔ جب صبح ہی نہ ہو تو پھر میں کیا جانوں کہ شام کیا ہوتی ہے۔

با خیل مور می رسی از رہ خوش است فال

قاصد بگو کزان لب شیرین پیام چیست

لغت: ''خیل'' = اسم جمع ہے، خصوصاً گروہ اسپان کے لیے آتا ہے لیکن اس لفظ کا اطلاق، انسان، حیوان، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ مرزا غالب نے اس شعر میں 'خیل مور'' استعمال کیا ہے۔ مراد انبوہ و ہجوم مور ہے۔

اے قاصد تو آرہا ہے اور تیرے ہمراہ چیونٹیوں کا ایک اژدحام ہے، یہ اچھی فال معلوم ہوتی ہے۔ بتا تو سہی میرے محبوب کے لب شیریں سے کیا پیغام لے کے آرہا ہے۔

گفتی قفس خوش است، توان بال و پر کشود

باری علاج خستگی بند دام چیست

تم نے یہ تو کہہ دیا کہ قفس نہایت اچھا ٹھکانا ہے، یہاں بال و پر کے کھولنے کی گنجائش ہے۔ ہاں یہ بھی تو بتا دے کہ جال کی بندھنوں کے کمزور ہونے کا کیا علاج ہے۔

یعنی بال و پر کھولیں گے تو قفس کے بند ٹوٹ جائیں گے اور ہم لذت قید و بند سے محروم ہو جائیں گے۔

نیکی ز تست از تو نخواہیم مزد کار

ور خود بدیم کار تو ایم، انتقام چیست

نیکی تیرا عطیہ ہے، اس لیے ہم نیکی کا تجھ سے صلہ (مزدوری) نہیں مانگتے، اور اگر ہم برے ہیں تو یہ بھی تیرا ہی کام ہے، پھر بدی کی سزا کیسی۔

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت

پرسد چرا کہ نرخ می لعل فام چیست

غالب نے اگر اپنا خرقہ اور قرآن بیچ نہیں دیے تو وہ شراب ناب کا نرخ کس لیے پوچھ رہا ہے۔

گویا یہ چیزیں بیچ کر وہ شراب خریدنا چاہتا ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر (۴۶)

گل را بہ جرم عربدۂ رنگ و بو گرفت

راہ سخن بہ عاشق آزرم جو گرفت

لغت: ''عربدہ'' = جنگجوئی و بدخوئی۔ اس کا ایک مفہوم فریب دہی اور حقہ بازی۔

"آزرم" = عربدہ کی ضد ہے نرمی و آشتی و صلح۔ ایک معنی انصاف بھی ہے۔ "آزرم جو" = انصاف طلب کرنے والا۔

پھول کو رنگ و بو کا فریب دینے میں پکڑا اور وہاں سے انصاف طلب رنے والے عاشق کی بات کرنے کا سلسلہ نکلا۔

لطف خدای ذوق نشاطش نمی دھد

کافر دلی کہ باستم دوست خو گرفت

لغت: "خوگرفتن" = عادی ہو جانا۔

وہ کافر دل جو معشوق کے جور و ستم کا عادی ہو گیا ہو، اسے اللہ تعالیٰ کا لطف اور مہربانی کوئی خوشی اور لذت عطا نہیں کرتے۔

چو اصل کار در نظر ھمنشین نہ بود

بی چارہ خردہ بر روش جستجو گرفت

لغت: "خردہ گرفتن" = نکتہ چینی کرنا۔

چونکہ میرے ہمنشین کی نظر میں معاملہ کی اصل غایت نہ تھی، بے چارے نے یونہی میری تلاش و جستجو کے انداز پہ نکتہ چینی شروع کر دی۔

در خلوتی کشود خیالم رہ دعا

کز تنگی بساط، نفس در گلو گرفت

لغت: "نفس در گلو گرفت" = سانس گلے ہی میں اٹک کر رہ گیا، سانس نہ لینے پائے۔

میرے تصور نے ایک ایسی خلوت کی طرف دعا کا راستہ کھولا کہ جہاں کی تنگی کے باعث سانس لینا بھی دشوار تھا۔

یعنی میں نے دعا مانگنا چاہی لیکن وہ دعا ایسی تھی کہ لب تک نہ آسکی۔

شرمندۂ نوازشِ گردون نماندہ ام

گر چاک دوخت، جامہ بہ مزد رفو گرفت

شکر ہے، مجھے آسمان کی نوازشات کا شرمندۂ احسان نہ ہونا پڑا۔ اگر اس نے میرے چاک جامہ کو سیا بھی تو اصل جامہ رفو کرنے کی مزدوری کے طور پر لے لیا۔

قدرت کچھ عطا کرتی ہے تو اس کے عوض اس سے کہیں زیادہ چھین لیتی ہے۔

با خویشتن چہ مایہ نظر باز بودہ است

کز من دلِ مرا بہ ھزار آرزو گرفت

میرا محبوب، اپنے حسن کے دیکھنے میں بھی کتنا نظر باز ہے کہ اس نے میرا دل چھینا اور ہزاروں آرزوؤں کے ساتھ چھینا۔

معشوق کو اپنے حسن کا کس قدر احساس ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ عاشق اس کی ہر ادا پر مرمٹے۔

گفتم خود از مشاھدہ بخائش آورد

خوش بادحال دوست کہ حالم نکوگرفت

میں نے سوچا تھا کہ میرا محبوب میری حالت زار کا مشاہدہ کرے گا تو اسے خود میرے

حال پر رحم آئے گا۔ اللہ اسے خوش رکھے، اس نے مجھے دیکھا اور سمجھا کہ میرا حال اچھا ہے:

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

از یک سبوست بادہ وقسمت جدا جدا
جمشید جام برد و قلندر کدو گرفت

شراب تو ایک ہی خم سے آتی ہے لیکن ہر ایک کا حصہ الگ الگ ہے۔ جمشید کو ایک جام ملا، اور قلندر نے کدو بھر لیا۔

قدرت اپنی نعمتیں، شاہ و گدا سب پر نچھاور کرتی ہے لیکن گدا کو جو میسر آتا ہے وہ شاہ کے نصیب میں کہاں۔

فرمان روانہ گشت مسلمان بہ ہیچ قصر
گر رفت مغ ز میکدہ ترسا فرو گرفت

مسلمان کو کبھی کسی محل میں فرماں روا ہونے کا موقع نہ ملا۔ میکدے سے پیر مغان چلا گیا تو اس کی جگہ ترسازادہ آبیٹھا۔

یعنی میکدے میں مُلا کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ یہ عالی ظرفوں ہی کا مقام ہے۔

ایمان گر بہ خوف و رجا کردم استوار
اخلاص در نمود و قایم دو رو گرفت

اگر میں اپنے ایمان کی بنیاد کو امید وبیم پر استوار کرتا تو میری وفاداری کے خلوص میں

دورخی آجاتی ہے۔

عام لوگ یا تو جنت کی امید میں یا دوزخ کے خوف سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے ایمان میں اخلاص نہیں ہوتا۔

ھر فتنہ در نشاط و سماع آورد مرا
گوئی فلک بہ عربدہ ھنجار او گرفت

لغت: ''ہنجار'' = طور طریقہ۔ ''ہنجار گرفتن'' = طریقہ لے لینا۔

آسمان کی طرف سے جو فتنہ بھی نازل ہو، مجھے اس سے انتہائی مسرت ہوتی ہے۔ میں خوشی میں رقص کرنے لگتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان نے دشمنی کے انداز اسی معشوق سے سیکھے ہیں۔

رضوان چون شہد و شیر بہ غالب حوالہ کرد
بی چارہ باز داد و می مشکبو گرفت

دربانِ جنت (رضوان) نے جب جنت میں غالب کو شہد و شیر پیش کیے تو بے چارے نے یہ چیزیں واپس کردیں اور شراب مشکبو لے لی۔

❁❁❁

غزل نمبر(۴۷)

غبارِ طرفِ مزارم بہ پیچ و تابی ھست
ھنوز در رگِ اندیشہ اضطرابی ھست

عاشق، اپنے محبوب کے عشق میں عمر بھر صحراؤں کی خاک چھانتا رہا اور اسی دھن میں جان دے دی، لیکن دل کا اضطراب اور جنوں خیز خیالات کا طوفان کم نہ ہوا۔ چنانچہ اس کی قبر سے جو گرد وغبار اٹھتا ہے وہ بھی پیچ و تاب کھائے ہوئے ہے۔

بہ نانگِ صور سر از خاک بر نمی دارم
ھنوز در نظرم چشمِ نیم خوابی ھست

لغت: ''چشمِ نیم خواب'' = وہ آنکھ جو نیند کی وجہ سے پوری نہ کھلی ہو، یا سوتے میں نیم وا ہو۔ چشمِ نیم خواب کا ایک مستانہ انداز ہوتا ہے جو دل لبھاتا ہے:

ہے چشمِ نیم باز عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے

میں قیامت کے دن صور پھونکے جانے پر بھی خاک سے سر نہیں اٹھاؤں گا کیونکہ ابھی تک محبوب کی نیم خواب آنکھیں میری نظروں کے سامنے ہیں۔ ناصر سرہندی نے اسی طرح کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

روز محشر ھم نخواھد دید روئی آفتاب
ھر کہ زیر سایہ زلفی شبی در خواب شد

ز سردیِ نفسِ نامہ بر توان دانست
کہ نارسیدہ پیامِ مرا جوابی ھست

لغت: ''سردیِ نفس'' = ٹھنڈا سانس، یا سرد آہیں۔

قاصد کے ٹھنڈے سانس بتا رہے ہیں کہ میرے نہ پہنچے ہوئے پیغام کا کچھ نہ کچھ جواب ہے۔

نامہ بر عاشق کا پیغام لے کر گیا ہے۔ لیکن معشوق کے سخت رویے کے باعث پیغام پہنچا نہیں سکا، اور جو کچھ اسے پیش آیا ہے عاشق سے کہتے ہوئے گھبرا رہا ہے۔ نامہ بر کی حالت زاری ظاہر کر رہی ہے کہ جواب ملا، جسے شاعر نے ''جوابی'' کے بڑے خوبصورت لفظ میں ظاہر کیا ہے۔

بہ ھرزہ جان بہ غلط دادم و ندانستم
کہ یار دیر پسندی و زود یابی ھست

لغت: ''دیر پسند'' اور ''زود یاب'' دونوں اسم فاعل ترکیبی ہیں۔ دیر پسند وہ شخص ہے جو دوسروں کو دیر کے بعد پسند کرتا ہے۔ اسی طرح زود یاب کسی شے کو جلدی سے حاصل کرنے والا۔

''جاں بہ غلط دادن'' = غلطی سے جان دینا۔ ''بہ ہرزہ'' = بے فائدہ۔

میں نے یونہی بے فائدہ اپنی جان محبوب کی نذر کردی، مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ دیر پسند ہے اور زود یاب ہے۔

زود یاب تو اس لیے ہے کہ اسے میری جان فوراً مل گئی اور دیر پسند اس لیے کہ ایک عرصہ کے بعد اسے یہ احساس ہوگا کہ جان قربان کرنے والا اچھا انسان تھا:

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

نظر فروز اداها بدشمن ارزانی

بمن سپار اگر داغِ سینہ تابی ھست

لغت: ''ارزانی'' = یہ لفظ محاورۃً آیا ہے۔ بدشمن ارزانی کا مفہوم ہے دشمن کو عنایت کر دے۔

''سینہ تاب'' = اس کے دو معنوی پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک سینہ کو جلا دینے والا اور دوسرے سینے کو روشن کرنے والا یہاں دونوں موزوں ہیں۔

کہتا ہے:

نظروں کو روشن کر دینے والی ادائیں رقیب کو عطا کر دے۔ ہاں اگر تیرے پاس سینے کو چمکانے والا داغ ہے تو وہ میرے سپرد کر دے۔

عاشق کے لیے داغ محبت اور داغ فراق ہی کافی ہے۔

ز شوریِ نمک پرسشِ نہانی تست

اگر مرا جگر تشنہ عتابی ھست

اگر میرا جگر تیرے عتاب کا پیاسا ہے تو یہ بھی تیری عنایت ہے اس لیے کہ اس عتاب میں تیری پرسشِ نہاں کی نمک ریزی کی آمیزش شامل ہے۔

یعنی محبوب کا عتاب سے پیش آنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مجھے اس قابل سمجھتا ہے۔ اگر عتاب بھی نہ ہو تو پھر کیا ہوگا۔

خود اولین قدحِ می بنوش و ساقی شو

کہ آخر از طرفِ تست گر حجابی ھست

پہلے خود ایک جام مے پی لے اور پھر ساقی بن کر ہمیں پلا۔ آخر تیرے اور میرے درمیان جو حجاب ہے وہ تیری طرف سے ہے اور وہ یونہی دور ہوگا:

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن

مگر دھم جگر تشنہ را دلی بہ دروغ

نشان دھید براھش اگر سرابی ھست

لغت: ''سراب'' = وہ ریت جو دور سے دھوپ میں پانی کی طرح چمکتی ہے۔

اگر میرے محبوب کی راہ میں کوئی سراب ہو تو اس کی نشان دہی کر دو۔ شاید وہ سراب دکھا کر میں اپنے پیاسے جگر کی تسکین کر سکوں۔

یہاں ''دل'' کا لفظ حوصلے کا مفہوم دیتا ہے۔

ز سرد مہری ایام نیستیم نژند

کہ در خرابۂ ما روی آفتابی ھست

ہمیں زمانے کی سرد مہری سے کوئی رنج نہیں ہوتا کیونکہ ہمارے برباد اور اجڑے ہوئے گھر میں دھوپ تو آ جاتی ہے۔ قدرت کا یہی عطیہ کافی ہے۔

بہار ھند بود بر شگال، ھان غالب

درین خزان کدہ ھم موسمِ شرابی ھست

غالب، برسات کا موسم ہندوستان کی بہار ہے۔ ہاں اس خزاں کدے میں بھی موسم شراب ہوتا ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر (۴۸)

تا بسویم نظرِ لطف جمس تامسن است
سبزہ ام گلبن و خارم گل، خاکم چمن است

جب تک مجھ پر جمس تامسن کی نگاہِ لطف ہے، میرا سبزہ پھولوں کی کیاری، میرا کانٹا پھول اور میری خاک چمن کی حیثیت رکھتی ہے۔

ای کہ تا نام تو آرائش عنوان بخشید
صفحہ نام بہ شادابی برگ سمن است

جب سے تیرا نام (''میری تحریر'') کا زیب عنوان بنا ہے، تو وہ صفحہ اپنی شادابی اور تازگی سے چنبیلی کا پھول نظر آتا ہے۔

کلکم از تازگی مدح تو در بارۂ خویش
شارح انبتہ اللہ نباتا حسن است

تیری مدح وستائش کی تازگی سے میرا قلم اپنے بارے میں ''اللہ نے اسے میٹھا پھل دیا'' کے الفاظ دہرا رہا ہے۔

گہر افشانی مدحِ تو بجنبش آورد
خامہ ام را کہ کلید در گنج سخن است

تری مدح کی گہرافشانی سے میرے قلم میں جنبش آگئی ہے۔۔وہ قلم جو شعر وسخن کے

خزانے کی کنجی ہے۔

ھردم از رای منیر تو کند کسب ضیا
مہر تابان کہ فروزندۂ این انجمن است

یہ مہر تاباں، جو اس دنیا کی محفل کو روشنی بخشتا ہے، ہمیشہ تیری روشن رائے ہی سے کسب نور کرتا ہے۔

بخیالِ تو بہ مہتاب شکیبم کہ مگر
عکس روی تو درین آئینہ پرتو فگن است

تیرے تصور میں میں چاندنی (چاند) کو دیکھ کر تسکین پاتا ہوں، شاید اس لیے کہ اس آئینے میں تیرے چہرے کا عکس پڑ رہا ہے۔

راست گفتارم و یزدان نہ پسندد جز راست
حرف ناراست سرودن روش اھرمن است

میں سچ بات کہتا ہوں اور خدا سچ بات کے سوا کچھ اور پسند نہیں کرتا۔ جھوٹ بات کہنا تو شیطان کا طریق کار ہے۔

آنچنان گشتہ یکی دل بہ زبانم کہ مرا
میتوان گفت کہ لختی ز دل اندر دھن است

میرا دل اور میری زبان اس طرح ایک ہو گئے ہیں کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ میری

زبان، میرے دل کا ہی ایک ٹکڑا ہے۔

راستی این کہ دمِ مہر و وفای تو بدل

باھم آمیختہ مانند روان با بدن است

سچ تو یہ ہے کہ تیری محبت میرے دل میں اس طرح سرایت کرگئی ہے جیسے بدن میں روح سمائی ہوئی ہو۔

دوری از دیدہ اگر روی دھد، دور نہ

زانکہ پیوستہ ترا در دل زارم وطن است

اگر تیرے اور میرے درمیان کوئی دوری نظر آتی ہے تو تو واقعی دور نہیں ہے، اس لیے کہ تو میرے میں ہمیشہ مکین رہتا ہے۔

داورا گرچہ ھمایم بہ ھمایون سخنی

لیک در دھر مرا طالع زاغ و زغن است

اے آقا اگرچہ میں مبارک کلامی کے باعث ہما ہوں لیکن اس دنیا میں مجھے کوے اور چیل کا سا نصیبہ میسر آیا ہے۔

جز بہ اندوہِ دل و رنج تنم نفزاید

نالہ ھر چند ز اندوہِ دل و رنجِ تن است

اگرچہ میں غم دل اور رنج تن ہی کے ہاتھوں فریاد کرتا ہوں، فریاد کرنے سے اس رنج وغم میں اضافہ ہو جاتا ہے (کمی نہیں ہوتی)۔

سینہ می سوزد از آن اشک کہ در دامن نیست

بہ جگر می خلد آن خار کہ در پیرھن است

میرا سینہ ان آنسوؤں سے جل رہا ہے جو بہ کر دامن میں نہیں ٹپکے اور میرے جگر میں وہ کانٹا چبھ رہا ہے جو میرے پیراہن میں ہے۔

بی کسی ھای من از صورت حالم در یاب

مردہ ام بر سر راہ و کفِ خاکم کفن است

میری بیکسی کا اندازہ میری صورت حال سے ہو سکتا ہے۔ میں سر راہ پڑا ہوا مردہ ہوں اور ایک مشت خاک میرا کفن ہے۔

حیف باشد کہ دلم مردہ و پرسش نکنی

بہ جھان پرسش ماتم زدہ رسم کھن است

کتنے افسوس کی بات ہے کہ میرا دل مردہ ہو اور تو پرسان حال نہ ہو حالانکہ دنیا میں ماتم زدہ انسان کی پرسش کرنا پرانی رسم ہے۔

چشم دارم کہ فرستی بہ جواب غزلم

آن رضا نامہ کہ از لطف تو مطلوب من است

میں امید کرتا ہوں کہ میری اس غزل کے جواب میں تو ایک ایسا ہی نامہ بھیجے گا جس کی مجھے تیری مہربانیوں سے توقع ہے۔

غالب خستہ ، بہ جان، جای بر آن در دارد
گر بہ تن معتکفِ، گوشۂ بیت الحزن است

اگر چہ غالب، جسمانی طور پر ایک غمکدے کا مکین ہے تاہم ذہنی طور پر (بہ جاں) اس دوروازے پر (یعنی ممدوح کی) اُس کا مقام ہے۔

❁❁❁

غزل نمبر (۴۹)

نہ ھرزہ ھمچو نی از مغزم استخوان خالی است
کہ جائی نالہ زاری درین میان خالی است

لغت: ''از مغزم استخواں'' = از مغز استخوان من۔

میری ہڈیاں (بانسری) کی طرح مغز سے بے فائدہ خالی نہیں ہیں بلکہ یہ جگہ نالہ و فریاد کے لیے خالی رکھی ہوئی ہے۔ یعنی میری ہڈیاں تک فریاد سے لبریز ہیں۔

روم بہ کعبہ ز کوئی تو و ز حق خجلم
ز سجدہ جبھہ و از پوزشم زبان خالی است

لغت: ''جبھہ'' = جبیں ''خجل'' = شرمندہ۔

تیرے کوچے کو چھوڑ کر کعبے کی طرف جا رہا ہوں لیکن حق تعالیٰ سے شرمندہ ہوں کہ میری جبیں سجدے سے اور زباں عذر خواہی سے خالی ہے۔

کہا معشوق کے کوچے کی سرزمیں کہ قدم قدم پر سجدہ بے قرار ہے اور ساتھ ساتھ زبان سے معذرت بھی کی جا رہی ہے۔ اور کہاں کعبے کی راہ کہ یہ دونوں باتیں غائب ہیں اور سفر بے دلی سے طے ہو رہا ہے۔

ھجوم گل بہ گلستان ھلاک شوقم کرد
کہ جا نماندہ و جای تو ھمچنان خالی است

باغ میں پھولوں کا ہجوم دیکھ کر مجھے میری بے تابی شوق نے مار ڈالا کہ سارا باغ تو پھولوں سے پٹا پڑا ہے لیکن تیری جگہ خالی پڑی ہے۔

بہار کا موسم ہے، جدھر نظر دوڑاؤ پھول ہی پھول ہیں، عاشق اس منظر کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے کہ اس ہجوم گل میں اس کا اپنا پھول یعنی محبوب موجود نہیں۔ اس سے اس کی بے تابی شوق دیدار بڑھ جاتی ہے اور وہ ہلاک شوق ہو جاتا ہے۔

گریستم نگرستی، بخون تپم امروز
ز پارۂ جگرم چشم خونچکان خالی است

میں تیرے لیے رویا اور تو نے دیکھا تک نہیں، میں خون میں تڑپ رہا ہوں۔ آج یہ عالم ہے کہ میری خوں فشاں آنکھیں، میرے جگر کے ٹکڑوں سے خالی پڑی ہیں۔

یعنی رو رو کر جگر کا خون بہا دیا اور محبوب کی بے نیازی دیکھیے کہ اس نے دیکھا تک نہیں۔ اب میں اس خون جگر میں پڑا تڑپ رہا ہوں اور آنکھیں خشک ہو کر رہ گئی ہیں۔

نہ شاھدی بہ تماشا نہ بیدلی بہ نوا
ز غنچہ گلبن و از بلبل آشیان خالی است

نہ کوئی معشوق جلوہ گر ہے، نہ کوئی عاشق بیدل ہی مصروفِ فریاد۔ پھولوں کی کیاری کلی سے اور آشیاں بلبل سے خالی پڑا ہے۔

شاعر نے پہلے مصرعے میں جو بات کہی ہے وہی دوسرے مصرعے میں استعارۃً دہرائی ہے۔ گویا شاہد کے لیے غنچہ اور بیدل کے لیے بلبل کا استعارہ لایا ہے۔

وہ بھی کیا افسردہ فضا ہوگی جہاں نہ حسن کی جلوہ گری ہو اور نہ عشق کی نوا گری۔

کنم بہ جنبشِ دل شیشہ از پری لبریز
سرم ز بادِ فسون سنجیِ زبان خالی است

لغت: ''باد'' = ہوا، غرور و نخوت۔

''فسوں سنجی زباں'' = زباں کی خوش گفتاری اور سحر طرازی۔ میرا سر زباں کی خوش گفتاری کے خیال سے خالی ہے (میں باتوں کے جادو سے نہیں) دل کی حرکت کے ذریعے پری کو شیشے میں اتار لیتا ہوں۔

پری کو شیشے میں اتارنے سے کسی کو رام کرنا مقصود ہوتا ہے، لوگ اس کے لیے کوئی افسوں پڑھتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں زبان کی فسوں طرازی کا قائل نہیں ہوں۔ میں یہ کام دل سے لیتا ہوں۔

معشوق پر لفظوں کا جادو نہیں چلاتا، دل کے خلوص سے اسے مسخر کر لیتا ہوں۔

گرش بدیدنِ من گریہ رو نداد چہ جرم
نہادِ آتشِ شوقِ من از دخان خالی است

اگر مجھے دیکھ کر میرے معشوق کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے تو اس کی کیا خطا، میری

محبت کی آگ کی طینت ہی ایسی ہے کہ وہ دھوئیں سے خالی ہے۔ اس سے کوئی دھواں نہیں اٹھتا کہ جس کے لگنے سے آنکھوں میں آنسو آجائیں۔

آتشِ دل یا آتشِ عشق جلتی ضرور ہے۔ لیکن نظر نہیں آتی۔ اس سے عام آگ کی طرح دھواں ہی نہیں اٹھتا کیونکہ اس کی فطرت ہی کچھ اور ہے۔

مقصود یہ ہے کہ عشق کی آگ عشق کو تو جلاتی ہے، معشوق پر اثر انداز ہوتی ہے کہ نہیں یہ اور بات ہے۔

پر از سپاسِ ادای تو دفتری دارم
کہ یکسر از رقمِ پرسشِ نہان خالی است

لغت: ''سپاسِ ادا'' = معشوق کے ناز و ادا کا شکریہ۔

تیرے ناز و ادا کے شکرانے کا ایک ایسا دفتر موجود ہے جو پرسشِ نہاں کی تحریر سے یکسر خالی ہے۔

محبوب کے ناز و ادا کا کوئی شمار نہیں ہے اور عاشق ہر ادا کے لیے شکر گذار ہے۔ ان شکر گزاریوں کا ایک دفتر (طویل فہرست) بن چکا ہے لیکن اس دفتر میں کوئی ایسی ادا شامل نہیں جسے پرسشِ نہاں کہا جا سکے یعنی وہ ایسی ادا ہو کہ جس سے معشوق کا لطیف سا التفات اور عنایت ٹپکتی ہو۔

امامِ شہر بہ مسجد اگر رہم ندہد
بہ جائی من بہ نیایش گہ مغان خالی است

لغت: ''نیایش'' = ستائش و تحسین، دعا و آفرین، عاجزی و زاری۔

اگر امام شہر مجھے مسجد میں داخل ہونے نہیں دیتا تو نہ سہی، میرے لیے پیر مغاں کے معبد خانے میں جگہ خالی ہے، وہاں چلا جاؤں گا۔

مسجد میں بھی اللہ کے حضور عجز و نیاز ہوتا ہے، معبدِ مغاں میں بھی اسی کا اصہار ہے۔ نیایش کا لفظ یہاں بڑا موزوں ہے۔

خرابِ ذوق برو دوش کیستم غالب؟

کہ چون هلال سراپایم از میان خالی است

لغت: ''برودوش'' سینہ اور کندھا، مراد جسم (معشوق)۔

کبھی عاشق اپنے معشوق کے جسم نازنیں کو آغوش میں لیے ہوئے تھا۔ معشوق جا چکا ہے اور عاشق اس لذت کا مارا ہوا ابھی تک گویا اسی انداز میں بیٹھا ہے اور اس کا جھکا ہوا لاغر بدن ہلال کی طرح ہے جو بیچ میں سے خالی ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

میں کس کے برودوش کی لذت کا مارا ہوا ہوں کہ میرا وجود ہلال کی طرح درمیان میں سے خالی ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۵۰)

زمن گسستی و پیوند مشکل افتاد است

مرا مگیر بہ خونی کہ در دل افتاد است

لغت: ''خون در دل افتادن'' = انتہائی دکھ درد کی حالت میں ہونا۔

''مرے بہ خون مگیر'' = مجھ سے مواخذہ نہ کر۔

تو نے مجھ سے محبت کا رشتہ توڑ لیا اور اب ٹوٹے ہوئے رشتے کا پیوند مشکل ہو گیا۔

بہ قدرِ ذوقِ تپیدن بہ کشتہ جا بخشند

سخن بہ محکمہ در کیشِ قاتل افتاد است

لغت: ''محکمہ'' = وہ جگہ جہاں قاضی اپنا حکم سناتا ہے۔ عدالت۔ ''کیش'' = مذہب۔

مقتول کو اُس کے تڑپنے کے ذوق کے مطابق دفن کرنے کی جگہ دی جاتی ہے چنانچہ (عاشق کے بارے میں جو قتل کر دیا گیا ہے) عدالت میں یہ پوچھا جا رہا ہے کہ قاتل کا مذہب کیا تھا۔

قاتل کے متعلق استفسار اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اُس نے مقتول کو تڑپنے کی یہ لذت عطا کی۔ گویا یہ ذوق تپیدن، مقتول کا کمال نہیں، بلکہ قاتل کا کارنامہ ہے۔

شگافی ار جگر ذرہ نم برون ندهد

بہ وادی کہ مرا پائی در گل افتاد است

جس وادی (عشق) میں پا در گل ہو کر رہ گیا ہوں، وہاں کی خاک میری گرمی شوق سے اتنی آتشناک ہو گئی ہے کہ اگر کسی ذرے کا جگر چیرا جائے تو وہ اس قدر خشک ہو گیا ہو گا کہ اُس میں سے ایک قطرہ پانی یا خون کا نہیں نکلے گا۔

اپنی گرمی عشق کا اظہار کیا ہے۔

درین روش بہ چہ امید دل توان بستن

میانۂ من و اُو شوق حائل افتاد است

اس حالت میں کسی امید پر اُس سے دل لگایا جا سکتا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان شوق حائل ہو گیا ہے۔ یعنی حالت یہ ہے:

هم ہیں مشتاق اور وہ بے زار

بہ ترکِ گریہ برم دهشت اثر ز دلش
کہ خود ز شبروی نالہ غافل افتاد است

لغت: ''شبروی'' = راتوں کا سفر۔ ''شب روی نالہ'' = راتوں کی فریادیں۔

میں رونے کو ختم کر کے محبوب کے دل سے اثر گریہ کی دہشت دور کرنا چاہتا ہوں اور اس کا یہ عالم ہے کہ وہ عاشق کی راتوں کی فریاد و فغاں سے غافل ہے۔

عاشق اپنی گریہ وزاری کو بند کر کے معشوق کی گھبراہٹ کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور معشوق کے دل کی یہ کیفیت ہے کہ وہ فریاد ہی سے بے خبر ہے۔

بہ صبر کم نیم اما عیار ایوبی
بقدر آنکہ گرفتند کامل افتاد است

حضرت ایوب کا صبر ضرب المثل ہے۔

کہتا ہے:

صبر کرنے میں میں کم نہیں۔ بہر حال صبر ایوبی جتنا بھی پرکھا اپنے انداز میں کامل تھا۔

مراد یہ ہے کہ صبر ایوبی جو بھی تھا، ہوگا، ہمارا صبر کسی طرح اس سے کم نہیں۔ لوگوں نے صبر ایوبی کو مثالی صبر قرار دیا اور یہ لوگوں کا معیار صبر تھا، صبر کی انتہا نہ تھی۔

چو نهنگ و سمندر در آب و آتش من
تنم بہ قلزم و کشتی بساحل افتاد است

مگرمچھ اور سمندر (آگ کا کیڑا) میرے ہی پانی اور آگ میں پرورش پاتے ہیں۔ میرا

جسم سمندر میں ڈوبا ہوا ہے اور میری کشتی ساحل پر پڑی ہے۔

بری صید تو از ذوقِ استخوانِ تنش
ہما ز تیزی پرواز، بسمل افتاد است

ہما کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہڈیاں کھاتا ہے۔

صید سے مراد یہاں صید عشق ہے، یعنی عشق کا مارا ہوا عاشق کہتا ہے:

تمھارے شکار کی ہڈیاں کھانے کے شوق میں، ہما نے اس تیزی سے پرواز کی ہے کہ وہ شکار کے اوپر نیم بسمل ہو کر آ گرا ہے۔

چو اندر آئینہ با خویش لابہ ساز شوی
ز خود بجوی کہ مارا چہ در دل افتاد است

جب تو آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر اپنے حسن پر فریفتہ ہوتا ہے اور بڑے نیاز مندانہ انداز میں اس سے پیش آتا ہے، عین اس وقت تمہیں اپنے آپ میں سوچنا چاہئے کہ ہمارے دل کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔

حریفِ ما همہ بی بذلہ می خورد غالب
مگر ز خلوتِ واعظ بہ محفل افتاد است

لغت: ''حریف'' = ہم پیشہ۔ یہ لفظ دوست اور مقابل دونوں مفہوم دیتا ہے۔ ہم پیشہ لوگ باہم دوست بھی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ پیشہ ورانہ رقابت بھی رکھتے ہیں۔

لغت: حریف کا لفظ یہاں باہم مل کر پینے والوں کے لیے آیا ہے۔ کہتا ہے:

غالب! ہمارا حریف، شراب پی رہا ہے لیکن اس میں کوئی شوخی، شگفتگی، بذلہ سنجی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے واعظ کی خلوت سے اٹھ کر محفل، رنداں میں آ بیٹھا ہے (اور ابھی اس غیر موافق صحبت کے اثر سے نجات نہیں ملی)۔

❁❁❁

غزل نمبر(۵۱)

ایمنیم از مرگ تا تیغت جراحت بار هست
روزیِ نا خوردۂ ما در جهان بسیار هست

لغت: ''روزی ناخوردہ'' = بے نصیب لوگ۔
''تیغ جراحت بار'' = زخم برسانے والی تلوار، زخم لگانے والی تلوار۔
جب تک تیری تلوار زخم لگائے چلی جارہی ہے، ہم موت سے محفوظ ہیں۔ ہمارے جیسے بے نصیب لوگ دنیا میں بہت ہیں۔
معشوق اپنی تیغ ناز سے زخم لگائے چلا جارہا ہے اور لوگ بسمل پڑے تڑپ رہے ہیں لیکن بدنصیبوں کو موت نہیں آتی۔

ما و خاکِ رهگذر بر فرقِ عریان ریختن
گل کسی جوید کہ او را گوشۂ دستار هست

پرانے زمانے میں لوگ دستار پہنتے تھے اور زینت کے لیے پھول دستار کے ایک طرف ٹانک لیتے تھے۔ عاشق کو دستار کہاں نصیب، وہ ننگے سر (فرق عریاں) ہے اور وہ وحشت جنوں میں ادھر ادھر گھوم رہا ہے اور رہگذر کا غبار سر پر پڑ رہا ہے۔ کہتا ہے: ہم ہیں اور رہگذر کی خاک سر عریاں پر ڈالنا ہمارا مشغلہ ہے۔ پھول تو وہ تلاش کرے، جس کی دستار ہو اور گوشۂ دستار۔

پارۂ امید وارستم تکلف بر طرف
باهمہ بی التفاتی درد مند آزار هست

لغت: ''دردمند آزار (ترکیب فاعلی) دکھی لوگوں کو ستانے والا۔ تکلف کیسا، صاف بات یہ ہے کہ میں تھوڑا سا دوست سے محبت کا امیدوار بھی ہوں۔ باوجود اس کی اتنی بے توجہی کے وہ دردمند لوگوں کو ستانے کا خوگر ہے۔ دوست کا یہ انداز بھی امید افزا ہے۔ اسی لاگ سے لگاؤ کا پہلو ابھرے گا۔

بر سر کوی تو با مهرم بہ جنگ آرد همی
این هجوم ذرہ کاندر روزن دیوار هست

جب میں تیرے کوچے میں جاتا ہوں اور تیرے روزن دیوار پر ذروں کا ہجوم دیکھتا ہوں تو مجھے سورج پہ رشک آتا ہے اور میں اس سے آمادہ جنگ ہو جاتا ہوں۔
عام مشاہدے کی بات ہے کہ سورج کی روشنی جب روزن دیوار (روشندان) سے اندر آتی ہے تو ہزاروں ذرے جو یوں دکھائی نہیں دیتے نظر آتے ہیں۔
عاشق ان ذروں کو روزن دیوار میں رقص کرتے ہوئے خلوت دوست میں جاتے دیکھتا ہے تو اسے اپنی نامرادی اور ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔ روزن دیوار تک اس کی رسائی

کہاں۔ وہ ذروں کی کامیابی کو سورج سے منسوب کرتا ہے اس لیے اس سے بر سر پرخاش ہے۔

در خموشی تابش روی عرقنا کش نگر
تا چھا ھنگمۂ سر گرمی گفتار ھست

لغت: ''روئے عرقناک'' = پسینہ سے آلودہ چہرہ۔
حالت خموشی میں معشوق کے پسینے سے شرابور چہرے کی تابانی کو دیکھو۔ اللہ اللہ اس خموشی میں کتنی گویائیوں کے ہنگامے سمائے ہوئے ہیں۔

بی نوائی بین کہ گر در کلبہ ام باشد چراغ
بخت را نازم کہ با من دولت بیدار ھست

لغت: ''دولت بیدار'' = ایسی دولت جس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ میری بے سروسامانی کو دیکھ کہ اگر میری کٹیا میں چراغ (روشن) ہوتو میں اسے اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں اور فخر کرتا ہوں کہ مجھے دولت بیدار مل گئی۔ شمع کو دولت بیدار کہنا، بہت بلیغ استعارہ ہے۔

در پرستش سُستم و در کامجوئی استوار
بادشاہ را بندۂ کم خدمت و پر خوار ھست

لغت: ''پرستش'' = اللہ تعالیٰ کی عبادت۔ ''کامجوئی'' = خواہشات کا پورا کرنا۔
''بندہ کم خدمت و پُر خوار'' = وہ غلام جو خدمت کم کرے اور کھائے زیادہ۔
میں خدائے پاک کی عبادت کرنے میں مست ہوں اور اس کی دی ہوئی نعمتوں سے تمتع حاصل کرنے میں بڑا چست۔ میں بادشاہ کا ایک ایسا غلام ہوں جو کام چور ہے اور پرخور ہے۔

راز دیدن ھا مجوی و از شنیدن ھا مگوی
نقشھا در خامہ و آھنگ ھا در تار ھست

دیکھنے اور سننے کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا راز نہ پوچھ۔ بے شمار نقش ہیں جو ابھی خامہ (قلم) میں پوشیدہ ہیں اور ہزار ہا سر ہیں جو ساز کے تار میں سوئے ہوئے ہیں۔
قدرت نے کیا کیا نقش سنوارے ہیں، کیا کیا نغمے ہیں جو ساز کائنات سے ابھرتے ہیں لیکن قدرت کی کرشمہ سازیاں یہیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ نہ جانے مصور ازلی کے قلم میں ابھی کتنے نقش ہیں جو صفحہ قرطاس پہ نہیں آئے اور کتنے نغمے ابھی ساز فطرت سے نہیں ابھرے۔
اس شعر کا اطلاق، مرزا غالب جیسے مفکر شاعر کے کلام پر بھی ہوتا ہے کہ اس نے کیا کچھ نہیں کہا، کیا کیا معنی طرازیاں نہیں کیں لیکن اس کے سینے میں ابھی ہزاروں گنجینہ ہای معنی پوشیدہ ہیں۔

باد برد آن گنج باد آورد و غالب را ھنوز
نالۂ الماس پاش و چشم گوھر بار ھست

لغت: ''گنج باد آورد'' = خسرو پرویز کے سات خزانوں میں سے ایک خزانے کا نام باد آورد تھا۔

''الماس'' = ہیرا۔ ہیرا سخت پتھر ہوتا ہے اور چبھ جائے تو جسم کو چیرتا چلا جاتا ہے۔
''نالۂ الماس پاش'' وہ فریاد ہے جو سننے والوں کے دلوں کو چیرتی چلی جاتی ہے۔
باد آورد خزانے کو ہوا اڑا کر لے گئی (یعنی وہ دولت جاتی رہی) لیکن غالب کی الماس پاش فریادیں اور گوہر بار آنکھیں بدستور رہی ہیں۔

❀❀❀

غزل نمبر(۵۲)

چشم از ابر اشکبار تر است
از عرق جبہہ بہار تر است

ابر رو رہا ہے لیکن میری آنکھیں ابر سے بڑھ کر اشکبار ہیں۔ بہار کی پیشانی تر ہے یعنی شرم سے پسینہ پسینہ ہو رہی ہے۔

ابر بہار برس رہا ہے لیکن مجھے اشکبار دیکھ کر شرمندہ ہو گیا ہے۔ غالب کے قصیدے کا ایک مقطع ہے:

ابر اشکبار و من خجل از نا گریستن
دارد تفاوت آب شدن تا گریستن

یہ شعر پہلے شعر کی ضد ہے:

گریہ کرد از فریب و زارم کشت
نگہ از تیغ آبدار تر است

اس نے فریب سے آنسو بہائے اور مجھے ان آنسوؤں نے مار ڈالا۔ سبحان اللہ! نگہ تلوار سے کتنی زیادہ تیز (آبدار) ہوتی ہے۔ حسن کی بھیگی ہوئی آنکھوں سے جو نگاہیں نکلتی ہیں وہ تلوار کی دھار سے زیادہ قاتل ہوتی ہیں۔

غالب:

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
کوئی تری تیغ نگہ کو آب تو دے

می بر انگیزدش بہ کشتن من
دشمن از دوست غمگسار تر است

رقیب، میرے محبوب کو میرے قتل پر ابھارتا ہے، دشمن رقیب دوست سے زیادہ غمگسار نکلا۔ محبوب عاشق کو قتل نہیں کرتا۔ وہ عاشق کی حالت زار سے پسیجنے کی بجائے خوش ہوتا ہے۔ اگر رقیب اسے عاشق کے قتل پر اکساتا ہے تو وہ گویا عاشق کا ہمدرد ہے کیونکہ مر کر عاشق کے دکھ ختم ہو جائیں گے۔

دی مگر مست بودۂ کامروز
شکرم از شکوہ نا گوار تر است

لغت: ''دی'' = کل رات۔

کل رات تو شاید مستی کے عالم میں تھا کہ آج میں جو تیرا شکر ادا کر رہا ہوں، وہ میرے شکوے سے زیادہ ناگوار محسوس ہوتا ہے۔

عاشق بالعموم معشوق سے شکوہ و شکایت کا اظہار کرتا رہتا تھا، نہ جانے کیا بات تھی کہ معشوق صبح اٹھ غیر معمولی طور پر مہربان تھا صبح اٹھ کر غور کیا تو دل میں شکوک پیدا ہوئے کہ معشوق کے اس انداز لطف و کرم کی تہ میں کیا تھا۔ کہیں یہ سب کچھ مستی کا نتیجہ تو نہیں تھا کہ رقیب کی بجائے مجھ پر نظر عنایت رہی اس لیے شکر گزاری میں ایک تلخی سی آ گئی ہے اور اس کے اظہار میں شکوے کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

ای کہ خوی تو ہمچو روی تو نیست
دیدہ از دل اُمیدوار تر است

انسان کی نظر تو چہروں کو دیکھتی ہے، طبیعت کی افتاد کا اندازہ دل ہی کر سکتا ہے معشوق حسین صورت تو ہے لیکن حسن طبیعت سے عاری ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

تیری خو تیرے چہرے جیسی نہیں۔ میری آنکھیں دل سے زیادہ پر امید ہیں۔ آنکھیں ظاہری صورت سے فریب کھا کر امید میں باندھ سکتی ہیں، دل سے ایسا نہیں ہوسکتا۔

نو بدولت رسیدہ را نگرید
خطش از زلف مشکبار تر است

لغت: ''نو بدولت رسیدہ'' = جسے تازہ تازہ دولت میسر آئی ہو۔

اردو میں ہم اس کے لیے ''نو دولتی'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ایسا شخص اکثر اپنی دولت کی غیر معمولی نمائش کرتا ہے۔ شاعر نے حسن محبوب کو نو دولتی کہا ہے جسے سبزہ خط کی نئی دولت نصیب ہوئی ہے۔ سبزہ خط کی دل کشی زلف کی دل کشی سے بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے: اس نو دولتی کو دیکھو، اس کا سبزۂ خط زلف سے زیادہ سیاہ اور معطر ہے۔ ''مشکبار'' میں سیاہی اور خوشبو دونوں عنصر شامل ہیں۔

طفلی و پر دلیر می شکنی
آہ عہدی کہ استوار تر است

لغت: ''پر دلیر'' = بہت دلیر۔ یہاں دلیرانہ کا مفہوم دے رہا ہے۔ معشوق کمسن ہے اس لیے جو عہد وفا باندھتا ہے، بڑی سادگی اور آسانی سے باندھتا ہے اور پھر بے تکلفی اور بے پروائی سے توڑ بھی دیتا ہے۔ ان سب باتوں میں ایک ادا اور دل کشی ہے۔ اگر عہد ذرا زیادہ استوار ہو تو وہ ٹوٹ نہ سکے گا، اور معشوق اسے توڑ نہ سکے گا اسے مایوسی ہوگی۔ اسی لیے ''آہ'' کا

لفظ لا کر اظہار افسوس کیا ہے۔

همه عجز و نیاز می خواهند
زار تر هر که حق گزار تر است

ہر شخص عجز و نیاز کا طلب گار ہے۔ چنانچہ عجز و نیاز کا حق پہچاننے والا عجب مصیبت میں ہے۔ وہ کس کس کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار کرے۔

خدا بھی عجز و نیاز کو پسند کرتا ہے اور معشوق بھی۔ عاشق کیا کرے، کدھر جائے۔

خستہ از راہ دور می آیم
پا ز تن پارۂ فگار تر است

لغت: ''خستہ'' = تھکا ماندہ۔

تھکا ماندہ ہوں اور دور سے آ رہا ہوں۔ جسم کی جو حالت ہے سو ہے، پاؤں اس سے بھی قدرے زیادہ زخمی ہیں۔

شاعر کا اصل مقصود، شوق کی بیابان نوردی کو ظاہر کرنا ہے۔

شکوہ از خوی دوست نتوان کرد
بادۂ تند ساز گار تر است

دوست کی (تند) طبیعت کا کیا شکوہ۔ شراب تند ہی اچھی ہوتی ہے۔

تندی طبیعت کو تندی شراب سے تشبیہ دی ہے۔ معشوق کی اس طرز جفا میں خاص مزہ ہوتا ہے۔

می رسد گر بخویشتن نازد
غالب از خویش خاکسار تر است

غالب کو جب اپنے آپ تک رسائی ہوتی ہے تو وہ فخر کرتا ہے کیونکہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ خیال کرتا ہے اس سے زیادہ حقیر ہے (خاکسار)۔

غالب کا فخر کرنا دو وجہ سے ہے۔ ایک تو عرفان نفس کی وجہ سے کہ اسی میں انسان کو اپنے آپ کا پتا چلتا ہے۔ دوسرے یہ احساس کہ میں ایک خاکسار ہوں اور خاکساری انسان کا بڑا وصف ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر(۵۳)

ظہور بخشش حق را بہانہ بی سببی است
دگرنہ شرم گنہ در شمار بی ادبی است

خدا کے حضور گناہگار کا اپنے گناہوں پر نادم ہونا ایک طرح کی بے ادبی ہے کیونکہ بندوں پر حق تعالیٰ کی بخششیں بغیر کسی سبب کے نازل ہوتی ہیں۔

زگیر و دار چہ غم، چون بہ عالمی کہ منم
ہنوز قصۂ حلاج حرف زیر لبی است

لغت: ''گیرودار'' = محاسبہ یا مواخذہ۔

''حرف زیرلبی'' = وہ بات جو زیرلب ہو۔ زباں پر نہ آئی ہو۔

''قصہ حلاج'' = مشہور قصہ ہے کہ منصور بن حلاج نے علانیہ ''انا الحق'' کہا اور اس کی پاداش میں دار پر چڑھا دیا گیا۔ فتویٰ دینے والوں کی نظر میں یہ کلمہ کفر تھا۔ بعض صوفیہ نے بھی اسے قبل از وقت قرار دیا ہے۔

مجھے محاسبے کا کیا ڈر کیونکہ جس مقام پر میں ہوں وہاں ابھی تک قصہ منصور زبان پر نہیں آیا۔

گویا ابھی مقام بے خودی اور حیرت ہے۔ ابھی عرفان نفس کی تکمیل نہیں ہوئی۔

رموز دین نشناسم درست و معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربی است

مولانا حالی اس کی شرح یوں فرماتے ہیں:

میں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے، اگر اصول مذہب سے واقف نہ ہوں تو مجھ کو معذور سمجھنا چاہیے۔

نشاط جم طلب از آسمان نہ شوکت جم
قدح مباش ز یاقوت، بادہ گر غمی است

جمشید کو شان و شوکت بھی حاصل تھی اور عیش و نشاط بھی وہ یاقوت کے پیالے میں شراب پیتا تھا۔ لیکن شراب، یاقوت کے پیالے میں ہو یا مٹی کے، اصل شے تو شراب ہے جو سرور بخشتی ہے۔ اس سرور و نشاط کے مقابلے میں ساغر یاقوت، یا دوسرے لفظوں میں شوکت جمشید کیا شے ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

آسمان سے نشاطِ جمشید طلب کرنہ کہ (بظاہری) شانِ جمشید۔ یاقوت کا پیالہ اگر نہیں ہے تو نہ سہی، شراب تو انگوری ہے (یعنی شرابِ ناب)

بالتفات نیرزم در آرزو چہ نزاع

نشاط خاطر مفلس ز کیمیا طلبی است

میں تو محبوب کی توجہ کے بھی قابل نہیں، آرزو کا کیا تقاضا۔ ایک مفلس انسان کے دل کی خوشی یہی ہے کہ بیچارے کو کیمیا مل جائے۔

محبوب توجہ نہیں کرتا نہ سہی، ہم آرزو تو کرتے ہیں۔

بود بہ طالع ما آفتاب تحت الارض

فروغ صبح ازل در شراب نیم شبی است

آفتاب جب غروب ہو جاتا ہے تو گویا زمین کے نیچے چلا جاتا ہے، اسی لیے آفتاب تحت الارض کہا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارے نصیبے کے زائچے میں (جامِ شراب) آفتاب تحت الارض ہے جو طلوع ہونے والا ہے، یعنی جو ہمارے افقِ بخت پر سے ہویدا ہوگا۔ ہماری نیم شبی شراب میں صبحِ ازل کی فروغ ہے۔

نہ ہم پیالگی زاھدان بلائی بود

خوش است، گرمی بیغش خلافشرع نبی است

لغت: ''مے بیغش'' =شرابِ ناب، ایسی شراب جس کے پینے میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ کہتا ہے کہ اچھا ہوا کہ شراب شرعِ نبوی کے خلاف ہے ورنہ زاہدوں کے ساتھ بیٹھ کے

پینا (یعنی اس کا ہم پیالہ ہونا) عذاب ہو۔

ھر آنچہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست

عیار بیکسی ما شرافت نسبی است

مولانا حالی لکھتے ہیں جس کو دیکھیے اپنی جنس کی طرف مائل ہے۔ چونکہ شرافت نسب میں کوئی میری مثل نہیں اس لیے میری طرف کوئی مائل نہیں اور یہی میری بیکسی کی وجہ ہے۔

کسی کہ از تو فریب و فا خورد، داند

کہ بی وفائی گل در شمار بوالعجبی است

جس شخص نے تجھ سے فریب وفا کھایا ہو، وہ خوب جانتا ہے کہ تیری بے وفائی کے مقابلے میں گل کی بے وفائی عجب طرح کی نادانی معلوم ہوتی ہے۔

میان غالب و واعظ نزاع شد ساقی

بیا بہ لابہ کہ ھیجان قوت غضبی است

اے ساقی! غالب اور واعظ الجھ پڑے ہیں۔ تو ذرا خوشامدانہ انداز میں آکے یہ نزاع محض قوتِ غضب کے جوش کا نتیجہ ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر(۵۴)

نشاط معنویان از شراب خانۂ تست
فسونِ بابلیان فصلی از فسانۂ تست

بقول مولانا حالی اس تمام غزل میں معشوق حقیقی کی طرف اشارہ ہے۔

لغت: ''فسوں بابلیاں'' = بابل عراق میں کوفے کے قریب ایک شہر تھا جواب برباد ہو چکا ہے۔ یہاں کے لوگ سحر وشراب کے لیے مشہور تھے۔ اسی لیے ''فسون بابلیاں'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

''معنویاں'' بابلیاں کی ضد۔ اہل معنی۔اہل طریقت۔

اہل طریقت بھی تیری ہی شراب سے سرشار ہیں اور بابلیاں کا سحر وفسوں بھی تیرے ہی فسانے کا حصہ ہے، یعنی حق وصداقت اور کفر اور ضلالت کے سب ہنگامے اسی ذات حق سے وابستہ ہیں۔

بجام و آئینہ حرف جم و سکندر چیست
کہ ھر چہ رفت بہ ھر عھد، در زمانۂ تست

مولانا حالی لکھتے ہیں:

یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جام جہاں نما جمشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے عہد میں، کیونکہ جو کچھ جس زمانے میں گزرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا۔

فریب حسن بتان پیشکش اسیر تو ایم
اگر خطست و گر خال، دام و دانۂ تست

ہم جو حسن بتاں کا فریب کھا رہے ہیں، یہ تو محض ظاہری بہانہ ہے۔ دراصل ہم تیرے ہی اسیر محبت ہیں۔ بتوں کے یہ خط وخال کیا ہیں۔، تیرا ہی دام ودانہ ہیں۔

ھم از احاطۂ تست این کہ در جھان مارا
قدم بہ بتکدۂ و سر بر آستانۂ تست

مولانا حالی فرماتے ہیں:

یعنی تو جو تمام عالم پر محیط ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہیں تو بتکدے میں مگر ہمارا سر تیرے آستانے پر ہے۔

سپھر را تو بتاراج ما گماشتۂ
نہ ھر چہ وزد ز ما برد در خزانۂ تست؟

آسمان کو تو نے ہمیں لوٹنے پر مامور کیا ہوا ہے لیکن کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ لٹیرا ہم سے لوٹ کے لے گیا ہے وہ تیرے خزانے میں موجود ہے۔

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسمان پیماست
نہ تیز گامی تو سن ز تازیانۂ تست

لغت: ''اگر میرا تخیل، آسمان کی سیر کرتا ہے (یعنی وہاں اسرار ورموز میں دخل دیتا ہے) تو میرا کیا قصور ہے؟ یہ تیرا ہی تازیانہ تو ہے جس نے میرے تخیل کے گھوڑے کو تیز رفتار کر رکھا ہے۔

غزل نمبر(۵۲)

چشم از ابر اشکبار تر است

از عرق جبھہ بھار تر است

ابر رو رہا ہے لیکن میری آنکھیں ابر سے بڑھ کر اشکبار ہیں۔ بہار کی پیشانی تر ہے یعنی شرم سے پسینہ پسینہ ہو رہی ہے۔

ابر بہار برس رہا ہے لیکن مجھے اشکبار دیکھ کر شرمندہ ہوگیا ہے۔ غالب کے قصیدے کا ایک مقطع ہے:

ابر اشکبار و من خجل از نا گریستن

دارد تفاوت آب شدن تا گریستن

یہ شعر پہلے شعر کی ضد ہے:

گریہ کرد از فریب و زارم کشت

نگہ از تیغ آبدار تر است

اس نے فریب سے آنسو بہائے اور مجھے ان آنسوؤں نے مار ڈالا۔ سبحان اللہ! نگہ تلوار سے کتنی زیادہ تیز (آبدار) ہوتی ہے۔ حسن کی بھیگی ہوئی آنکھوں سے جو نگاہیں نکلتی ہیں وہ تلوار کی دھار سے زیادہ قاتل ہوتی ہیں۔

غالب:

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا

کوئی تری تیغ نگہہ کو آب تو دے

می بر انگیزدش بہ کشتن من

دشمن از دوست غمگسار تر است

رقیب، میرے محبوب کو میرے قتل پر ابھارتا ہے، دشمن رقیب دوست سے زیادہ غمگسار نکلا۔ محبوب عاشق کو قتل نہیں کرتا۔ وہ عاشق کی حالت زار سے پسیجنے کی بجائے خوش ہوتا ہے۔ اگر رقیب اسے عاشق کے قتل پر اکساتا ہے تو وہ گویا عاشق کا ہمدرد ہے کیونکہ مر کر عاشق کے دکھ ختم ہو جائیں گے۔

دی مگر مست بودۂ کامروز

شکرم از شکوہ نا گوار تر است

لغت: ''دی'' = کل رات۔

کل رات تو شاید مستی کے عالم میں تھا کہ آج میں جو تیرا شکر ادا کر رہا ہوں، وہ میرے شکوے سے زیادہ ناگوار محسوس ہوتا ہے۔

عاشق بالعموم معشوق سے شکوہ و شکایت کا اظہار کرتا رہتا تھا، نہ جانے کیا بات تھی کہ معشوق صبح اٹھ غیر معمولی طور پر مہربان تھا صبح اٹھ کر غور کیا تو دل میں شکوک پیدا ہوئے کہ معشوق کے اس انداز لطف و کرم کی تہ میں کیا تھا۔ کہیں یہ سب کچھ مستی کا نتیجہ تو نہیں تھا کہ رقیب کی بجائے مجھ پر نظر عنایت رہی اس لیے شکر گزاری میں ایک تلخی سی آگئی ہے اور اس کے اظہار میں شکوے کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔

ای کہ خوی تو ھمچو روی تو نیست

دیدہ از دل اُمیدوار تر است

انسان کی نظر تو چہروں کو دیکھتی ہے، طبیعت کی افتاد کا اندازہ دل ہی کر سکتا ہے معشوق حسین صورت تو ہے لیکن حسن طبیعت سے عاری ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

تیری خو تیرے چہرے جیسی نہیں۔ میری آنکھیں دل سے زیادہ پر امید ہیں۔ آنکھیں ظاہری صورت سے فریب کھا کر امید میں باندھ سکتی ہیں، دل سے ایسا نہیں ہو سکتا۔

نو بدولت رسیده را نگرید
خطش از زلف مشکبار تر است

لغت: ''نو بدولت رسیدہ'' = جسے تازہ تازہ دولت میسر آئی ہو۔

اردو میں ہم اس کے لیے ''نو دولتی'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ایسا شخص اکثر اپنی دولت کی غیر معمولی نمائش کرتا ہے۔ شاعر نے حسن محبوب کو نو دولتی کہا ہے جسے سبزہ خط کی نئی دولت نصیب ہوئی ہے۔ سبزہ خط کی دل کشی زلف کی دل کشی سے بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے: اس نو دولتی کو دیکھو، اس کا سبزۂ خط زلف سے زیادہ سیاہ اور معطر ہے۔ ''مشکبار'' میں سیاہی اور خوشبو دونوں عنصر شامل ہیں۔

طفلی و پر دلیر می شکنی
آه عهدی که استوار تر است

لغت: ''پر دلیر'' = بہت دلیر۔ یہاں دلیرانہ کا مفہوم دے رہا ہے۔ معشوق کمسن ہے اس لیے جو عہد وفا باندھتا ہے، بڑی سادگی اور آسانی سے باندھتا ہے اور پھر بے تکلفی اور بے پروائی سے توڑ بھی دیتا ہے۔ ان سب باتوں میں ایک ادا اور دل کشی ہے۔ اگر عہد ذرا زیادہ استوار ہو تو وہ ٹوٹ نہ سکے گا، اور معشوق اسے توڑ نہ سکے گا اسے مایوسی ہوگی۔ اسی لیے ''آہ'' کا

لفظ لا کر اظہار افسوس کیا ہے۔

همه عجز و نیاز می خواهند
زار تر هر که حق گزار تر است

ہر شخص عجز و نیاز کا طلب گار ہے۔ چنانچہ عجز و نیاز کا حق پہچاننے والا عجب مصیبت میں ہے۔ وہ کس کس کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار کرے۔

خدا بھی عجز و نیاز کو پسند کرتا ہے اور معشوق بھی۔ عاشق کیا کرے، کدھر جائے۔

خسته از راه دور می آیم
پا ز تن پارهٔ فگار تر است

لغت: ''خستہ'' = تھکا ماندہ۔

تھکا ماندہ ہوں اور دور سے آ رہا ہوں۔ جسم کی جو حالت ہے سو ہے، پاؤں اس سے بھی قدرے زیادہ زخمی ہیں۔

شاعر کا اصل مقصود، شوق کی بیابان نوردی کو ظاہر کرنا ہے۔

شکوه از خوی دوست نتوان کرد
بادهٔ تند ساز گار تر است

دوست کی (تند) طبیعت کا کیا شکوہ۔ شراب تند ہی اچھی ہوتی ہے۔

تندی طبیعت کو تندی شراب سے تشبیہ دی ہے۔ معشوق کی اس طرز جفا میں خاص مزہ ہوتا ہے۔

می رسد گر بخویشتن نازد

غالب از خویش خاکسار تر است

غالب کو جب اپنے آپ تک رسائی ہوتی ہے تو وہ فخر کرتا ہے کیونکہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ خیال کرتا ہے اس سے زیادہ حقیر ہے (خاکسار)۔

غالب کا فخر کرنا دو وجہ سے ہے۔ ایک تو عرفان نفس کی وجہ سے کہ اسی میں انسان کو اپنے آپ کا پتا چلتا ہے۔ دوسرے یہ احساس کہ میں ایک خاکسار ہوں اور خاکساری انسان کا بڑا وصف ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر(۵۳)

ظہور بخشش حق را بہانہ بی سببی است

دگرنہ شرم گنہ در شمار بی ادبی است

خدا کے حضور گناہگار کا اپنے گناہوں پر نادم ہونا ایک طرح کی بے ادبی ہے کیونکہ بندوں پر حق تعالیٰ کی بخششیں بغیر کسی سبب کے نازل ہوتی ہیں۔

زگیر و دار چہ غم، چون بہ عالمی کہ منم

ہنوز قصۂ حلاج حرف زیر لبی است

لغت: ''گیرودار'' = محاسبہ یا مواخذہ۔

''حرف زیر لبی'' = وہ بات جو زیر لب ہو۔ زباں پر نہ آئی ہو۔

''قصہ حلاج'' = مشہور قصہ ہے کہ منصور بن حلاج نے علانیہ ''انا الحق'' کہا اور اس کی پاداش میں دار پر چڑھا دیا گیا۔ فتویٰ دینے والوں کی نظر میں یہ کلمہ کفر تھا۔ بعض صوفیہ نے بھی اسے قبل از وقت قرار دیا ہے۔

مجھے محاسبے کا کیا ڈر کیونکہ جس مقام پر میں ہوں وہاں ابھی تک قصہ منصور زبان پر نہیں آیا۔

گویا ابھی مقام بے خودی اور حیرت ہے۔ ابھی عرفان نفس کی تکمیل نہیں ہوئی۔

رموز دین نشناسم درست و معذورم

نہاد من عجمی و طریق من عربی است

مولانا حالی اس کی شرح یوں فرماتے ہیں:

میں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے، اگر اصول مذہب سے واقف نہ ہوں تو مجھ کو معذور سمجھنا چاہیے۔

نشاط جم طلب از آسمان نہ شوکت جم

قدح مباش ز یاقوت، بادہ گر غنی است

جمشید کو شان و شوکت بھی حاصل تھی اور عیش و نشاط بھی وہ یاقوت کے پیالے میں شراب پیتا تھا۔ لیکن شراب، یاقوت کے پیالے میں ہو یا مٹی کے، اصل شے تو شراب ہے جو سرور بخشتی ہے۔ اس سرور و نشاط کے مقابلے میں ساغر یاقوت، یا دوسرے لفظوں میں شوکت جمشید کیا شے ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

آسمان سے نشاط جمشید طلب کرنہ کہ (بظاہری) شان جمشید۔ یاقوت کا پیالہ اگرنہیں ہے تو نہ سہی، شراب تو انگوری ہے (یعنی شراب ناب)

بالتفات نیرزم در آرزو چہ نزاع
نشاط خاطر مفلس ز کیمیا طلبی است

میں تو محبوب کی توجہ کے بھی قابل نہیں، آرزو کا کیا تقاضا۔ ایک مفلس انسان کے دل کی خوشی یہی ہے کہ بیچارے کو کیمیا مل جائے۔

محبوب توجہ نہیں کرتا نہ سہی، ہم آرزو تو کرتے ہیں۔

بود بہ طالع ما آفتاب تحت الارض
فروغ صبح ازل در شراب نیم شبی است

آفتاب جب غروب ہوجاتا ہے تو گویا زمین کے نیچے چلا جاتا ہے، اسی لیے آفتاب تحت الارض کہا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارے نصیبے کے زائچے میں (جام شراب) آفتاب تحت الارض ہے جو طلوع ہونے والا ہے، یعنی جو ہمارے افق بخت پر سے ہویدا ہوگا۔ ہماری نیم شبی شراب میں صبح ازل کی فروغ ہے۔

نہ ہم پیالگی زاھدان بلائی بود
خوش است، گرمی بیغش خلافشرع نبی است

لغت: ''مے بیغش'' = شراب ناب، ایسی شراب جس کے پینے میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ کہتا ہے کہ اچھا ہوا کہ شراب شرع نبوی کے خلاف ہے ورنہ زاہدوں کے ساتھ بیٹھ کے

پینا (یعنی اس کا ہم پیالہ ہونا) عذاب ہو۔

ھر آنچہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست
عیار بیکسی ما شرافت نسبی است

مولانا حالی لکھتے ہیں جس کو دیکھیے اپنی جنس کی طرف مائل ہے۔ چونکہ شرافت نسب میں کوئی میری مثل نہیں اس لیے میری طرف کوئی مائل نہیں اور یہی میری بیکسی کی وجہ ہے۔

کسی کہ از تو فریب و فا خورد، داند
کہ بی وفائی گل در شمار بوالعجبی است

جس شخص نے تجھ سے فریب وفا کھایا ہو، وہ خوب جانتا ہے کہ تیری بے وفائی کے مقابلے میں گل کی بے وفائی عجب طرح کی نادانی معلوم ہوتی ہے۔

میان غالب و واعظ نزاع شد ساقی
بیا بہ لابہ کہ ھیجان قوت غضبی است

اے ساقی! غالب اور واعظ الجھ پڑے ہیں۔ تو ذرا خوشامدانہ انداز میں آ کہ یہ نزاع محض قوت غضب کے جوش کا نتیجہ ہے۔

❀❀❀

غزل نمبر (۵۴)

نشاط معنویان از شراب خانۂ تست
فسونِ بابلیان فصلی از فسانۂ تست

بقول مولانا حالی اس تمام غزل میں معشوق حقیقی کی طرف اشارہ ہے۔

لغت: ''فسوں بابلیاں'' = بابل عراق میں کوفے کے قریب ایک شہر تھا جو برباد ہو چکا ہے۔ یہاں کے لوگ سحر و شراب کے لیے مشہور تھے۔ اسی لیے ''فسون بابلیاں'' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

''معنویاں'' بابلیاں کی ضد۔ اہل معنی۔ اہل طریقت۔

اہل طریقت بھی تیری ہی شراب سے سرشار ہیں اور بابلیاں کا سحر و فسوں بھی تیرے ہی فسانے کا حصہ ہے، یعنی حق و صداقت اور کفر اور ضلالت کے سب ہنگامے اسی ذات حق سے وابستہ ہیں۔

بجام و آئینہ حرف جم و سکندر چیست
کہ ہر چہ رفت بہ ہر عہد، در زمانہ تست

مولانا حالی لکھتے ہیں:

یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جام جہاں نما جمشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے عہد میں، کیونکہ جو کچھ جس زمانے میں گزرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا۔

فریب حسن بتان پیشکش اسیر تو ایم
اگر خطست و گر خال، دام و دانۂ تست

ہم جو حسن بتاں کا فریب کھا رہے ہیں، یہ تو محض ظاہری بہانہ ہے۔ دراصل ہم تیرے ہی اسیر محبت ہیں۔ بتوں کے یہ خط و خال کیا ہیں۔، تیرا ہی دام و دانہ ہیں۔

ہم از احاطۂ تست این کہ در جہان مارا
قدم بہ بتکدۂ و سر بر آستانۂ تست

مولانا حالی فرماتے ہیں:

یعنی تو جو تمام عالم پر محیط ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہیں تو بتکدے میں مگر ہمارا سر تیرے آستانے پر ہے۔

سپہر را تو بتاراج ما گماشتۂ
نہ ہر چہ دزد ز ما برد در خزانۂ تست؟

آسمان کو تو نے ہمیں لوٹنے پر مامور کیا ہوا ہے لیکن کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ لٹیرا ہم سے لوٹ کے لے گیا ہے وہ تیرے خزانے میں موجود ہے۔

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسمان پیماست
نہ تیز گامی توسن ز تازیانۂ تست

لغت: ''اگر میرا تخیل، آسمان کی سیر کرتا ہے (یعنی وہاں اسرار و رموز میں دخل دیتا ہے) تو میرا کیا قصور ہے؟ یہ تیرا ہی تازیانہ تو ہے جس نے میرے تخیل کے گھوڑے کو تیز رفتار کر رکھا ہے۔

کمان ز چرخ و خدنگ از بلا و پر ز قضا

خدنگ خوردۂ این صید گہ نشانۂ تست

چرخ کماں کی طرح ہے، مصیبتیں تیر کی طرح اور قضا اس تیر کے پر ہیں۔ اس دنیا میں جو ایک صیدگہ کی طرح ہے، تیر کھانے والا، تیرے ہی نشانے کی زد میں ہوتا ہے۔

نام قضا، اور آسماں کا لیا جاتا ہے حالانکہ تیر چلانے والا تو ہے۔

سپاس جود تو فرض است آفرینش را

درین فریضہ دو گیتی ہمان دو گانۂ تست

اس مخلوق کو تیری بخشش کا شکر بجالانا فرض ہے۔ اس فریضے میں یہ دو جہاں، شکرانے کے دو نفل ہیں۔

تو ای کہ محو سخن گستران پیشینی

مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

تو قدیم اساتذہ سخن کے کلام کا مداح ہے اور اس کے مطالعے میں محو ہے۔ غالب کی شاعری اور کمال فن سے اس لیے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ تیرے عہد میں ہے۔

❁❁❁

ردیف (ث)

غزل نمبر(۱)

محو خود است لیک نہ چون من درین چہ بحث

او چون خودی نداشتہ دشمن درین چہ بحث

اس ساری غزل میں ردیف ''ردیف چہ بحث'' محاورۃً آئی ہے اور شاعر نے اسے مختلف مفہوم دے کر حسن بیان کا رنگ پیدا کیا ہے۔ ''بحث'' نزاع، جھگڑا، تکرار ہے، ''درین چہ بحث'' کا مفہوم، ''اس میں اختلاف کی کیا گنجائش'' ''اس میں اختلاف کیسا؟'' ''دریں چہ شک'' وغیرہ وغیرہ کے ہیں۔

میرا محبوب اپنے آپ میں کھویا ہوا ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ میری طرح نہیں۔ یہ اس لیے کہ اسے کسی اپنے جیسے حریف (مقابل) سے واسطہ نہیں پڑا۔

محبوب اپنے حسن کے تصور میں گم ہے اور کسی کو اپنا ثانی نہیں سمجھتا اور یہی اس کی محویت کا جواز ہے لیکن میرا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ میں خود اپنے نفس سے مقابل ہو رہا ہوں۔ ''میرا معاملہ اس سے مختلف ہے'' کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ میں تو محبوب کے حسن میں محو ہوں۔

افسانہ گو ست غیر چہ مہر افگنی برد

غم بر نتابد این ہمہ گفتن درین چہ بحث

لغت: ''غیر'' = مدعی، رقیب۔

رقیب اپنے عشق کے بارے میں جتنے بھی دعوے کرتا ہے، محض افسانے ہیں۔ ایسے

شخص پر محبت نثار کرنا فضول ہے سچا عاشق تو کبھی باتیں نہیں بناتا۔ جو شخص غم عشق کا مارا ہوا ہو اس میں تاب گفتار کہاں۔

جیجون ونیل نیست، دل است، از خدا بترس
گر نیست خون دیدہ بہ دامن، درین چہ بحث

محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے:

خدا سے ڈر، یہ (میرا) دل ہے۔ کوئی دریا جیجوں اور دریائے نیل تو نہیں ہے۔ اگر میری آنکھوں سے خون کے آنسو میرے دامن پر نہیں بہے تو کیا ہوا۔

عاشق کامل درد محبت سے خون ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود وہ ضبط سے کام لے رہا ہے اور آنسو تک نہیں بہاتا۔ سنگدل معشوق ہے کہ اسے عاشق کی حالت زار کا یقین نہیں آتا اور کہتا ہے کہ تمہارے دامن پر تو کوئی قطرۂ خون نظر نہیں آتا۔ پھر یہ دعوائے عشق کیسا؟ اسی لیے کہتا ہے کہ اللہ سے ڈر، یہ دل کا معاملہ ہے۔ دل ہے کوئی دریا تو نہیں ہے کہ اس سے خون کے دھارے جیجوں ونیل کے پانی کی طرح بہتے چلے جائیں۔

بی چارہ بین کہ جان بہ شکر خندہ دادہ است
خویشانش ار روند بہ شیون، درین چہ بحث

لغت: ''خویشان'' خویش کی جمع، عزیز و اقارب۔ ''شکر خندہ'' = خندہ شیریں۔

بیچارے عاشق نے محبوب کی میٹھی ہنسی پر (جو دل کو بے طرح موہ لیتی ہے) جان دی ہے۔ اب اگر اس کے خویش و اقارب اس کے مر جانے پر نالہ و فریاد کرتے ہیں تو اس پر اعتراض کیسا؟

بی پردہ شو ز غصہ و الزام دہ مرا
گفتم کہ گل خوش است بہ گلشن، درین چہ بحث

عاشق نے پھول کی تعریف کی اور کہہ دیا کہ باغ میں پھول بہت خوبصورت لگتا ہے۔

معشوق کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے اس لیے کہ پھول کا حسن اس کے آگے کیا ہے۔ عاشق اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے:

بے شک میں نے یہ کہہ دیا کہ پھول خوبصورت چیز ہے۔ میں نے غلطی کی ہے۔ سزا کے لائق ہوں۔ غصے میں آ کے چہرے سے نقاب اُٹھا دے اور پھر مجھے ملزم ٹھہرا۔ محبوب کا چہرہ غصے سے تمتمائے گا تو پھول کی ساری رنگینیاں اور رعنائیاں ماند پڑ جائیں گی۔ اس شعر میں حسن طلب ہے۔ عاشق پھول کا ذکر اس لیے کرتا ہے کہ معشوق برہم ہو جائے اور نقاب اُٹھا کے کہے، دیکھو اس چہرے کے مقابلے میں کی پھول کیا حیثیت ہے۔

یہ شعر مرزا غالب کے تصور حسن پر روشنی ڈالتا ہے کہ حسن ہر حال میں حسیں ہوتا ہے۔

مژگان بدل ز ذوق نگہ می رود فرو
بی رشتہ نیست جنبش سوزن، درین چہ بحث

مژگاں کو سوزن یعنی سوئی سے تشبیہ دی ہے اور محبوب کی نگاہوں کو دھاگا (رشتہ) قرار دیا ہے۔

بظاہر معشوق کی مژگاں عاشق کے دل میں اترتی جا رہی ہیں لیکن دراصل یہ معشوق کی دل آویز نگاہیں ہیں۔ چنانچہ اس خیال کو یوں ادا کیا کہ مژگاں، ذوق نگہ کے باعث دل میں اترتی جا رہی ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ یہ سوئی جو چل رہی ہے بغیر دھاگے کے نہیں چل رہی۔

بت را به جلوه دیده و بر جای مانده است

گر بحث می کنم به برهمن، درین چه بحث

برہمن کو دیکھو، بت اس کے روبرو ہے، ہمنشین پھر بھی اس پر کچھ نہیں ہوتا۔ اب اگر میں اس بارے میں برہمن سے بحث کروں تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔

همسایه ناخوش است، خوشم همنشین خموش

ار نامه ام نهاد به روزن، درین چه بحث

ہمسایہ خوش نہیں ہے، میں خوش ہوں۔ ہمنشیں خاموش رہ، اگر اس نے میرا خط روزن میں رکھ دیا تو کیا ہوا۔

بعد از حزین که رحمت حق بر روانش باد

ما کرده ایم پرورش فن درین چه بحث

’’علی حزیں‘‘ مشہور فارسی کا شاعر جس کی زندگی کا بیشتر حصہ پاک و ہند کی سرزمین میں بسر ہوا۔ حزیں کے بعد (اس پر اللہ کی رحمت ہو) ہم ہی نے فن (شعر) کی پرورش کی ہے۔

اوجسته جسته غالب و من دسته دسته ام

عرفی کسی است لیک نه چون من درین چه بحث

لغت: ’’جستہ جستہ‘‘ = تھوڑا تھوڑا۔ دستہ دستہ = جستہ جستہ کی ضد یعنی بہت

اس سے پہلے شعر میں حزیں کا ذکر آیا تھا جس میں غالب نے حزیں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی عظمت کی طرف بھی اشارہ کیا۔ اس شعر میں عرفی سے اپنا مقابلہ کرتے

ہوئے کہتا ہے کہ وہ تھوڑا تھوڑا غالب سے (یعنی مجھ سے) مشابہ ہے لیکن میں تو سرتاپا غالب ہی ہوں۔ عرفی کوئی ہے، لیکن وہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی ہی میری عظمت کو پہنچتا ہے۔

❀❀❀

ردیف (ج)

غزل نمبر(۱)

نقشم گرفته دوست، نمودن چه احتیاج

آئینه مرا به زدودن چه احتیاج

لغت: ’’زدودن‘‘ = صاف کرنا۔ جلا کرنا۔

میرے دوست میں میرا رنگ آ گیا ہے، اس کے ظاہر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے آئینے کو جلا کر حاجت نہیں۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ انسان کا دل جتنا صاف ہوگا اتنا ہی صاف اس میں اللہ کا عکس نظر آئے گا لیکن جب خدا خود ہی دل میں سما جائے تو پھر آئینہ دل کو جلا دینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

با پیرهن ز ناز فرو می رود به دل

بند قبای دوست کشودن چه احتیاج

محبوب، حجاب پیرہن کے وجود دل میں اترتا جا رہا ہے، اس لیے اس کے بند قبا کو کھولنے کی کیا حاجت؟ محبوب کے جسم حسین کے خط و خال لباس ہی میں نمایاں ہو رہے ہیں۔

چون می توان به رهگذر دوست خاک شد

بر خاک راه ناصیه سودن چه احتیاج

انسان جب دوست کی راہ میں سرتاپا خاک ہوسکتا ہے تو پھر اس کی راہ میں جبیں سائی کی کیا ضرورت۔

بنگر که شعله از نفسم بال می زند

دیگر ز من فسانه شنودن چه احتیاج

لغت: ''بال زدن'' = پرزدن، پر پھڑ پھڑانا، اڑنا، ابھرنا۔

دیکھ کہ میرے سانس سے شعلے ابھر رہے ہیں۔ پھر مجھ سے میری روداد سننے کی کیا ضرورت ہے۔

از خود به ذوق زمزمۂ میتوان گذشت

چندین هزار پرده سرودن چه احتیاج

لغت: ''زمزمہ'' = اصل میں اس بھجن کو کہتے تھے جو آتش پرست اپنے معبدوں میں دھیمے سروں میں گاتے تھے۔ اب یہ لفظ عام نغمے کے معنوں میں آتا ہے اس شعر میں اصلی معنوں کا پہلو بھی موجود ہے۔

''پردہ'' حجاب بھی ہے اور سر کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ یہاں موخر الذکر کے معنوں میں آیا ہے انسان تو ایک نغمہ سے لذت اندوز ہو کر بے خود ہو سکتا ہے۔ اس لیے اتنے ہزار نغمے گانے کی کیا حاجت ہے۔

اس شعر میں رسمی اور نمائشی طریق کار پر طنز کی گئی ہے۔ نام نہاد صوفی جو نغمے سن کر اپنے

پہ حال طاری کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس سے واقف نہیں ہوتے کہ بیخودی کی کیفیت تو ایک دل کش لے ہی سے طاری ہوسکتی ہے۔ دیوانہ را ہوئے بس است۔

در دست دیگر است سیاه و سفید ما

با روز و شب به عربده بودن چه احتیاج

کہا جاتا ہے کہ گردش روز وشب سے انسانی قسمتیں متاثر ہوتی ہیں، اس لیے لوگ اسے کوستے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارا سیاہ وسفید تو کسی اور کے ہاتھ میں ہے، پھر گردش روزگار کا شکوہ کیسا اور اس سے الجھنے کی کیا ضرورت!

تا لب کشوده، مژه در دل دویده است

بوس لب ترا به ربودن چه احتیاج

محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے: تیرے لبوں کے چومنے کی کیا حاجت؟ تو نے تو ابھی لب ہی نہیں کھولے کہ لذتیں دل میں اتر گئی ہیں:

بفگن در آتش و تب و تابم نظاره کن

غمنامهٔ مرا بکشودن چه احتیاج

لغت: ''غم نامہ'' = خط جس میں درد بھری داستان درج ہے۔ میرے غم نامے کو کھولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے آگ میں ڈال دو۔ (یہ جلے گا تو) تمہیں میرے دل کی تڑپ کا اندازہ ہوگا۔

آن کن که در نگاه کسان محتشم شوی

بر خویش هم ز خویش فزودن چه احتیاج

لغت: ''برخویشتن فزودن'' نخوت سے اپنے آپ پر ناز کرنا۔ وہ جوہر دکھا کہ تو لوگوں کی نظروں میں قابل احترام ہو جائے یونہی اپنے آپ ہی اپنی عظمت کا احساس پیدا کر لینا کوئی معنے نہیں رکھتا۔

خواب است وجہ ھمت آوارہ بینشان

محو رخ ترا بہ غنودن چہ احتیاج

لغت: ''آوارہ بینش'' = وہ لوگ جن کی نظریں آوارہ ہوں۔ کبھی کہیں پڑیں کبھی کہیں۔ ہرجائی لوگ۔ ''غنودن'' = اونگھنا۔

نیند تو ان لوگوں کی ہمت افزائی کرتی ہے جو آوارہ نظر ہیں۔ جو شخص تیرے جلوۂ رخ کے دیکھنے میں محو ہے، اس کی آنکھوں میں نیند کہاں!

تاب سموم فتنہ گر این است غالبا

کشت امید را بدرودن چہ احتیاج

لغت: ''درودن'' = کاٹنا۔ فصل کاٹنا۔ ''سموم'' = گرم ہوا۔ ''فتنہ'' = ناموافق حالات۔ تباہ کن فضا۔

غالب! اگر فتنہ جہاں کی سموم کی گرمی کا یہی عالم ہے تو امیدوں کی کھیتی کو کاٹنے کی امید لگائے رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

غزل نمبر (۲)

جلوہ می خواهیم آتش شو، هوای ما مسنج

دستگاہ خویش بین و مدعای ما مسنج

لغت: ''سنجیدن'' = بھانپنا۔ وزن کرنا۔ اندازہ لگانا۔ اسی سے ''مسنج''، فعل نہی ہے یعنی اندازہ نہ کر ''ہوا'' = انتہائی خواہش، حرص و آز ہو باد۔ یہاں یہ لفظ بڑا ذو معنی آیا ہے۔ ''دستگاہ'' اثاثہ استطاعت، بساط اور حوصلہ۔

ہماری خواہشات کے عالم کو نہ دیکھ۔ ہم تیرے جلوے کے طالب ہیں۔ سرتاپا شعلہ بن کر نمودار ہو جا۔ دیکھ کہ تیرے حسن کی وسعت کتنی ہے۔ یہ مت دیکھ کہ ہمارا مدعا کیا ہے۔

یعنی جلوہ حسن کے شعلے پوری شدت سے بھڑکنے چاہئیں۔ ہم جلتے ہیں تو کوئی پروا نہیں۔

گر خودت مهری بجنبد کام مشتاقان بدہ

ورنہ نیروی قضا اندر رضای ما مسنج

لغت: ''کام کسے دادن'' = کسی کی خواہش پوری کرنا۔

''اگر محبت خود تجھے اکسائے تو عاشقوں کی دل جوئی کر ورنہ یہ خیال نہ کر کہ قضا ہماری رضا کا ساتھ دے گی۔ یعنی ہماری خواہشات کو پورا کرنے میں ہمارا ساتھ دے گی۔

همنشین دارو دہ و دل در خدائی پاک بند

میروی از کار درد بی دوای ما مسنج

اے ہمنشیں تو ہمارے درد کا مداوا کرنا چاہتا ہے تو کر لے اور دارو دے دے لیکن (اس کے لیے) خدا پر بھروسا کر، ہمارے درد لا دوا کا اندازہ لگانے کی کوشش نہ کر۔ تیری یہ کوشش رائگاں جائے گی۔

قدرت ہی چاہیے تو چارۂ دردِ عشق کارگر ہو جائے ورنہ یہ کام کسی چارہ گر کے بس کا نہیں۔

مرگ ما را تا کہ تمہید شکایت کردہ است
رنج و اندوهی کہ دارد از برای ما مسنج

یہ کون ہے جس نے ہماری موت کو تمہید شکایت بنالیا ہے۔ موت میں ہمارے لیے کیا دکھ درد پنہاں ہیں، ان کا اندازہ لگانے کی کوشش نہ کر۔

عاشق کی موت پر لوگوں کو شکایت کا موقع ملا کہ اس بیچارے کو ناحق مار دیا گیا۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ موت میں وہ دکھ درد نہیں تھے جو زندگی میں لاحق تھے۔ موت نے ہمیں ان سے نجات دلوائی۔ شکایت کیسی۔

ای کہ نعش ما بری پندارم از ما بودہٴ
دستمزد او چہ داری خون بهای ما مسنج

لغت: ''دست مزد'' = ہاتھوں کی مزدوری۔ محنت کا صلہ۔

خوں بہا = کسی کے خون بہانے کا معاوضہ۔ او کا اشارہ معشوق کی طرف ہے جس نے عاشق کو قتل کیا ہے۔

عاشق، نعش اٹھانے والے سے خطاب کر کے کہتا ہے:

تو نے ہماری نعش کو اٹھایا اور ہم نے سمجھا کوئی ہم میں سے ہے۔ معشوق سے تجھے کیا مزدوری ملی ہے جو تو ہمارے خوں بہا کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ معشوق جفاپیشہ، عاشق کو قتل کرنے کے بعد اس کی نعش کو اٹھوانے کے لیے کسی کو مزدوری دینے پر آمادہ نہیں۔ جو عاشق اس کسمپرسی کے عالم میں مرے گا، اس کے خوں بہا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب جو کوئی اس کی نعش اٹھائے تو سمجھ لیجے یہ اس کا کوئی خیر خواہ ہے اور اس کا ہمدردی سے نعش کو اٹھانا ہی اس کی مزدوری ہے اور عاشق کے قتل کا خوں بہا بھی۔

خویش را شیرین شمردی خصم را پرویز گیر
سرگزشت کوهکن با ماجرائی ما مسنج

معشوق سے خطاب کر کے کہتا ہے: تو نے اپنے آپ کو شیریں سمجھ لیا، (ٹھیک ہے) اب ہمارے دشمن (رقیب) کو خسرو پرویز سمجھ لے لیکن کوہکن (فرہاد) کی سرگزشت سے ہمارے ماجرائے غم کا اندازہ نہ کر۔

حسب معمول مرزا غالب نے اس شعر میں فرہاد پر لطیف طنز کی ہے کہتے ہیں کہ میرا محبوب شیریں اور رقیب خسرو پرویز سہی لیکن مجھے فرہاد کا نام دینا میری توہین ہے۔ میرا مقام اس سے کہیں بلند ہے۔

آہ از شرم تو و ناکامی ما، زود باش
در تلافی پایۂ مهر و وفای ما مسنج

اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ عاشق، عشق میں سخت ناکام رہا اور معشوق کو اپنی بے التفاتی اور جور و جفا پر ندامت ہوئی مگر دیر کے بعد۔ اب وہ اپنے گزشتہ رویے کی عاشق کی وفاداریوں کو

مدنظر رکھ کر تلافی کرنا چاہتا ہے اور یہ بات مشکل ہے۔ معشوق کا اپنے کیے پر نادم ہونا ہی کافی ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے:

افسوس تمہاری ندامت پر اور ہماری ناکامی پر۔ اب جو التفات پر مائل ہوئے ہو تو جلدی کرو اور اس مخمصے میں پڑو کہ ہماری وفاداریوں کی کہاں تک تلافی کر سکو گے۔ جو کچھ ہم پر گزر چکی ہے، اس کی تلافی تو کیا ہوگی، ہاں تمہارا احساس ندامت ہی بڑی تلافی ہے۔

زاریِ ما در غمِ دل دید و شادی مرگ شد
مردنِ دشمن ز تاثیرِ دعای ما مسنج

دشمن سے مراد رقیب ہے۔ یہ نہ سمجھ کہ رقیب کی موت ہماری دعاؤں کے اثر سے واقع ہوئی ہے۔ اس نے غمِ دل کے ہاتھوں ہماری حالتِ زار کو دیکھا اور خوش ہوا اور اتنا خوش ہوا کہ مر گیا (شادی مرگ شد)۔

کامھا محو است عیب بھا زوال ما مپرس
دیدہ ھا کور است جنسِ ناروای ما مسنج

لغت: ''کام'' = خواہش۔

ہم خواہشات میں کھو گئے ہیں اور یہ ہمارا ایک ایسا عیب ہے جس میں کوئی فرق نہیں آتا (بے زوال ہے) دیکھنے والی آنکھیں اندھی ہیں، ہماری جنس ناروا کا اندازہ نہ کر۔

مرزا غالب کو اپنی شاعرانہ اور فنکارانہ عظمتوں کا شدید احساس تھا اور اس احساس کے ساتھ انھیں یہ توقع تھی کہ لوگ ان کی قدر کریں گے۔ لیکن ان کے جوہر کو پرکھنے والی آنکھیں نہ تھیں۔ اس لیے ان کی شاعری ایک جنس ناروا بن کر رہ گئی۔ مگر توقعات کا ہجوم بدستور قائم رہا اور

یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔

در گذر زین پردہ چون دمسازِ غالب نیستی
مدعی ھنجار خود گیر و نوائی ما مسنج

لغت: ''پردہ'' = حجاب کے علاوہ اس لفظ کے ایک معنی سر کے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں اسی مفہوم میں آیا ہے۔

''دمساز'' = ہمسر، ہمنوا، یہاں موخر الذکر معنی موزوں نہیں۔

''نوا'' آواز، نغمہ۔ یہاں بھی نغمہ کا مفہوم درکار ہے۔

''مدعی'' دعویٰ کرنے والا مدمقابل یا حریف۔

مرزا غالب اپنے مقابل سے جو شعر و سخن کے فن میں ان کا ہمسر ہونے کا دعوے دار ہے، خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں ''چونکہ تو غالب کا ہمنوا نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ نغمہ جو تو الاپ رہا ہے، چھوڑ دے اور اپنی راہ لے۔ اور ہمارے نغمے کو بھانپنے اور اس کے پرکھنے کی کوشش نہ کر۔ میری نوا کے صحیح مقام سے تو آشنا نہیں ہو سکتا۔

❁❁❁

ردیف (چ)

غزل نمبر(۱)

در پردہ شکایت ز تو داریم و بیان ہیچ
زخم دل ما جملہ دہان است و زبان ہیچ

ہمیں در پردہ تم سے شکایت ہے لیکن یہ شکایت حرف و بیان میں نہیں آتی ۔ ہمارا زخم دل منہ (دہاں) کی طرح کھلا ہے لیکن اس میں زبان نہیں (کہ اپنا حال دل کہہ سکیں)

ای حسن گر از راست نرنجی، سخنی ہست
ناز این ہمہ یعنی چہ، کمر ہیچ و دہان ہیچ

معشوق کے دہن کی تنگی اور کمر کی نازکی کو حسن کی خوبی میں شمار کیا جاتا ہے۔ شعرا اکثر اس امر میں مبالغہ کرتے ہوئے دہن اور کمر کو ہیچ کہہ دیتے ہیں یعنی سرے سے ہے ہی نہیں۔ کہتا ہے: اے حسن اگر تو سچ بات سے خفا نہ ہو تو ایک بات کہنے کی ہے۔ اتنا ناز کس چیز پر ہے، نہ تمھاری کمر ہے نہ دہن۔

در راہ تو ہر موجِ غباری است روانی
دل تنگ نہ گردم ز ہر افشاندنِ جان ہیچ

"ہیچ دل تنگ نہ کردم" = میں بالکل افسردہ خاطر نہیں ہوتا۔

تیری راہ میں گرد و غبار کی جو لہر اٹھتی ہے وہ ایک روح (رواں) ہے (خود جان ہے،

زندہ ہے) اس لیے میں (اس راہ میں) ہر مرتبہ جان دینے سے گھبراتا۔ عشق میں جان دینا مرنا نہیں، یہ ایک جان تازہ حاصل کرنا ہے۔

کار فرمائی شوق تو قیامت آورد
مردم و باز بایجاد دل و جان رفتم غالبؔ

بر گریہ بیافزود ز دل ہرچہ فرو ریخت
در عشق بود تفرقۂ سود و زیان ہیچ

عشق میں ہمارے دل سے جو کچھ کم ہوا (فرو ریخت) اسی قدر آنسوؤں میں اضافہ ہوا۔ عشق میں نفع و نقصان (سود و زیاں) کا کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔

تن پروریِ خلق فزون شد ز ریاضت
جز گرمی افطار ندارد رمضان ہیچ

لوگ ریاضت کے لیے روزہ رکھتے ہیں، لیکن روزہ افطار کرتے وقت اتنا زیادہ کھاتے ہیں، گویا تن پروری کر رہے ہیں۔ کہتا ہے:

ریاضت سے لوگوں کی تن پروری اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ رمضان جوش افطار کے سوا کچھ بھی نہیں۔

دنیا طلبان، عربدہ مفت است بجوشید
آزادی ما ہیچ و گرفتاری تان ہیچ

اے دنیا طلب لوگو، یہ نزاع بے کار ہے، جس سرگرمی سے چاہو، دنیا طلب کرو۔ ہم اگر دنیا سے خود کو آزاد سمجھتے ہیں تو کیا اور تم اگر خواہشات دنیاوی میں مبتلا ہو تو کیا۔

پیمانۂ رنگی ست درین بزم بہ گردش
ھستی ھمہ طوفان بھار است، خزان ھیچ

اس بزم دنیا میں ایک رنگین جام ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔زندگی تو ایک (مسلسل) طوفان بہار ہے،خزاں کوئی شے نہیں۔

عالم ھمہ مرأت وجود است عدم چیست
تا کار کند چشم، محیط است، کران ھیچ

لغت:" تا کار کند چشم"=جہاں تک نظر کام کرتی ہے۔
"محیط"=سمندر۔"کراں"=کنارہ۔

یہ کائنات سرتاپا آئینہ حیات ہے،عدم کیا ہے (یعنی کچھ نہیں) جہاں تک نظر کام کرتی ہے،زندگی کا ایک سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔

در پردۂ رسوائی منصور نوائی است
رازت نہ شنودیم ازین خلوتیان ھیچ

خدا سے خطاب کر کے کہتا ہے:منصور انالحق کہہ کر بدنام ہوا،لیکن اس کی رسوائی میں ایک پتے کی بات تو تھی (نوا) اس نے ایک آواز تو بلند کی۔ یہ خلوت نشین لوگ تو ترے راز سے یکسر نا آشنا ہیں،ہم نے ان سے کوئی حکمت کی بات نہیں سنی۔

غالب ز گرفتاری اوھام برون آ
باللہ جھان ھیچ و بد و نیک جھان ھیچ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کائنات کا وجود، محض انسان کی قوت واہمہ کی تخلیق ہے۔ درحقیقت کچھ نہیں، چنانچہ کہتا ہے:

غالب خدا کی قسم یہ جہاں اور اس جہاں کے نیک و بد سب ہیچ ہیں۔ ان اوہام اور وہم پرستیوں سے باہر آ جا (انھیں چھوڑ دے)۔

❀❀❀

غزل نمبر(۲)

ای کہ نبوی ھرچہ نبود در تماشائش مپیچ
نیست غیر از سیمیا عالم، بسودائش مپیچ

تیری اپنی ہستی کچھ نہیں۔ اس لیے جس چیز کا وجود کچھ نہ ہو، اس کے نظارے میں نہ الجھ۔ یہ عالم تو فریب نظر کے سوا کچھ نہیں، اس کی محبت میں نہ الجھ۔

موجہ از دریا، شعاع از مھر، حیرانی چراست
محو اصل مدعا باش و بہ اجزائش مپیچ

لہروں کا وجود سمندر سے ہے، شعاعوں کا سورج سے، پھر حیرانی کیسی۔ تو اصل حقیقت کی طرف مائل ہو۔ اس کے اجزا کو چھوڑ دے۔

آسمان وھم است از برجیس و کیوانش مگوی
نقش ما ھیچ است بر پنھان پیدائش مپیچ

آسماں تو ایک وہم ہے، اس کے برجیس اور کیوان (سیاروں) کا تذکرہ کیسا۔ ہماری
ہستی کچھ نہیں، اس کے ظاہر اور باطن کا کیا تذکرہ۔

آخر از مینا بجاہ و پایہ افزون نیستی
بندۂ ساقی شو و گردن ز ایمائش مپیچ

تو قدر و منزلت میں صراحی سے بڑھ کر تو نہیں ہے۔ بندۂ ساقی ہو جا، اور اس کے
اشارے سے روگردانی نہ کر۔

صورتی باید کہ باشد نغز و زیبا روزگار
گو بہ اکسونش بپوش و گو بدیبائش مپیچ

کوئی صورت (حسن) ہونی چاہیے کہ جس سے زندگی دلکش اور زیبا ہو جائے۔ اسے
قیمتی ساٹن اور کمخواب میں کیا لپیٹنا ہے۔

نامہ عنوانش بنام تست، زان رُو تازہ است
داغِ غم دارد سوادش بر سراپائش مپیچ

"سواد" = سیاہی، تحریر۔

میرے خط کا عنوان تیرے نام ہے، اس لیے اس میں تازگی ہے خط کی تحریر میں
میرے غم کے داغ ہیں، اس میں مت الجھ۔

یعنی خط کا حسن معشوق کے نام سے ابھرا ہے۔ خط کا مضمون تو غم انگیز ہے۔ (تحریر کی
سیاہی کو داغِ غم سے تشبیہ دی)۔

دل از آنِ تست و نعمت ھای الوانش تراست
سخت درھم چون سماطِ خوانِ یغمائش مپیچ

"سماط" = دسترخوان۔ خوان "یغما" = لوٹ کا مال

دل تیری ملکیت ہے اور دل کی گوناگوں نعمتیں بھی تیرے لیے ہیں۔ ان کو لوٹ کے
مال کی طرح مت لپیٹ۔

ای ھوس کارت ز گستاخی بہ بی رحمی کشید
ناز کی ھای میانش بین، بہ بالائش مپیچ

اے ہوس اب تیری کارفرمائیاں گستاخی سے گزر کر بے رحمی تک جا پہنچیں محبوب کی کمر
کی نزاکتوں پر نظر رکھ اور اس کے قد و قامت میں نہ الجھ۔

یعنی لطافت حسن سے اس طرح لذت اندوز ہونا چاہیے کہ اس میں ہوس کا
شائبہ نہ ہو۔

پیش ازین کی بود این ھم التفاتی بودہ است
این قدری برخود ز رنجش ھای بی جائش مپیچ

"برخود مپیچ" = پیچ و تاب نہ کھا۔

محبوب کی بے جا رنجشوں سے کیوں آزردہ ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے بھی کیا عالم تھا۔
اب بھی ان سب باتوں کو محبوب کے التفات پر محمول کرنا چاہیے۔
یعنی دوست کے بے جا آزردہ خاطر ہونے میں بھی ایک توجہ کا پہلو تو ہے۔

نعش غالب هم چنین بر جا گزار، آخر شب است
خیز و در کحلی پرندِ گوهر آمائش مپیچ

لغت: ''کحلی پرند'' = سیاہ ریشم۔ ''گوہر آما'' = موتیوں بھرا۔

تاروں بھری رات اور اس کی سیاہی کو سیاہ ریشم سے جس میں موتی ٹکے ہوں تشبیہ دی ہے۔ رات کا وقت ہے، غالب کی نعش کو یونہی پڑا رہنے دے۔ چھوڑ دے اس نعش کو موتیوں بھری سیاہ چادر میں مت لپیٹ۔

❁❁❁

ردیف (ح)

غزل نمبر(۱)

بادۂ پرتو خورشید و ایاغِ دمِ صبح
مفت آنان کہ در آیند بباغِ دم صبح

بادۂ پرتو خورشید'' = سورج کی طرح روشن شراب۔ ''ایاغ'' = جام وساغر۔
''دم صبح'' = صبح کا سانس، صبح کی تازہ ہوا۔ ''مفت آنان'' = اُن کا حصہ۔

صبح کی تازہ ہوا کا جام ہو اور اس میں سورج کی روشن کرنوں کی شراب انڈیلی جارہی ہو، یہ نعمتیں ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں جو صبح کی تازگیوں کے چمن میں سیر کرتے ہیں۔

آفتابیم بھم دشمن و ھمدرد ای شمع
ما ھلاکِ سر شامیم تو داغِ دم صبح

''اے شمع تو اور میں ایک دوسرے کے دشمن بھی ہیں اور ہمدرد بھی۔ ہم دھوپ کی طرح ہیں کہ شام کے آتے ہم ہلاک ہو جاتے ہیں اور تجھے صبح بجھا دیتی ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے حریف (دشمن) اس لیے ہیں کہ سورج کا غروب عاشق کے لیے پیام مرگ (شب فراق لاتا ہے) اور شمع کے لیے پیام زندگی (وہ رات کو جلنے لگتی ہے) اور ہمدرد اس لیے کہ دونوں اس کے ہاتھوں دکھ اٹھاتے ہیں۔ عاشق غروب کے باعث اور شمع طلوع کے باعث۔

بعد آنا نکه قریب اند بما نوبت ماست

آخرِ کلفتِ شب ها ست فراغِ دمِ صبح

لغت: "ان لوگوں کے بعد" جو ہمارے قریب ہیں، ہماری باری ہے۔ راتوں کی کلفتوں کے بعد ہی صبح کی فراغت آتی ہے۔

زین سپس جلوهٔ خور جای چراغان گیرد

شب اندیشه ز ما یافت سراغِ دمِ صبح

ہماری فکرمندیوں کی رات کو ہماری ہی وساطت سے صبح کے نمودار ہونے کا سراغ ملا ہے۔ اب اس کے بعد چراغاں کی جگہ سورج لے لے گا۔

یعنی وسوسوں کی رات ختم ہوگی اور امید کا سورج طلوع ہوگا۔

پیش ازین باد بهار این همه سرمست نبود

شبنم ماست که تر کرده دماغ دمِ صبح

اس سے پہلے باد اتنی سرمست کہاں تھی۔ یہ ہماری شبنم ہی ہے کہ جس نے صبح کے دماغ کو تر کیا۔ یعنی ہماری طبیعت کی شگفتگی نے صبح کو تازہ تر کر دیا۔

سخن ما ز لطافت همه سر جوش می است

که فرو ریخته از طرفِ ایاغ دمِ صبح

ہمارا کلام لطافت میں سربسر شرابِ ناب کی طرح ہے جو صبح کے جام سے ٹپک پڑی ہے۔ گویا صبح کی کیفیت نے ہم پر بھی کیفیت طاری کی ہے اور ہم مستانہ وار شعر کہہ رہے ہیں۔ یہ

فیضانِ صبح ہے۔

ذوق مستی ز هم آهنگی بلبل نیزد

مفگن آواز بر آواز کلاغ دمِ صبح

صبح کے کوّے کی آواز پر آواز نہ لگاؤ۔ مستی کی کیفیت تو بلبل کی ہمنوائی سے پیدا ہوتی ہے۔

حق آن گرمی هنگامه که دارم بشناس

ای که در بزمِ تو ماتم بچراغ دمِ صبح

صبح نے تو میری طبیعت میں جذبات کی ہنگامہ خیز کیفیت پیدا کر دی ہے۔ تجھے اس کی قدر کرنی چاہیے۔ تیری بزم میں چراغِ صبح سے ماتم کی سی افسردگی کیوں ہے۔

بوئ گل گر نه نوید کرمت داشت، چه داشت؟

ای بشب کرده فراموش جناغ دمِ صبح

لغت: "جناغ" = استخوان سینہ مرغ۔

وہ تسمہ جو رکاب زین میں ہوتا ہے چونکہ اس کی شکل استخوان سینہ مرغ سے ملتی ہے، اسے جناغ زین کہتے ہیں۔

"جناغ دمِ صبح" = سے مراد سینہ صبح۔

پھولوں کی خوشبو میں تیری بخشش کی خوشخبری ہی تھی اور کیا تھا۔ تو نے رات کو صبح کے سینے سے ابھرے ہوئے سانس کو بھلا دیا۔

یعنی صبح سویرے پھولوں کی خوش بو، سینہ صبح سے ابھرا ہوا معطر سانس تھا اور وہ تیری نوازشوں کی بشارت تھی، مگر رات آئی تو تو اسے بھول گیا:

غالب امروز بوقتی کہ صبوحی زدہ ام
چیدہ ام این گلِ اندیشہ ز باغ دم صبح

لغت: ”صبوحی“ = صبح کی شراب۔ اس کے برعکس شام کو جو شراب پی جائے اسے سبوغی کہتے ہیں۔

”گل اندیشہ“ = افکار (شاعرانہ) کے پھول۔

غالب آج جب میں نے صبوحی پی تو یہ شاعرانہ افکار کے پھول میں صبح کے باغ میں چنے یعنی صبوحی سے مست ہوتے وقت صبح کی تازہ فضا نے مجھے یہ اشعار کہنے پر اکسایا۔

❁❁❁

غزل نمبر (۲)

آہی بعشق فاتح خیبر کنیم طرح
در گنبد سپہر مگر در کنیم طرح

”طرح“ = صورت و پیکر۔ ”طرح کردن“ = بنانا۔ بنیاد رکھنا۔ ”فاتح خیبر“ = حضرت علیؓ

حضرت علیؓ (فاتح خیبر) کی محبت میں ایک آہ کھینچیں۔ شاید اس آہ سے گنبد آسمان میں (دروازہ وا ہو جائے) شگاف پڑ جائے۔

در فصل دی کہ گشتہ جہان زمہریر ازو
بنشین کہ آب گردشِ ساغر کنیم طرح

لغت: ”دے“ = خزاں کے مہینوں میں سے ایک مہینا۔ سردی میں پت جھڑ کا موسم۔

”زمہریر“ = زم اور ہریر سے مرکب ہے زم بمعنی سخت سرد اور ہریر بمعنی کنندہ۔ ”زمہریر“ معنی سخت سرد کر دینے والا۔

پرانی حکمت کے مطابق کرۂ ہوائی کے ایک حصے کا نام زمہریر ہے جہاں بخارات پہنچ کر منجمد ہو جاتے ہیں۔

زمہریر اس طبقۂ دوزخ کا بھی نام ہے جو بے انتہا سرد ہے اور کافروں کو عذاب پہنچانے کے لیے ہے۔

آ بیٹھ جائیں اور اس موسم زمستان (دے) میں جب کہ دنیا زمہریر بن گئی ہے، ساغر کو گردش میں لائیں اور شراب پئیں۔

تاچند نشنوی تو و ما حسب حالِ خویش
افسانہ ہای غیر مکرر کنیم طرح

لغت: ”غیر مکرر“ = نہ دہرائے ہوئے۔ تازہ۔

کب تک تو ہماری داستانِ (دل) نہیں سنے گا اور ہم اپنے حسب حال نئے نئے افسانے بناتے رہیں گے۔

مارا زبون مگیر اگر از پا در آمدیم
از ما عجب مدار گر از سر کنیم طرح

لغت: ''اگر از پا در آمدیم'' = اگر ہم گر پڑے ہیں۔ اپنے پاؤں کے سہارے چل نہیں سکتے۔

''مارا زبوں مگیر'' = ہمیں حقیر نہ سمجھ۔

اگر چلتے چلتے تیری راہ میں ہمارے پاؤں تھک کر رہ گئے ہیں تو ہمیں حقارت سے نہ دیکھ۔ اسے عجب بات نہ سمجھنا، ہم سر کے بل بھی چل سکتے ہیں۔

هوئی بچرخ دادنِ گردون بر آوریم
عیشی بداغ کردنِ اختر کنیم طرح

لغت: ''ہوئی'' = نعرۂ مستانہ۔ ''بچرخ دادن'' = گھمانا، رقص میں لانا۔

ایک ایسا نعرۂ مستانہ بلند کریں کہ آسمان رقص میں آجائے۔ ایک ایسی بزم نشاط آراستہ کریں کہ ستارے رشک سے جل جائیں۔

یعنی ہماری محفل نشاط کی درخشانیاں ستاروں کی بزم کو مات کرے۔

خود را بشاهدی پرستیم زین سپس
در راهِ عشق، جادهٔ دیگر کنیم طرح

اس کے بعد خود معشوق بن جائیں اور خود ہی اپنی پرستش کریں اور یوں راہ محبت میں ایک نیا راستہ نکالیں۔

از داغِ شوق پرده نشینی نشان دهیم
در زخمِ رشک روزنهٔ در کنیم طرح

لغت: ''روزنہ در'' یا ''روزن در'' = دروازے کا چھوٹا سا سوراخ جس میں سے اندر

جھانکتے ہیں۔

اپنے داغ محبت کو (جو ہمارے دل میں نہاں ہے) ایک پردہ نشیں محبوب قرار دیں، اور اپنے زخم رشک کو روزنِ در تصور کریں۔

یعنی اسی روزن سے چپکے چپکے محبوب کو دیکھیں۔

از تار و پود نالہ نقابی دهیم ساز
وز دودِ سینه زلفِ معنبر کنیم طرح

اپنے درد بھرے نالوں کے تار و پود (تانے بانے) سے اُس محبوب کا نقاب بنائیں اور اپنے سینے سے اُبھرتے ہوئے دھوئیں کو اس کی زلفِ معنبر سمجھ لیں۔

برگ حلل ز شعله و آذر بهم نهیم
پیرایه از شراره و اخگر کنیم طرح

لغت: ''برگ'' = پتا بھی ہے اور ساز و سامان بھی۔

''آذر'' = آگ۔ ''پیرایہ'' = آرائش و زیور۔ ''حلل'' = (حلہ کی جمع) لباس۔

شعلوں اور آگ سے اس کا لباس مہیا کریں اور چنگاریوں سے اس کی آرائش کریں۔

از زخم و داغ لاله و گل در نظر کشیم
از کوه و دشت حجله و منظر کنیم طرح

اپنے دل کے زخموں اور داغوں کو لالہ و گل تصور کریں اور کوہ و بیاباں کو ایوان اور دریچہ سمجھ لیں۔

ازسوز و ساز محرم و مطرب کنیم جمع

از خار و خارہ بالش وبستر کنیم طرح

سوز وساز ہمارے ندیم اور مطرب ہوں اور کانٹوں کا بستر ہو اور پتھر کا تکیہ۔

آئین برھمن بہ نھایت رسانده ایم

غالب بیاکہ شیوۂ آذر کنیم طرح

لغت: ''آذر''=حضرت ابراہیمؑ کے باپ جو بت تراش تھے۔

طریقِ برہمن کی تو ہم نے تکمیل کرلی، غالب آ اب مسلک آذر اختیار کریں یعنی اب تک بتوں کی پوجا کرتے رہے اور اس میں کمال حاصل کرلیا۔ اب خود بت تراشیں گے۔ اس ساری غزل میں مرزا غالب نے ایک تصورات کی دنیا قائم کی ہے۔ جس کا مرکز خود ان کی ذات ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی منفرد شخصیت کا احساس انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ غزل مسلسل ہے ایک اور ہی جذبے اور کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔

❀❀❀

ردیف (خ)

غزل نمبر(۱)

ای جمال تو بتاراج نظرھا گستاخ

وی خرام تو بپامالی سرھا گستاخ

اس غزل کے تقریباً تمام اشعار میں محبوب سے خطاب کیا گیا ہے۔ ''گستاخ'' بے ادب، دلیر، بے باک کا مفہوم دیتا ہے۔ چنانچہ اس غزل میں گستاخ کی ردیف کا مرکزی مفہوم موجود رہتا ہے، لیکن ہر شعر میں اس مفہوم کے لطیف پہلو الگ الگ ابھرتے رہتے ہیں۔

کہتا ہے کہ تیرا حسن، عاشقوں کی نظروں کو بڑی بے باکی سے لوٹتا ہے اور خرامِ (ناز) عاشقوں کے سروں کو پامال کرتا چلا جاتا ہے۔

داغِ شوق تو بہ آرائشِ دلھا سرگرم

زخمِ تیغ تو بہ گلگشتِ جگرھا گستاخ

تیری محبت کا داغ عاشقوں کے دلوں کی آرائش میں سرگرم ہے اور تیری تلوار کا زخم ان کے جگر میں دلیرانہ چلتا ہے۔

جگر کے خون کی سرخی کے اعتبار سے گلگشت (باغ یا پھولوں کی سیر) کہا، یعنی دلوں میں تیرا شوق سمایا ہے اور تیرے زخم سیدھے جگر پر لگتے ہیں۔

مُردم از درد تو دُور از تو داغم از غیر
کہ رساند بتو این گونہ خبرها گستاخ

میرا یہ عالم ہے کہ تجھ سے دور ہوں، اور تیرے دردِ محبت کا مارا ہوا ہوں، پھر رقیب کو دیکھ کر رشک آتا ہے کہ وہ کس بے باکی سے میرے بارے میں اس قسم کی (غلط) خبریں پہنچاتا ہے (اور تو انھیں سچ مان لیتا ہے)

با خبر باش کہ دردی کہ ز بیدردی تست
نالہ را کرد در اظهارِ اثرها گستاخ

تجھے خبردار رہنا چاہیے کہ تیری بے مہری سے جو درد و الم میرے دل کو ملا ہے اس سے میری فریاد میں بلا کی اثر انگیزی آ گئی ہے (یہ اثر انگیزی آخر تجھے بھی درد میں مبتلا کر دے گی)۔

خواهش وصل خود از غیر اخلاص مسنج
کاین گدائی است بدر یوزۂ درها گستاخ

رقیب جو تجھ سے وصل کا طلب گار ہے، اس کی اس خواہش وصل کو اخلاص پر مبنی نہ سمجھ کیونکہ وہ ایک ایسا بے شرم گدا ہے جو در در کی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔
یعنی اس میں وفا نہیں، وہ تو جگہ جگہ عشق جتاتا پھرتا ہے۔

شاد گردم کہ بخلوت نرسید است رقیب
بینمش چون بتو در راہ گزرها گستاخ

جب میں رقیب کو راہوں میں تجھ سے بے تکلف انداز میں ملتا دیکھتا ہوں تو خوش ہوتا ہوں کہ چلو اچھا ہوا رقیب تیری خلوت گاہ میں باریاب نہ ہوا۔ (ورنہ جس طرح کھل کر باتیں کر رہا ہے وہ سر بازار نہ کرتا، تخلیے میں کرتا)

گریہ ارزانی آن دل کہ بہ نیرو باشد
بہ شناورزی سیلاب خطرها گستاخ

لغت: ''شناورزی'' = تیرنا، غوطہ زن ہونا۔ ''نیرو'' = طاقت، حوصلہ۔
محبت میں آنسو بہانا صرف اُسی دل کا حصہ ہے جس میں خطروں کے طوفانوں سے (تیرنے) بے محابا گزرنے کا حوصلہ اور طاقت ہو۔

ھای این پنجہ کہ با جیب کشاکش دارد
بود با دامن پاکت چہ قدرها گستاخ

افسوس میرا یہ پنجہ (ہاتھ) جو آج میرے جیب و گریباں سے الجھا ہوا ہے، کبھی تیرے دامنِ پاک کو کس کس قدر دلیری (گستاخ دستی) سے تھامے ہوئے تھا۔

نازِ دلهای نزارش چہ محابا باشد
سر زلفی کہ بہ پیچد بہ کمرها گستاخ

لغت: ''دلہائے نزار'' = کمزور اور لاغر دل، عاشقوں کے دل۔
وہ زلف جو عاشقوں کے جسم (کمر) سے بڑی دلیری سے لپٹی رہتی ہے، اس کا اپنے ان چاہنے والوں کے دلِ نحیف پر ناز کرنا بھی بڑے حوصلے کی بات ہے۔

محبوب ظاہرا پیار سے، چاہنے والوں کے دلوں کو ستا کر کتنا ناز کرتا ہے اور اخلاص کا نام نہیں۔

طوطیان در شکر آیند بہ غالب کاو راست
لبی از نطق بہ تاراجِ شکرھا گستاخ

لغت: ''طوطیان'' = طائرانِ خوشنوا۔ ''نطق'' = قوت گویائی۔

غالب کے پاس بڑے بڑے خوشنوایان شیرین بیان آتے ہیں کیونکہ اس کو ایسے لب عطا ہوئے ہیں جن کی قوت گویائی شیرینیوں (شکرہا) کو لوٹ لیتی ہے۔

یعنی غالب کے اشعار شیریں پر ہزاروں شیریں بیانیاں قربان ہیں۔

❀❀❀

غزل نمبر(۲)

تا بشوید نهاد ما ز وسخ
گشت گرمابہ ساز از دوزخ

لغت: ''وسخ'' = آلودگی، ناپاکی۔ ''نہاد'' = جسم۔

ہمارے جسم کو آلودگیوں سے پاک کرنے (دھونے) کے لیے اس نے دوزخ کو حمام بنا لیا ہے۔

دوزخ کیا ہے۔؟ گنہگاروں کو گناہوں سے پاک کرنے کی ایک صورت ہے جس کے بعد وہ جنت کے سزاوار ہوں گے۔

تا چہ بخشند در جہانِ دگر
کشتگان ترا چمن برزخ

لغت: ''جہاں دگر'' = عقبیٰ۔

تیرے کشتگان عشق کے لیے تو چمن برزخ ہے۔ انھیں عقبیٰ میں آخر کیا عطا ہوگا۔

عاشقوں کا دل چمن زاروں سے خوش نہیں ہوتا، وہ عاقبت میں کیسے خوش ہوں گے۔

وہ کہ از کشت زار امیدم
بہرۂ مور نیز بُرد ملخ

کیا کہنے (اس بدنصیبی کے) کہ میری امید کی کھیتی سے، ٹڈی، چیونٹی کا حصہ بھی چٹ کر گئی۔

یعنی میری چھوٹی سے چھوٹی امید بھی بر نہ آئی۔

دلم اجزای نالہ را مدفن
درت اشخاصِ بقعہ را مسلخ

لغت: ''مسلخ'' = مقتل۔ ''اشخاص بقعہ'' = وہ اشخاص جو محبوب کے گھر میں بار یاب ہیں۔

میرا دل میری فریادوں کے بکھرے ہوئے اجزا کا مدفن بنا ہوا ہے، اور تیرا دروازہ، تیرے گھر میں باریابی حاصل کرنے والوں کی قتل گاہ ہے۔

از دل آرم بساط من آتش
از تو گویم براتِ من بر یخ

لغت: "از دل آرم" = میرا دل کہتا ہے۔ "از تو گویم" = تیری طرف سے کہتا ہوں۔

میرا دل آواز دیتا ہے۔، میں آگ میں بیٹھا ہوں۔ تیری طرف سے کہتا ہوں کہ میرے نصیب میں برف (یخ) ہے۔ یعنی مرا دل تو محبت کی آگ میں جل رہا ہے اور تیری طرف سے سرد مہری ہے۔

هوس ما و دانہ از یک دست
نفس ما و دام از یک نخ

"نخ" = دھاگا۔

ہماری خواہشات (ہوس) اور دانے کی ایک ہی نوعیت ہے۔

ہمارا سانس اور جال (دام) کا تانا بانا ایک ہی دھاگے سے بنا ہوا ہے۔ انسانی خواہشات اور ان خواہشات میں اسیر ہونا، دونوں انسانی فطرت میں داخل ہیں۔ قدرت نے انسان کو ایسا ہی بنایا۔

برگ در خورِ ہمت فلک است
بہ شکایت چہ می زنیم زنخ

"برگ" = ساز و سامان، نصیبہ۔ "زنخ" = ٹھوڑی۔ "زنخ زدن" = تاسف کرنا۔

جو کچھ انسان کو ملتا ہے اس کا دارو مدار آسمان کے ظرف اور ہمت پر ہے۔ پھر گلے شکوے کیسے اور افسردہ دلی کس بات پر (سارا معاملہ انسان کے مقدر کا ہے)

مور چون ساز میزبانی کرد
بہ سلیمان رسید پائی ملخ

چیونٹی نے جب میزبانی کا اہتمام کیا تو حضرت سلیمانؑ کے پاس مکڑی کی ٹانگ پہنچ گئی۔

با تو شد ہم سخن پیام گزار
چہ شکیبم بارزش پاسخ

لغت: "پیام گزار" = قاصد۔

"پاسخ" = (جواب) دراصل پاے سخون تھا مخفف ہو کر پاسخ رہ گیا۔ پاے سے پا اور سخون سے سخن بن گیا۔

اب سخن کے تلفظ کی تین صورتیں رائج ہیں۔ سُخَن، سُخُن اور سُخن۔ آخری تلفظ بیشتر رائج ہے اور فارسی اور اردو کے شعرا کے یہاں بطور قافیہ آتا ہے (مثلاً بدن کا قافیہ سخن)۔

مرزا غالب نے اس شعر میں جب پاسَخ کا لفظ سین مفتوح کے ساتھ لکھا، یعنی پاسَخ لکھا تو اعتراض ہوا۔ اس کے جواب میں مرزا نے سخن کی تلفظ کی تین صورتوں کے حوالے سے کہا کہ سخن کا تتبع کیا ہے جس کا مخفف سَخ بنتا ہے، سُخ نہیں بنتا کیونکہ سخن کے نون کو گرائیں تو خا ساکن ہو جائے گا اور سین مفتوح رہے گا۔ وہ کہتا ہے:

"مجھے تیرے جواب کی ارزش (اہمیت، قدر و قیمت) سے تسکین (شکیب) کیا ہوگی مجھے تو رشک نے مار ڈالا ہے۔ مجھے تو رشک اس بات کا ہے تو میرے قاصد سے ہمکلام ہوا ہے۔

مرزا غالب کے یہاں رشک کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں فارسی کا ایک شعر ہے:

چون بہ قاصد بسپرم پیغام را
رشک نگذارد کہ گویم نام ار

(جب میں خط قاصد کے سپرد کرتا ہوں تو رشک اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں تیرا نام بھی لوں)

اردو کا شعر ہے:

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

در سخن کار بر قیاس مکن
ترش گردد تُرش، نہ تلخ تُلخ

لغت: ''قیاس'' = لغوی معنی خیال اور گمان اور اندازہ کے ہیں لیکن منطق میں یہ لفظ بطور اصطلاح کے مستعمل ہے۔ منطق دو طرح کی ہے، منطق استقرائی اور منطق استخراجی۔

قیاس استقرائی کی ایک اصطلاح ہے کہ چند مثالوں سے اندازہ کر کے ہم کوئی نتیجہ نکال لیں۔

زبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زبان میں قیاس نہیں چلتا یعنی کوئی محاورہ یا روزمرہ، اندازہ کر کے نہیں بنائے جا سکتے غالب نے اسی اصول کو مدنظر رکھ کر یہ شعر کہا ہے کہ۔

زبان میں قیاس سے کام نہیں چلتا ترش کا تلفظ تُرش بھی ہے لیکن اسی قیاس پر تلخ کا تلفظ تُلخ نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مرزا نے یہ شعر محض تُلخ کا قافیہ لانے کے لیے لکھا ہے، ورنہ اس شعر میں کوئی اور خوبی نہیں۔

قاصد من بہ راہ مُرد و من
همچنان در شمارہ فرسخ

لغت: ''فرسخ'' = میل فاصلہ۔

میرا قاصد تو راستے ہی میں مر چکا ہے (یا مارا گیا ہے) اور میں ابھی تک میل ہی گن رہا ہوں کہ اب وہ اتنا فاصلہ طے کر چکا ہوگا۔

مرگ غالب دلت بدرد آورد
خویش را کشت و هرزه کشت آوخ

غالب کی موت نے تجھے آزردہ کر دیا۔ افسوس اس نے (غالب نے) اپنے آپ کو مارا اور رائگاں مارا۔ غالب کا یہ اردو شعر دیکھیے:

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

چنانچہ یہی احساس فارسی شعر میں موجود ہے کہ غالب کے مرنے کا دوست کو دکھ ہوا تو پتا چلا کہ اس کے دل میں غالب کی محبت تھی۔ اب اسے اپنی موت پر افسوس ہو رہا ہے کہ یونہی مایوس ہو کر جان دی۔

❁❁❁

میرا قاصد تو راستے ہی میں مر چکا ہے (یا مارا گیا ہے) اور میں ابھی تک میل ہی گن رہا ہوں کہ اب وہ اتنا فاصلہ طے کر چکا ہوگا۔

مرگ غالب دلت بدرد آورد
خویش را کشت و ھرزہ کشت آوخ

غالب کی موت نے تجھے آزردہ کر دیا۔ افسوس اس نے (غالب نے) اپنے آپ کو مارا اور رائگاں مارا۔ غالب کا یہ اردو شعر دیکھئے:

آہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

چنانچہ یہی احساس فارسی شعر میں موجود ہے کہ غالب کے مرنے کا دوست کو دکھ ہوا تو پتا چلا کہ اس کے دل میں غالب کی محبت تھی۔ اب اسے اپنی موت پر افسوس ہو رہا ہے کہ یونہی مایوس ہو کر جان دی۔

Sharah Ghazaliyat-e-Ghalib Farsi

(Complete Works of Ghalib with Meanings & Translation in Urdu) (Vol. I)

by

Sufi Ghulam Mustufa Tabassum

Ghalib As A Poet

With the conquest of India by Persians, the art of ghazal writing came along in the wake of it. Though Ghalib's master pieces of art are in Persian, the irony is that he derived greater fame from the Urdu Versions. He delivered excellence in quality to the Urdu languages of ghazal. The ghazal is a verse of amorousness - boy meets girl - the cry of a wounded gazelle. To understand ghazal, especially the ones by Ghalib, I think the reader wants to know that in this form of verse, the thought contained in every couplet is supposed to be independent and complete. In rare cases if it shows some relation with others, it is the skill of a master poet. The theme or mood of the ghazal need not be the same throughout because it is simply a diamond of many facets. Ghalib polished it with humanity. He is not a gloomy poet like good old Mir, instead he believed a poet should create beauty out of terror, flowers out of fire and good out of evil. He invited grief and misery till death, as though his contented soul had nothing to live for.

Kitabi Duniya
1955, Turkman Gate, Delhi - 110006 (INDIA)
Mobile: 9313972589, Phone: 0091-11-23288452
E-mail: kitabiduniya@rediffmail.com

ISBN-81-89461-08-7